حرمین شریفین میں یاد آنے والے کیف آفرین اشعار

شعری التجائیں

(تاثُّراتی توضیحات کے ساتھ)

پروفیسر محمد اقبال جاوید

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب ——— شعری التجائیں
مصنف ——— پروفیسر محمد اقبال جاوید
سال اشاعت ——— مئی ۲۰۱۰ء
تعداد ——— پانچ سو
کمپوزنگ ——— سجاد کمپوزنگ سنٹر دین پلازہ گوجرانوالہ فون: ۰۵۵۔۳۸۵۹۶۹۰
ناشر ———
قیمت ——— 300 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَشعار مرے یوں تو زمانے کے لیے ہیں
کچھ شعر فقط اُن کو سنانے کے لیے ہیں

محتویات

		صفحہ
۱۔	گدازِ یک نوا۔ حرف آغاز	۱۱
۲۔	دعا۔ سرورِ کونین ﷺ کے نقطۂ نظر سے	۱۳
ا:	**بارگاہِ الوہیت میں**	۳۴
۳۔	پہلا یہ گھر خدا کا	۳۷
۴۔	حرم میں اذانِ سحر	۴۲
۵۔	ترے جلووں کے آگے	۴۵
۶۔	جنبشِ مژگاں بھی بار ہے	۴۸
۷۔	اس آستاں کی خیر ہو	۵۰
۸۔	باقی بتانِ آزری	۵۴
۹۔	سنگِ آستاں پہ جبین نیاز	۵۷
۱۰۔	سچا ایک نام اس کا	۶۰
۱۱۔	یہ ابتدا ہے کرم کی	۶۳
۱۲۔	شاخِ نشیمن بھی تو	۶۵

۱۳۔	پھر جہنم کو کیا دیا تو نے؟	۶۷
۱۴۔	میرے سبو میں ہے جیحوں	۷۰
۱۵۔	مرے دردِ نہاں کا حال	۷۴
۱۶۔	گلِ بہارِ تو ام	۷۷
۱۷۔	مری بندگی سے مرے جرم	۷۹
۱۸۔	عفو و خطا	۸۲
۱۹۔	گرفتارِ ہوس، لغزیدہ پا	۸۷
۲۰۔	میرے گناہوں پر نہ جا	۸۹
۲۱۔	عفو بندہ نواز	۹۳
۲۲۔	عذر نہ کرنا گناہ کا	۹۶
۲۳۔	رحمتِ پروردگار ما	۹۸
۲۴۔	مناسبِ شانِ عطا ہے کیا	۱۰۱
۲۵۔	تو غنی از ہر دو عالم	۱۰۴
۲۶۔	احتساب کس لیے؟	۱۰۸
۲۷۔	بس اک داغِ سجدہ	۱۱۰
۲۸۔	زمزم ہی پہ چھوڑو	۱۱۳
۲۹۔	ذرا میں لپٹ کے رولوں	۱۱۸
۳۰۔	پلکوں پر لرزتے ستارے	۱۲۰
۳۱۔	دہی اشکِ مرا حسنِ قبول	۱۲۲
۳۲۔	نوا و نکہت و نزہت	۱۲۵
۳۳۔	تیرے پیمانے میں، ماہ تمام	۱۲۸

۳۴۔	حسن کی خیرات	۱۳۰
۳۵۔	نظر میں زندگی بھر دے	۱۳۲
۳۶۔	تشنہ لب چڑیا اور دریائے کرم	۱۳۵
۳۷۔	دوری قبول و عرض میں	۱۳۸
۳۸۔	بہ اُمیدِ عفو و کرم	۱۴۰
۳۹۔	اے عظیموں کے عظیم!	۱۴۳
۴۰۔	آنکھیں خشک ہیں، مولائے کل	۱۴۶
۴۱۔	درد سمندر، دُکھ دریا	۱۵۰
۴۲۔	بادلو! ہٹ جاؤ	۱۵۴
۴۳۔	الٰہی! عاقبت محمود گرداں	۱۵۸
۴۴۔	دعاؤں میں اثر بھی چاہیے	۱۶۰
۴۵۔	دم لے کے ایک لمحہ	۱۶۳
۴۶۔	ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے	۱۶۶
۴۷۔	گماں اور یقیں	۱۶۹
۴۸۔	مناجات.....حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ مع اُردو ترجمہ	۱۷۲
ب :	**بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں**	۱۷۵
۴۹۔	سلام پہنچے.....شورش کاشمیریؒ	۱۷۷
۵۰۔	تازہ تر گلبرگ صحرائے وجود	۱۷۹
۵۱۔	ترا گھر ہو، مرا دل ہو	۱۸۲
۵۲۔	بروں کو جس نے فرمایا، 'یہ میرے ہیں'	۱۸۵
۵۳۔	مدینہ - کعبہ صفت محترم	۱۸۸

۵۴۔	زمیں کا اتنا ٹکڑا آسماں	۱۹۱
۵۵۔	تجلی گاہِ عرفاں	۱۹۳
۵۶۔	صد جلوہ روبرو ہے	۱۹۶
۵۷۔	حسن بستان رسول ﷺ	۱۹۹
۵۸۔	کچھ نذرِ وفا لے چل	۲۰۱
۵۹۔	درِ خیر البشر ﷺ	۲۰۴
۶۰۔	شاخِ گلابِ جاں	۲۰۸
۶۱۔	خود وقت کو ملتا ہے سکوں	۲۱۱
۶۲۔	وقت دعا ہے	۲۱۳
۶۳۔	آبروئے ما	۲۱۷
۶۴۔	تیرا وجود الکتاب	۲۱۹
۶۵۔	وہ تمنا تہی تو ہو	۲۲۲
۶۶۔	کتھے مہر علی، کتھے تیری ثنا	۲۲۵
۶۷۔	وہ اک امّی	۲۲۸
۶۸۔	ام الکتاب کی تفسیر	۲۳۱
۶۹۔	میری معراج	۲۳۴
۷۰۔	جو حسن میرے پیش نظر ہے	۲۳۷
۷۱۔	خدا کے بعد سبھی کچھ	۲۳۹
۷۲۔	التفاتِ سیّدِ سادات ﷺ	۲۴۲
۷۳۔	منزل آسماں، رستہ کہکشاں	۲۴۵
۷۴۔	تہی ہے دامنِ فن	۲۴۸

۷۵۔	دل دار و دل نشین و دل آراء	۲۵۰
۷۶۔	آپ میری چارہ سازی کر	۲۵۳
۷۷۔	تعبیرِ خوابِ زندگی	۲۵۶
۷۸۔	شہرِ غبارِ شب کا سویرا	۲۵۹
۷۹۔	قاسمِ نعمت	۲۶۲
۸۰۔	آب می گردد وجود	۲۶۵
۸۱۔	پشیماں ہوں پشیماں، یارسول اللہ ﷺ	۲۶۷
۸۲۔	کچھ اہتمام	۲۶۹
۸۳۔	دل ہے ابھی سیاہ	۲۷۳
۸۴۔	خدایا، ایں کرم بارِ دگر کن	۲۷۶
۸۵۔	آرزوئے حضوری	۲۸۱
۸۶۔	التماسِ دُعا	۲۸۳
۸۷۔	محبت کا مدفن بنایا گیا	۲۸۴
۸۸۔	مرحومہ بیٹی ثوبیہ اقبال کے لیے	۲۹۲
۸۹۔	اے عرب کی سرزمین!.....علامہ محمد اقبالؒ	۲۹۳
۹۰۔	کتاب میں مستعمل اقتباسات	۲۹۴
۹۱۔	حرفِ سپاس	۲۹۵
۹۲۔	اعتراف و اعتذار	۲۹۶

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو
(اقبال)

گدازِ یک نوا

غارِ حرا کی نورانی فضا میں، فرشتے نے تیسری بار زور سے بھینچا اور زور سے کہا ''پڑھ''۔ تو عرب کا وہ عظیم اُمّی، افصح العرب ہوکر، علم کا شہر بن چکا تھا۔ قرآن خطاب کے انداز میں اُترا اور خطاب ہی کے انداز میں جب اُس عظیم وجلیل خطیب کی زبانِ صدق اظہار سے، منکرین کی سماعت سے ٹکرایا تو وہ سناٹے میں آ گئے اور سناٹے گوش برآواز ہو گئے ؎

دریا کا جوش رُک گیا، طوفان تھم گیا
جو تھا جہاں، لرز کے، اُسی جا پہ جم گیا

سننے والے انکار بھی کرتے رہے مگر چھپ چھپ کر سنتے بھی رہے.....اور سخن سنجانِ حجاز کے سامنے جب سورہ کوثر پڑھی گئی تو وہ بیک زبان کہہ اُٹھے کہ یہ زمین تو آسمان سے آئی معلوم ہوتی ہے.....عربی ام الالسنہ ہے۔ ہم اس زبان سے ناآشنا ہیں، اس کی بلیغانہ رعنائیوں اور جمالیاتی دلپذیریوں کو کیسے سمجھیں گے؟ لَا الٰہ الا اللّٰہُ محمد رسول اللّٰہ، ایک انقلاب آفرین کلمہ ہے، سورہ فاتحہ اور درود شریف دو عظیم دعائیں ہیں، ہم دن میں کئی بار اِنھیں مشینی انداز میں پڑھتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ کیا کہہ رہے ہیں اور کسے کہہ رہے ہیں؟ اگر سمجھ کے پڑھ رہے ہوتے تو قلب ونظر کب کے بدل گئے ہوتے ؎

لا الٰہ گوئی بگواز روئے جاں
تا ز اندامِ تُو آید بوئے جاں

یہ الگ بات کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس ''حفظِ بے معرفت'' پر بھی حرف حرف نیکیاں عطا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ قرآن پاک کا لفظی ترجمہ ہمیں تفہیم تو کرا دیتا ہے مگر نہ آنسوؤں کو زبان دیتا ہے اور نہ شوق کو ذوق عطا کرتا ہے، نہ روح لرزتی ہے اور نہ دل دھڑکتا ہے۔ فکر ونظر اور قلب وجگر کی ہم آہنگی تو دور کی بات ہے۔ یہی حال قرآنی اور مسنون دعاؤں کا ہے۔ اُنھیں پڑھنا چاہیے اور ضرور

پڑھنا چاہیے مگر سمجھ کر پڑھنا چاہیے تا کہ مانگنے والے کو کم از کم یہ تو علم ہو کہ وہ کیا مانگ رہا ہے؟ اور کس انداز سے مانگ رہا ہے؟۔ یہ دعائیں امام کعبہ مولانا عبدالرحمٰن السدیس بھی رمضان المبارک میں مانگتے ہیں، اُن کی قرأت کا سوز، طلب کا انداز اور لہجے کا گداز۔ جیسے ایک بچہ بلک بلک کر، لپک لپک کر اور لپٹ لپٹ کر کوئی چیز طلب کر رہا ہے۔ پورا حرم آہوں، سسکیوں اور ہچکیوں سے معمور ہو جاتا ہے، بیانِ حسن، حسنِ بیان سے ہم آہنگ ہو تو لفظ لفظ دل میں تر از و ہوتا چلا جاتا ہے.....اسی لیے مجھ ایسے 'پڑھے لکھے ان پڑھوں'' کو یہی ہدایت کی جاتی ہے کہ طواف کعبہ کے دوران میں تیسرے کلمے اور رَبَّنَا اٰتِنَا فِیْ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِیْ الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ o

کے سوا، اپنی زبان میں التجائیں کریں تا کہ طلب میں سوز، فریاد میں تڑپ اور دعا میں گداز پیدا ہو سکے کہ یہی گداز، دعا کی قبولیت کا اعتبار ہے ؎

مانگی ہے دعا کس نے الٰہی! کہ کھلا ہے
آغوشِ تمنا کی طرح، بابِ اثر آج

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے، راقم الحروف کو بیت اللہ اور مسجد نبوی میں حاضری کی توفیق عطا کرتے رہتے ہیں۔ میں یہاں مسنون دعائیں (بحمد للہ کافی یاد ہیں) بھی پڑھتا ہوں اور مسلسل پڑھتا ہوں، چونکہ میں اردو ادب کا طالب علم ہوں اس لیے موقع کی مناسبت سے بعض اوقات کچھ اشعار حاشیۂ خیال پر لہرانے لگ جاتے ہیں، حمد و نعت کے بھی اور غزل کے بھی۔ غزل کا شعر وحدتِ خیال کی بنا پر، دل کی دھڑکن کا ساتھ دیا کرتا ہے کہ غزل سوزِ دروں کی آنچ سے لفظوں میں ڈھلتی ہے اور اس میں لفظ لفظ موسیقیت کی میزان میں تُل کر، تیر نیم کش بنتا ہے۔ ان اوراق میں، تاثُّراتی توضیحات کے ساتھ، اُنھی کیف آفرین اشعار کا تذکرہ ہے۔ اس توقع کے ساتھ کہ شاید کوئی شعر، کوئی مصرع، دیارِ ناز میں کسی دل کو کیف اور کسی روح کو سرور عطا کر جائے کہ سرور و کیف کا ایک لمحہ، گھنٹوں کی بے کیف عبادت سے کہیں خوش تر ہے ؎

بکوئے تو گدازِ یک نوا بس
مرا ایں ابتدا، ایں انتہا بس

محمد اقبال جاوید
سعودی عرب
۲۱ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ (۱۹۔اپریل ۲۰۰۶ء)
(پتا) ۴۷۷۔بی سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالا

دُعا

سرورِ کونین ﷺ کے نقطۂ نظر سے

دل سے اُبھرنے والی ہر آرزو، نگاہوں میں مچلنے والی ہر التجا اور لبوں سے بکھرنے والی ہر پکار، دُعا ہی تو ہے بشرطیکہ اس کا مخاطب اللہ تعالیٰ ہو جو علیم و خبیر ہونے کے ساتھ ساتھ سمیع و مجیب بھی ہے، جو دعا، سنتا اور قبول کرتا ہے جس کی رحمت سے نا اُمیدی نہیں اور جس کی نعمتوں سے کسی کا دامن خالی نہیں، نہ جس کی مغفرت سے کوئی مایوس ہے اور نہ جس کی عبادت سے کسی کو عار ہے، نہ جس کی رحمتوں کا سلسلہ ٹوٹتا ہے اور نہ جس کی نعمتوں کا فیضان رکتا ہے۔(۱) مگر ضروری ہے کہ دعا کرنے والا ایمان اور اطاعت میں مشکوک نہ ہو، کیونکہ عمل کے بغیر دعا ایک تیر بے کماں سے زیادہ وقیع نہیں اور پھر ہم پر کتنی بڑی رحمت ہے کہ ہماری ہر آرزو قبول نہیں ہوتی کیونکہ ہمارا ذہن خام، علم محدود اور فکر مسدود ہے، ہم ایسی چیزوں کی بھی تمنا کر لیتے ہیں جو ہمارے لیے مضر ہوتی ہیں، بچہ شعلوں کی لپک اور تلوار کی دھار سے کھیلنے کے لیے لپکے تو دانا و بینا ذات کو اُسے روکنا ضروری ہوتا ہے، مولا کریم ہماری وہ دعائیں قبول کر لیتے ہیں جنہیں اپنی حکمتِ کاملہ کے مطابق ہمارے لیے موزوں سمجھتے ہیں اور غیر موزوں دعاؤں کو گو قبولیت کا مقام نہیں ملتا مگر وہ رد بھی نہیں ہوتیں بلکہ بندے کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی لاج رکھتے ہوئے، وہ حیا دار ذات، آنکھوں میں تیرتی ہوئی چمک کو عبادت بنا کر ایک اخروی ذخیرہ بنا دیتی ہے(۲)۔

مسکراتی آ رہی ہے پھر کوئی تازہ اُمید
سرد آہوں کو دعا کے ساتھ شامل دیکھ کر

دعا، انسانی فطرت کی خلقی افتاد کا ایک بے ساختہ اظہار ہے، جب بھی کوئی مصیبت آتی ہے تو انسان براہِ راست اُسی ذات بلند و برتر کے حضور میں گڑگڑاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت کو رفع کر دیتا ہے۔(۳) مگر جب آئی، ٹل جاتی ہے تو انسان کی تاویلات اُسے گمراہی کی طرف لے

جاتی ہیں۔ گویا مشکلات کے نرغے میں، طوفانوں کی زد میں، شعلوں کی حدت میں اور حوادث کی شدت میں، دل اسباب سے یکا یک مایوس ہوکر خود بخود مالک اسباب سے رجوع کر لیتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جب اسباب منقطع ہو جائیں تو مسبب الاسباب کی یاد، ایک فطری تقاضے کے طور پر اُبھرتی ہے۔ جو لوگ ایسے لمحوں میں بھی چرخ نیلی فام کی طرف نہیں دیکھتے وہ یقیناً انسانیت کے نور کی آخری کرن سے بھی بے بہرہ ہیں۔

قرآن پاک نے جتنا زور توحید پر دیا ہے اتنا کسی اور مسئلے پر نہیں اور ہر نبی نے اپنی تعلیم میں توحید ہی کو مرکز بنایا ہے، گویا توحید کے اس رشتے کے کمزور ہو جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ دین کی پوری عمارت لرز جاتی ہے، دعا چونکہ عبادت کی روح اور بنیاد ہے اس لیے یہ بار آور نہیں ہو سکتی جب تک توحید کا عقیدہ پختہ بنیاد پر قائم نہ ہو اور توحید کی بنیاد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور حقوق میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں۔

> ''قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے، اس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی راہیں بھی بند کر دیں اور یہی اس باب میں اس کی خصوصیت ہے۔ ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق خدا ہی کی ذات ہے۔ پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اُسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور اُن کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا تم نے اُسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا، وہ کہتا ہے کہ دعا، استعانت، رکوع و سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیاز مندانہ اعمال، وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں پس اگر ان اعمال میں تم نے کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو خدا کے رشتۂ معبودیت کی یگانگت باقی نہ رہی۔'' (۴)

دُعا کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست ہے، فرمانِ ربّانی ہے کہ مجھے پکارو، میں دور نہیں قریب ہوں۔ (۵) سمیع، مجیب اور بصیر ہوں۔ (۶) حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے تخیل کی رفعتوں سے ماورا بھی ہے اور ہماری رگ جاں کے قریب بھی، وہ تاریکیوں سے نور نکالتا اور موت سے زندگی اُبھارتا ہے اور ذروں کو صحرا، قطروں کو قلزم، خزاں کو بہار اور گنگ زبانوں کو نوائے سروش

بنا دیتا ہے۔ ''وہ شستگیٔ زبان اور شگفتگیٔ بیان کی نسبتوں سے بلند اور طلسم ستائش و نیائش سے مستغنی ہے۔ وہ گداز ترنم اور شوخیٔ تکلم سے بے نیاز اور مسرتِ مدح و تلخیٔ ذم سے بے پروا ہے۔''(۷)

اگر کوئی بات اس کے لاہوتی ہونٹوں پر تبسم لا سکتی ہے تو وہ انسانی اضطرار و تکرار ہے کہ اضطرار سے خشوع و خضوع اُبھرتا ہے اور تکرارِ سوال سے صدقِ طلب کا اظہار ہوتا ہے۔ جو ذات بے نیاز ہو اس کے حضور میں، اس کی رضا کے بغیر سفارش اور جو قریب ترین ہو، اس کی بارگاہ میں دخیل و مقرب ہونے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ انسان فطرتاً کمزور، توہم پسند اور جلد باز ہے۔ وہ دربارِ الٰہی پر بھی دنیاوی آداب کا اطلاق کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ اس تک پہنچنے کے لیے بھی توسط ڈھونڈتا ہے جو کلیتاً اس مادی دنیا کی مادی ادا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں التجا کرنے اور اس کی رحمت کو پانے کا ایک ہی وسیلہ اور طریقہ ہے کہ اپنی التجا کو درود کے تقدس میں ملفوف کر کے پیش کیا جائے (۸) کہ درود دعا کے لیے پر پرواز کا کام دیتا ہے۔ اضطرار اور تضرع اُسی ذات کے سامنے ہو سکتا ہے جو مختارِ کل، ہمہ گیر، ہمہ نوع اور ہمہ جہت ہو۔ ''جس کی یکتائی کا نقارہ، اقصائے کائنات میں صبح آفرینش سے بج رہا ہو اور جس کے لیے صد ہزار ازل اور ابد ایک گریز پا لمحے کا غبارِ نفس ہو۔''(۹) تمام کائنات جس کی ذات میں اسیر ہو، جو موجِ نور ہو اور جسے حمد و ثنا کا کوئی سا لہجہ بھی زنجیر نہ کر سکتا ہو ؎

اے خار و خس بحر، ثنائے تو سخن ہا
گنجینۂ گوہر ز مدیحِ تو، دہن ہا

ایسی ہستی ایک اور صرف ایک ہو سکتی ہے، اُسے چھوڑ کر کسی اور سے مانگنا، خود مالک حقیقی ہی کی توہین نہیں، شرف انسانی کی بھی اہانت ہے، حضورﷺ کا فرمان ہے کہ جب کوئی آدمی کسی دوسرے کے لیے دعا مانگے تو اُسے چاہیے کہ پہلے اپنے لیے دعا کرے، پھر دوسرے کے لیے، اس میں توحید کا یہ لطیف نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ دعا کرنے والا، نہ سفارشی ہے نہ با اختیار بلکہ وہ خود بھی اُسی کا محتاج ہے۔

اسلام واحد دین ہے جس میں دعا کو عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ ہماری پوری عبادت ثنا اور دعا ہی کے گرد گھومتی ہے۔ دعا عبادت کی روح اور مغز ہے۔(۱۰) یہ بات اس زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہے جو کھلتی ہی سچائیوں کے لیے تھی۔ حق یہ ہے کہ دعا کے بغیر عبادت ایک لفظ ہے بے معنی، ایک جسم ہے بے روح اور ایک خاکہ ہے بے رنگ، رسول اکرمﷺ کو مولا کریم نے جن ارفع نعمتوں اور فضیلتوں سے نوازا، ان میں ایک خصوصیت ان کا عبد ہونا ہے۔ عبدیت، ربوبیت سے

وابستہ ہے۔عبدیت کا کمال اس کی عاجزی میں اور ربوبیت کا کمال اس کے اختیار کامل میں ہے، عبادت، عبدیت کا نشانِ امتیاز ہے اور دعا، عبادت کا جوہر، دُعا ہو نہیں سکتی جب تک انسان، اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ جانتے ہوئے عجز وانکسار کا پیکر نہ بن جائے کہ وہی ذات ہر نوع کے نفع وضرر پر قادر ہے۔حضورﷺ نے دعا کو شعار زیست بنایا اور بطور نبی دعوت اُن کا معمول بن گئی، آپﷺ کی خلوتیں دعاؤں کے نور سے مستنیر اور جلوتیں، دعوت وتذکیر کے حسن سے ممیّز تھیں، غارِ حرا سے لے کر طائف کے میدان تک، بدر سے لے کر حنین تک، میدان احد سے لے کر فتح مکہ تک اور خانگی زندگی سے لے کر نظام حکومت تک، حضورﷺ کے شب وروز دعاؤں کے حصار میں رہے ہیں، گویا آپﷺ کی دعوت حق، آزمائش کے سنگین مرحلوں میں سے اگر کامیاب نکلی تو اس کا سبب اللہ کی رحمت تھی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے لیے دعا کا واسطہ اور سہارا لازم ہے۔(۱۱)

حضورﷺ سے قبل انسانی زندگی میں دعا کا پہلو دھندلا گیا تھا، کیونکہ انسان کے سامنے ربوبیت کا کوئی واضح تصور نہ تھا۔اس کا سینہ ایمان ویقین سے تہی تھا۔سینکڑوں آستانے اور ہزاروں دروازے تھے مگر وہ سب مل کر بھی کوئی ایسا مرکز نہ اُبھار سکے تھے جو یقین وایقان کے ساتھ ساتھ نیاز وناز کا محور اور بخشش وعطا کے ساتھ ساتھ جبروت وقہاری کا سرچشمہ بھی ہو۔جب منزل غیر واضح ہو تو راستے کا دھندلا جانا اور ہمتوں کا ہار جانا ضروری ہوتا ہے۔جب چشمہ ہی صافی ولبریز نہ ہو تو سیرابی کی جملہ امیدیں مجروح یاس ہو کر رہ جایا کرتی ہیں اور جب منزل کشش سے محروم ہو تو گمراہی مقدر ہو جایا کرتی ہے۔ظاہر ہے کہ دعا، سینکڑوں سے نہیں کی جاسکتی، ہاتھ ہر ایک کے سامنے نہیں پھیل سکتا اور دکھتی ہوئی پیٹھ کو ہر دیوار ٹیک مہیا نہیں کر سکتی، دعا کے لیے ایک ہی بارگاہ ضروری ہے، چنانچہ رسول پاکﷺ کا انسانیت پر سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ انہوں نے توحید کا تصور شستہ اور پختہ کیا اور بندے کو ہزاروں دروازوں سے اُٹھا کر، ایک دروازے پر جھکا دیا۔ نتیجہ معلوم کہ دعا کے وسیلے سے، عبادت، عبودیت کی معراج بن گئی، گویا دعا، بندگی کی شان ہے، اور دعا سے گریز، نخوت کا نشان ہے اور غرور وتکبر کا نتیجہ ذلت وخواری ہے۔(۱۲) انسان اشرف المخلوقات ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا وہ جہاں بھی جھکے گا اس کی تحقیر ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں جھکنے سے وہ بہر نوع سربلند رہے گا، کیونکہ وہی ذات مالک کل بھی ہے اور رازقِ دو جہاں بھی۔مرکزِ رشد وہدایت بھی ہے اور سرچشمۂ الطاف وعنایات بھی۔مرجعِ خلائق بھی ہے اور قادرِ حیات و ممات بھی۔اکبرالہ آبادی کا شعر ہے ؎

خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر
یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

گویا عبادت، معراج انسانی اور دعا، حسن عبادت ہے، جس طرح عبادت اللہ تعالیٰ ہی کی ہو سکتی ہے، بعینہٖ دعا بھی اسی سے کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے سے حاجت روائی کی التماس صریح شرک ہے۔ جو خود وسائل کی تلاش میں ہو، جو خود اللہ تعالیٰ کے حضور میں رسائی کا طالب ہو اور جو خود رحمت کا اُمیدوار اور عذاب سے خائف ہو۔ (۱۳) وہ استمداد و استعانت کا مرکز و محور کیسے ہوسکتا ہے ۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اور سورۂ رعد میں اللہ تعالیٰ کس قدر صاف اور بلیغ انداز میں فرماتے ہیں کہ :

اُسی کو پکارنا برحق ہے، وہ دوسری ہستیاں جنہیں اس کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں۔ وہ اُن کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں، اُنہیں پکارنا تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ میرے منہ تک پہنچ جا، حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔ (۱۴)

دعا، عبادت کی طرح انفرادی فعل بھی ہے اور اجتماعی بھی، انفرادی اس وقت جب ایک شخص راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر، جھک جھک کر اور رو رو کر اللہ تعالیٰ کی رحمت کو آواز دے اور اجتماعی اس وقت جب ایک مسلمان اپنی دعاؤں میں، اپنے ساتھ ساتھ کائنات سمیٹ لے، یہاں تک کہ حضورﷺ کے لیے بھی رحمت و برکت طلب کرے، گویا اپنی التجاؤں میں روزِ آفرینش سے لے کر یوم قیامت تک کے جملہ مسلمانوں کو شریک کر لے۔ (۱۵) دعا کے لیے کسی دوسرے شخص کو متقی اور مستجاب الدعوات سمجھ کر التماس بھی کی جاسکتی ہے، مگر نکتۂ توحید یہ ہے کہ ملتمِس اور ملتمَس، دونوں کا قبلۂ مراد، منبعِ کرم، مخاطب دعا اور مرجعِ دعا، اللہ تعالیٰ ہی کی ذات بلند و برتر ہو، گویا نگاہ، فاعل حقیقی ہی پر رہنی چاہیے۔ دعا کے وقت بھی اور قبول دعا کے بعد بھی۔ حضورﷺ نے فاروقِ اعظمؓ سے اس وقت دعا کے لیے فرمایا جب وہ عمرے کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ حضور ہی نے اویس قرنیؓ سے اپنے لیے اور اُمت مسلمہ کے لیے دعا کی نصیحت فرمائی، صحابہ کرامؓ اپنی مشکلات کے لیے بارگاہِ نبوتﷺ سے رجوع کیا کرتے تھے اور حضورﷺ کی دعائیں مشکل کشا اور وجہ سکون ثابت ہوا کرتی تھیں۔ (۱۶)

حمد وثناء اور درودِ پاک ہی وہ واسطہ، ذریعہ اور رابطہ ہے جس سے دعا شرفِ قبول پاتی ہے۔ درود ایک جامع حوالہ ہے۔ اس میں آل کا لفظ وسیع المعنی ہے۔ اس سے اہل بیت بھی مراد ہیں اور وہ تمام لوگ بھی جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور رسول پاک ﷺ سے عقیدت واطاعت کا رشتہ ہے اور یہی وہ نیک انسان ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو فراواں کر رکھا ہے اور جنہیں مشیت نے سفارش کے لیے چن لیا ہے۔ (۱۷) جن کے راستے پر چلنے کی تمنا، ہر مسلمان، ہر نماز میں کرتا ہے۔ تقلید کے لیے تقرب ضروری ہے اور تقرب دلی تعلق کے بغیر پیدا نہیں ہوتا، اگر حضور ﷺ سے اور اُن کے سچے مقربین و متبعین سے دلی تعلق ہو اور دعا، اسی تعلق کے حوالے سے شروع ہو اور اسی پر ختم ہو تو قبولیت کے ایوان خود بخود وا ہو جایا کرتے ہیں ۔

جاتی ہے عرش پر یہ تمہارے ہی فیض سے
میری دعائے دل کا سہارا تمہی ﷺ تو ہو

فطرتِ انسانی پیکرِ محسوس سے جلد رجوع کرتی ہے۔ (۱۸) اور اس کے ساتھ یقین کا رشتہ فوراً استوار کر لیتی ہے اور خدا چونکہ ان دیکھا ہے۔ اس لیے اُسے دور، بہت دور سمجھ لیا جاتا ہے۔ قرآن پاک نے اس وہم کے ازالے کے لیے بار بار کہا کہ اللہ ہی کو پکارو، جلوت میں، خلوت میں، تنگی میں، آسائش میں، چپکے سے، آواز سے، دل کی دھڑکنوں، آنکھوں کے آنسوؤں اور روح کی لرزشوں سے، اُسے اور صرف اُسے پکارو، اس انداز سے پکارو، جس انداز سے حضور ﷺ نے پکارا، جب یہ انداز اپنایا جائے گا تو اللہ، رگ جاں سے قریب محسوس ہوگا اور ہر پکار کا جواب ملے گا۔ وہ خالق کائنات ہے، اُسی کی طرف لوٹنا ہے، وہی معافی دینے والا ہے اور وہی قریب و مجیب ہے۔ (۱۹) ۔

علاج رنج وغم وہی، قرار قلب و جاں وہی
شکیب وصبر کل وہی، سکوں وہی، اماں وہی

دعا، مصلحت الٰہی پر مبنی ضرور ہے مگر رضائے الٰہی سے متصادم نہیں بلکہ دونوں لازم وملزوم ہیں، ہر نتیجے کے لیے سبب ہوتا ہے، ایک بار حضرت علیؓ ایک ایسی دیوار کے پاس سے گزر رہے تھے جو گرا چاہتی تھی۔ آپؓ نے راستہ بدل لیا، کسی نے پوچھا، کیا آپ اللہ کی قضا سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا میں قضا سے بھاگ کر قدر کے دامن میں پناہ لے رہا ہوں۔ گویا ہر قضا کسی نہ کسی سبب سے وابستہ ہے۔ یہ اسباب بھی خالق اسباب کے مہیا کردہ ہیں۔ اسی طرح کسی مقصد کا حصول نتیجہ ہے تو دعا اس کا سبب ہے، اللہ پاک دعاؤں کو قبول کرتے ہیں۔ گویا آئی، جا

سکتی اور بگڑی، بن سکتی ہے، ضرورت تضرع اور تذلل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل، رحمت اور عافیت طلب کرتے رہنے کی ہے۔ (۲۰) ارشادِ نبوت ﷺ ہے کہ ''دعا بہر حال نافع ہے ان بلاؤں کے معاملے میں جو نازل ہو چکی ہیں اور ان کے معاملے میں بھی جو نازل نہیں ہوئیں، پس اے بندگانِ خدا، تم ضرور دعا مانگا کرو۔'' (۲۱) دعا ایک ایسی نعمت ہے جس سے قبر کے مراحل بھی آسان ہو جاتے ہیں، یہ زندوں کی طرف سے، مردوں کے لیے ایک بہترین ارمغاں ہے۔ گویا دعا سے آئی ہوئی مصیبتیں بھی کافور ہوتی ہیں اور مستقبل کے اندھیرے بھی چھٹ جاتے ہیں، عقیدے کی بات صرف یہ ہے کہ ہر نوع کی ظلمتوں کو نور عطا کرنے والی ذات ایک اور صرف ایک ہے۔ اقبالؔ نے ایک مقام پر کہا ہے کہ ؎

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

اس میں بھی کوشش اور دعا کی اس تاثیر کی طرف اشارہ ہے جس سے بحکم الٰہی قضا ٹلتی اور زندگی سنورتی ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ دعا، صرف ان امور کے بارے میں نہیں مانگنا چاہیے جہاں انسان خود کو مجبور محسوس کرے بلکہ انسان کو ہر حال میں، اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں خود کو مجبور و بے بس تصور کرتے ہوئے اس کی بارگاہ میں رجوع کرنا چاہیے، ہر کام اُسی کے نام اور اُسی کی رحمت کی طلب سے شروع کرنا چاہیے کیونکہ اُسی کی توفیق، تدبیر کو تقدیر بناتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ؎

تم میں سے ہر شخص کو اپنی ہر حاجت اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہیے حتیٰ کہ اگر اس کی جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا سے دعا کرے۔ (۲۲)

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کی منافقتوں، نگاہوں کی خیانتوں، اعمال کی ریاکاریوں اور خوشنما الفاظ کی حقیقتوں کو جانتے اور ہماری نیتوں کو بھی پہچانتے ہیں، وہ ہمارے ارادوں، خیالوں اور خوابوں کی غرض و غایت جانتے ہوئے بھی یہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کے حضور میں گڑگڑاتے رہیں، اور وہ اپنے فیضانِ نعمت سے نوازتے رہیں، مانگنے والوں کی آوازیں گونجتی رہیں اور اللہ تعالیٰ دعاؤں کے ان نغموں سے خوش ہوتے رہیں اور یوں عبد و معبود کا ازلی تعلق پختہ تر اور تازہ تر ہوتا رہے۔ متنبّی کے ایک شعر کا مفہوم یوں ہے کہ:

جب تجھ سے سوال کیا جاتا ہے تو اس لیے نہیں کہ تو مانگنے والوں کو سوال کی زحمت دینا چاہتا ہے بلکہ اس لیے کہ تجھے سائلوں کی آواز اچھی معلوم ہوتی ہے اور جب تجھے پردوں میں چھپایا جائے تو

تیری نعمتیں تیری غمازی کرتی ہیں۔اور یہ کہنا کہ ؎

دینے والا خود سمجھتا ہے جو لینا ہے ہمیں
ہم توکل آشنا دستِ دعا رکھتے نہیں

کم فہمی، بے نصیبی، آزاد خیالی اور توکل کا غلط مفہوم ہے۔حق یہ ہے کہ بعض اوقات عالم راز و نیاز میں آواز کی دلکشی اس قدر پسند آ جاتی ہے کہ حصولِ مقصد میں تاخیر کر دی جاتی ہے کہ احسنِ تقویم کے حسن کے ساتھ ساتھ اس کا حسنِ بیان بھی فضا میں رس گھولتا چلا جائے اور ذوقِ حضوری سے داستان طویل ہوتی چلی جائے اور بعض اوقات اندازِ التجا اس قدر ناگوار ہوتا ہے کہ پہلی صدا پر ہی کچھ نہ کچھ دے کر، سائل کو بھگا دیا جاتا ہے۔(۲۲/الف) اور بسا اوقات بدکردار انسان، دنیاوی تعیش سے مالا مال کر دیئے جاتے ہیں تا کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی جانب مائل ہونے کی توفیق چھن جائے ؎

داد او فرعون را صد ملک و مال
تا ننالد سوئے حق آں بدسگال
در ہمہ عمرش نہ دید او درد سر
تانگرید سوئے حق آں بد گہر

اور کبھی اللہ والوں کو آزمائشوں میں ڈال دیا جاتا ہے کہ صبر کے وہ لمحے محبوب سے تقرب کا بہترین ذریعہ اور دعاؤں کے اضطرار کا پُر کیف سبب ہوتے ہیں ؎

یہ ہے پہچان خاصانِ خدا کی ہر زمانے میں
کہ خوش ہو کر خدا ان کو گرفتارِ بلا کر دے

اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں۔وہ ہر لحظہ نئی شان سے جلوہ گر رہتے ہیں۔(۲۳) ان کے پاس لوح محفوظ ہے۔وہ جس تحریر کو چاہتے ہیں محو کر دیتے ہیں اور جو چاہتے ہیں، ثبت کر دیتے ہیں۔(۲۴) اور دعا میں اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ وہ عام حالات و کیفیات ہی کو نہیں بلکہ مقدرات کو بھی بدل دیتی ہے۔یہ تاثیر اللہ ہی نے رکھی ہے اور اس کی روشنی میں بدلنے والا بھی اللہ ہی ہے۔یوں دعاؤں کے فیض اور رحمتِ الٰہی کے فیضان سے تقدیر کے انداز بدلتے، مصائب کے بادل چھٹتے اور تکوینیات کے رخ پلٹتے ہیں۔یہ تمام تبدیلیاں، ابتدائے آفرینش ہی سے قدرت کے سامنے واضح، روشن اور مرتب ہیں۔ان میں نہ کوئی ابہام ہے، نہ ایہام، خود مالک تقدیر نے اس تغیر و تبدل کو دعا سے وابستہ کر رکھا ہے۔مفتی سید جعفر حسین نے لکھا ہے کہ ''جس نے قضا کو نافذ کیا ہے اُسی

نے دعا میں یہ اثرات ودیعت کیے ہیں کہ وہ قضا کے نقوش بدل دے اور تقدیر کے نئے سانچے تیار کرے اور قدرت جب چاہے مقدرات کو بدل سکتی ہے۔ نہ اُسے کوئی مجبوری لاحق ہے اور نہ کوئی چیز اس کے ارادے میں حائل ہوسکتی ہے۔'' (۲۵) حقیقت یہی ہے کہ نہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور نہ وہ کسی نوع سے مجبور ہے۔(۲۶) اگر انسان تقدیر کو اٹل سمجھ کر، عبادت اور دعا سے ہاتھ اُٹھالے تو بطور عبد یہ اس کی انتہائی بدبختی ہوگی اور اس کے ساتھ ہی انسانی زندگی کا سارا حسنِ عمل، معطل ہوکر رہ جائے گا ؎

ہے نوشتے کا یقیں ناسازیٔ ذوقِ عمل
حوصلے میرے توکل تک مجھے لائے نہیں

اور غالباً یہی مفہوم ہے اقبال کے اس شعر کا جس میں وہ مسلمان کو خود تقدیر یزداں بن جانے کی تلقین کرتے ہیں ؎

غلط ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

اس مادی دنیا کی ظاہری ضروریات کے لیے مولا کریم نے ہمیں شعور، طاقت اور صلاحیت عطا کی ہے۔ اگر انسان کی ہر دعا قبول ہوجائے تو اس کا نقصان یہ ہے کہ انسانی قوا مضمحل اور معطل ہوکر رہ جائیں گے اور یہ دارالعمل، بے عملی کا نشان بن جائے گا۔ نیز انسان سعی وعمل سے کنارہ کش ہوکر دعا اور صرف دعا کا ہوکر رہ جائے گا۔ کوشش انسانی فرض ہے اور اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ پر بھروسا اور اس کی کارسازی پر مکمل یقین ضروری ہے۔

کسی مقصد میں کامیابی کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ سچی طلب، سعیٔ پیہم اور رحمت خداوندی، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلی دونوں چیزیں، تیسری چیز کو خود بخود جذب کرلیا کرتی ہیں، یہ اسلام کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے دعا کے فیض سے کلیتاً مادی مقاصد میں بھی روحانی انوار بکھیر دیئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دعا میں کشش اور تاثیر رکھ دی ہے۔ یہ عرش سے ٹکراتی، عالم بالا کو درہم برہم کرتی اور رحمت کو مقناطیس کی طرح کھینچ لیتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ انسان دل کی گہرائیوں سے فریاد اُبھارنے کا سلیقہ سیکھ لے ؎

منگتے کا ہاتھ اُٹھتے ہی داتا کی دین ہے
دُوری قبول وعرض میں بس ہاتھ بھر کی ہے

نالہ، خام ہوتو بے تاثیر ہوکر فضا میں بکھر جاتا ہے۔ پختہ ہوتو فضاؤں میں ایک دائمی ارتعاش پیدا کر کے، تیر بہدف ہو جاتا ہے، ایسی قلبی کیفیت کو قرآن کی بلیغ زبان ''اضطرار'' ۔(۲۷) سے تعبیر کرتی ہے۔ یہی اضطرار دعا کا مغز ہے اور مغز کے بغیر نہ کوئی دانہ اُگ سکتا ہے اور نہ پھل پھول لاسکتا ہے۔ اگر یہ اضطرار نصیب ہو جائے اور دعا، موزوں بھی ہو اور اللہ تعالیٰ کی حکمتوں پر یقین کامل بھی ہوتو دعا، تصور سے کہیں پہلے بارآور ہوجایا کرتی ہے ؎

مانگی ہے دعا کس نے الٰہی! کہ کھلا ہے
آغوش تمنا کی طرح بابِ اثر آج

تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی قلبی اضطرار نے اللہ تعالیٰ کی رحمت کو آواز دی تو رحمت کا جوش دیدنی تھا۔ ابوجہل کی لونڈی حضرت زنیرہؓ نے اسلام قبول کیا، سزا کے طور پر اس کی آنکھوں میں گرم سلاخیں پھیر دی گئیں، یہ منظر دیکھ کر آوارگانِ مکہ ناچنے اور گانے لگے کہ لات ومنات نے زنیرہؓ کو اندھا کر دیا۔ اس وقت زنیرہؓ نے فرمایا:

وَاللّٰهُ اِنِّیْ کَفَرْتُ بالّات و عزّیٰ
یعنی میں اب بھی تمہارے لات وعزیٰ کا انکار کرتی ہوں
نتیجہ معلوم کہ
فردّ اللّٰہ الیھا بَصَرَ ھا. (۲۸)
اللہ تعالیٰ نے ان کی بینائی لوٹا دی۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ ایک نابینا نے حضورﷺ سے استدعا کی کہ اللہ تعالیٰ ان کی بینائی درست کر دیں، حضورﷺ نے فرمایا کہ تم خود دعا کرو، میں آمین کہوں گا، محدثین کا بیان ہے کہ سائل کی بینائی بحال ہوگئی۔ یہ واقعہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ، پیدائشی نابینا تھے، ان کی والدہ نے حرم شریف میں حاضری دی تو ملتزم سے چمٹ کر فریاد کی کہ اللہ! میں نے تجھ سے منت مانی تھی کہ اپنا بچہ دین کے لیے وقف کر دوں گی مگر وہ تو نابینا ہے۔ تو اس کو آنکھیں دے دے، جوش طلب میں آ کر یہ بھی کہہ گئیں کہ اے اللہ! اگر تو نے اسے آنکھیں نہیں دینا تو کہہ دے کہ تیرے خزانے میں آنکھیں نہیں ہیں، جب یہ عظیم خاتون گھر لوٹیں تو بچہ بینا تھا اور اسی بچے نے

پھرانوارِحدیث سے دنیا بھرکو بینا کر دیا۔ (۲۹)

دعا کی قبولیت کے لیے رزقِ حلال ضروری ہے۔(۳۰) کہ اس کے بغیر نہ سوچ درست رہتی ہے نہ عمل صالح، اسی سے التجا، خلوص کے سانچے میں ڈھل کر اور دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر سراپا اضطرار ہو جاتی ہے۔ حضورﷺ نے قبولیت دعا میں بے تابی اور جلد بازی سے منع فرمایا ہے۔(۳۱) اور بددعا سے بھی روکا ہے،(۳۲) مشرک کے لیے دعائے مغفرت بھی نہیں کی جاسکتی، (۳۳) اس بات کی بھی تاکید ہے کہ دعا میں موت کی تمنا نہ کی جائے (۳۴) کہ موت انقطاعِ زندگی کا نام ہے اور عمل زندگی ہی سے وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رضا کے لیے عمل ضروری ہے۔ نہیں معلوم کہ کس لمحے توبہ قبول ہو جائے اور کون سا عمل رضائے الٰہی کا سبب بن جائے۔ اگر زندگی کے بعض لمحے اس قدر روح فرسا ہو جائیں کہ موت ہی میں عافیت نظر آئے تو مایوس انسان کو چاہیے کہ ایسے شدائد صبر سے برداشت کرے اور دعا کے دامن سے وابستہ رہے، اللہ تعالیٰ سے صبر و استقامت کی توفیق مانگتا رہے کہ اُسی کی رحمت سے عقدے حل ہوتے اور ظلمتیں نور کے پیرہن میں مسکراتی ہیں، بصورت دیگر موت کی طلب سے عمل کو روک دینا اور دعا سے کنارہ کش ہو جانا، اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عبد و معبود کے تعلقِ خاص سے بیگانہ ہو جانا ہے اور اسی کا نام خسارہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہی دل مایوس ہوا کرتے ہیں جن میں کفر نے اپنا آشیانہ بنالیا ہو۔

اللہ تعالیٰ سے ہاتھ اُٹھا کر مانگنے میں، دینے والے کی عظمت کا احساس جلوہ گر ہے اور ہاتھ منہ پر پھیرنے میں یہ تصور کارفرما ہے کہ یہ ہاتھ خالی نہیں رہے بلکہ رحمت، شریکِ حال ہے، حمد و ثنا اور درود و سلام کے بغیر دعا منزل آشنا نہیں ہوتی بلکہ فضاؤں میں سرگرداں رہتی ہے۔ دعا کے بعد ''آمین'' کہنا بھی ضروری ہے کہ اسی سے قبولیت کے یقین کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ دعا کے الفاظ میں سادگی اور بے ساختگی ہونی چاہیے، التجا میں تڑپ اور سوز لازم ہے۔ ضرورت اور موقع کے مطابق اللہ تعالیٰ کو ان کے بہترین ناموں سے پکارنا چاہیے، دوسروں کے لیے مغفرت کی دعاؤں سے پہلے اپنے لیے دعا کرنا چاہیے، پھر دوسروں کے لیے کہ قرآن پاک میں انبیاء کی دعاؤں کا لب و لہجہ یہی ہے۔ احادیث کے مطابق دوسروں سے دعا کی التماس بھی کرنی چاہیے اور دوسروں کے لیے غائبانہ دعائیں بھی کرنا چاہئیں کہ غائبانہ دعا میں خلوص و گداز بدرجۂ اتم کارفرما ہوتا ہے۔ (۳۵)

در حضورت ار، دعا گویم چہ سود
گوئی کہ تزویر دستاں می زنم
ساکنم ایں نغمہ را درنیم شب
ہمرہِ مرغِ سحر خواں می زنم

حضورﷺ کا فرمان ہے کہ اولاد کے حق میں ماں باپ کی دعا، اکسیر اعظم سے کم نہیں۔ مسافر اور مظلوم کی آہ بھی خالی نہیں لوٹتی۔ (۳۶) کیونکہ یہ تینوں دعائیں خلوصِ دل کی بہترین کیفیتوں کی حامل ہوتی ہیں۔ ایک بیمار مرد مومن کی دعا جبکہ وہ شفایاب نہ ہو رہا ہو، بہت جلد قبول ہوتی ہے کیونکہ وہ بستر علالت پر قربِ الٰہی سے سرفراز ہوتا ہے اس کی بیماری اُس کی لغزشوں کے لیے عفو و درگذر اور رحمت خداوندی کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔ علاوہ ازیں فرض نماز کے بعد، ختم قرآن کے بعد، اذان و اقامت کے دوران میں، بوقت جہاد، نرغۂ اعدا میں، بوقت بارش، کعبۃ اللہ کے روبرو اور تہجد کے اوقات میں، دعا، قبولیت سے نوازی جاتی ہے۔ گویا دعا کی قبولیت کے لیے اضطرار و خلوص کے ساتھ ساتھ ہنگامِ موزوں کی بھی ضرورت ہے۔ رات کے تارے رازداں ہوں اور نالۂ شبگیر کا رخ سوئے آسماں ہو تو آنسو، موتیوں میں تلتے اور آہوں سے عرش لرز جاتا ہے ؎

اشکِ عنّابی سلامت، چشم پرخوں چاہیے
غازۂ جاں کی بدولت چہرہ گلگوں چاہیے
روز افزوں دولت غم بھی یہاں کس کو نصیب
دولت غم چاہیے اور روز افزوں چاہیے
ارتعاشِ لب غنیمت ہے کبھی بے حرف و صوت
یہ میسر ہو تو پھر کوئی نہ افسوں چاہیے
صبحدم لب پر ہو موسیٰؑ کی دعائے شرحِ صدر
حرفِ موزوں کے لیے، ہنگامِ موزوں چاہیے

رات کے پچھلے پہر، نواؤں میں جو گداز اور دعاؤں میں جو تاثیر ہوتی ہے اور آدابِ سحر خیزی میں جو کیف مضمر ہوتا ہے اس کا شناسا ہر دل نہیں ہو سکتا ؎

سونے والو! تم کو اس لذت سے آگاہی نہیں
رات ساری عشق کی، آنکھوں میں جب کٹ جائے ہے

اللہ تعالیٰ کی ذات شفقت ورحمت کا ایک بحر بیکراں ہے۔ایسا شفیق محبوب کہ مانگنے کی تلقین بھی کرتا ہے، آداب بھی خود ہی بتاتا ہے اور ہر التماس کا جواب بھی مثبت دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ تضرع باریاب ہے۔(۳۷) جس کے ساتھ سر ہی نہیں، دل بھی جھکا ہوا ہو۔وہاں ان آنسوؤں کی قدر ہے جو دل کی گہرائیوں سے اُٹھیں اور وہاں وہ لرزشیں قبول ہیں جن کا تعلق جسم سے نہیں روح سے ہو، اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا ایک دقیع ترین عمل ہے، (۳۸) حدیث میں ہے کہ:

''قضا وقدر سے بچنے کی کوئی تدبیر فائدہ نہیں دیتی، اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا اس میں بھی نفع پہنچاتا ہے، جو نازل ہو چکی اور اس میں بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئی اور بے شک بلا نازل ہونے کو ہوتی ہے کہ اتنے میں دعا اس سے جا ملتی ہے۔پس قیامت تک ان میں کشمکش رہتی ہے۔''(۳۹)

اللہ تعالیٰ بار بار مانگنے سے ناراض نہیں ہوتے بلکہ نہ مانگنے سے ناراض ہوتے ہیں۔(۴۰) کیونکہ اللہ سے نہ مانگنا، خود کو خدا سمجھنا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے حضور میں جھک جاتا ہے وہ ہزاروں درباروں میں سرکشیدہ رہتا ہے اور جس نے اس دروازے سے سرکشی کی، ذلت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔گویا بارگاہِ صمدیت میں رکوع وسجود ہی انسان کا حسن ہے۔یہی وہ خمیدگی ہے جس پر ہزاروں سربلندیاں نثار کی جاسکتی ہیں۔یہی وہ عاجزی ہے جس پر ہزاروں فخر، ناز کرتے ہیں۔گویا وہاں جھکنا عزت اور نہ جھکنا ذلت ہے ؎

تجھ سے مل کر زندگی مقصود مہر و ماہ تھی
تجھ سے کٹ کر دربدر بے آبرو ہونے لگی

حق یہ ہے کہ کوئی اپنے فقر واحتیاج کو دور کرنے کے لیے درِ کریم پر دستک نہ دے تو وہ خود اپنے لیے افلاس ونکبت کو دعوت دیتا ہے۔یہ دستِ کریم کی بخیلی نہیں بلکہ طلب کرنے والے کی کوتاہی وسہل انگاری ہے ؎

گر گدا کاہل بود تقصیر صاحب خانہ چیست؟

مولا کریم کا دروازہ ہر وقت، ہر ایک کے لیے کھلا ہے، مایوسی کفر ہے اور حسنِ ظن، نعمت، حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں (اللہ) اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوں (۴۱) اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ

''ایسانہیں ہے کہ اللہ کسی بندے کے لیے شکر کا دروازہ کھولے اور نعمتوں کی افزائش کا دروازہ بند کر دے اور کسی بندے کے لیے دعا کا دروازہ کھولے اور در قبولیت کو اس کے لیے بند کر دے اور کسی بندے کے لیے توبہ کا دروازہ کھولے اور مغفرت کا دروازہ اس کے لیے بند کر دے۔'' (۴۲)

بہترین دعا عافیت کی دعا ہے۔ عافیت ایک وسیع المعنی لفظ ہے۔ اس میں ہر نوع کو سکون پوشیدہ ہے۔ یہ ایک ایسی طلب ہے جو اپنے دامن میں سرمدی سرخوشی کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے۔ وہ دعا جو خود خدا نے اپنے بندوں کو بتائی وہ سورۂ فاتحہ ہے، یہ وہ دعا ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کی بولی میں اپنے منہ سے ادا کی۔ ہر نبی کی کوئی نہ کوئی دعا محفوظ ہے، مگر اس دعا میں جامعیت کا جو حسن، مقاصد کی جو بلاغت، تعلیمات کا جو ملخص، ثنا کا جو انداز اور توفیق و ہدایت کی جو طلب ہے اس کی جھلک کسی اور نبی کی دعا میں موجود نہیں ہے۔ یہ فی الواقع مغزِ قرآن، جوہرِ قرآن اور ام القرآن ہے۔ دعا کی یہ ایک ایسی مکمل شکل ہے جس میں اختصار، بلاغت اور تاثر کی ایک کائنات مضمر ہے اور فصاحت و شگفتگی کی جملہ ادائیں لوری دے رہی ہیں، رسول کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ:

''بہترین دعا میری اور مجھ سے پہلے نبیوں کی دعا ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی معبود نہیں، سوائے اللہ کے، جو یکتا اور لاشریک ہے۔ اسی کے لیے شاہی و جہانداری ہے، اُسی کے لیے حمد و ستائش ہے، وہ زندگی اور موت دینے والا ہے، اور وہ ایسا زندہ ہے جس کے لیے موت نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ میں بھلائی ہی بھلائی ہے، اور ہر چیز پر اُسے قدرت ہے۔''

یہ دعا سراسر حمد و ثنا پر مبنی ہے اس میں کسی نوع کی کوئی التجا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت اور تحمید و ستائش میں اس قدر ڈوب جانا ہے کہ دستِ طلب پھیلانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی بلکہ ستائش خود بخود جود و سخا کو جوش میں لاتی اور لطف و کرم کی بارش خود بخود دلوں کی بے کیف کھیتیوں کو رشک بہاراں بنا دیتی ہے۔ گویا حمد، دعا بن کر سراپا سوال ہو جاتی ہے۔ حدیث قدسی ہے کہ

''جو شخص میرے ذکر میں اس قدر کھو جائے کہ اُسے دعا کا خیال نہ رہے تو میں جو سوال کرنے والے کو دیتا ہوں اس سے زیادہ اُسے دوں گا۔'' (۴۳)

گویا ذکر کی بیخودی، بذات خود، دعا ہے اور بے خودی کا یہ کیف اور محبت کا یہ والہانہ پن

نصیب ہوجائے تو اسے اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم سمجھنا چاہیے۔ سید محمود رضوی کے الفاظ میں:

بوقت دعا، تصور عظمت جلال الٰہی میں ڈوب جائے۔ اگر اس مبارک تصور نے وہ غلبہ کیا کہ زبان بند ہوگئی تو سبحان اللہ، یہ خاموشی ہزار عرض سے زیادہ کام دے گی۔

اصغر گونڈوی کتنی بڑی حقیقت اس شعر میں بیان کر گئے ہیں کہ ؎

ڈوبا ہوا سکوت میں ہے جوشِ آرزو
اب تو یہی زباں مرے مدعا کی ہے

سورۂ فاتحہ میں جس طرح خوف و رجا کا ایک حسین و جمیل امتزاج ہے، اسی طرح قبول دعا کے لیے مومن کے دل میں اُمید اور خوف کا ایک دلکش توازن ضروری ہے، خوف کہ وہ بے مہار نہ ہو اور اُمید کہ مایوسی اُسے انکار تک نہ لے جائے، کیونکہ انکار سے ایمان کی روح مرجھا جاتی ہے۔ ایمان کا مقام خوف و رجا کے بین بین ہے، قرآن مجید کے مطابق:

''وہ لوگ جو نیکیوں کی طرف تیزی سے بڑھتے تھے اور ہمارے فضل و کرم سے اُمید لگائے اور ہمارے عذاب سے ڈرتے ہوئے دعائیں مانگتے تھے اور ہمارے سامنے سر نیاز جھکائے ہوئے تھے۔'' (۴۴)

خوف و رجا کی یہ درمیانی کیفیت، جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔ تعلقِ قلبی کے بغیر پختہ نہیں ہوتی، تعلق کی پائیداری، ملاقاتوں کے تسلسل سے قائم رہتی ہے۔ یہ رابطہ دائمی ہونا چاہیے، ہر سانس، اس کی یاد اور ہر دھڑکن اس کا ذکر بن جانی چاہیئے، وہی دل کی انگشتری کا نگینہ ہو، وہی کعبۂ مقصود اور قبلۂ شوق ہو۔ وہ لوگ جو صرف ضرورت کے وقت اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں۔ اُن کی پکار یقیناً سنی بھی جاتی ہے اور قبول بھی ہوتی ہے مگر وہ پکار، تیر نیم کش نہیں بن سکتی کہ وہ دائمی کسک اور ابدی تعلق سے محروم ہوتی ہے۔ حفیظ جالندھری کا یہ شعر انسان کی اسی نفسیاتی کیفیت کا عکاس ہے ؎

جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے حفیظ
ایک عادت ہے خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ پیش نظر رہیں۔ خوشحالی میں شکر کے ساتھ، دُکھ میں عافیت کی طلب کے ساتھ، آزمائش میں صلاۃ و صبر کے ساتھ، عیش میں سپاس و نیاز کے ساتھ اور طیش میں خوف و تحمل کے ساتھ، اگر یاد مستقل ہوگی تو طلب بھی دائمی ہوجائے گی اور اسی سے تعلق میں استواری آئے گی، شجر سے پیوستگی ہی، بہار کی اُمید لا سکتی ہے۔ کیونکہ وفاداری جس

کی بنیاد استواری پر ہو، وہی ایمان کہلاتی ہے۔ جلد بازی، محرومی کا پیش خیمہ ہے اور تاخیر سے گھبرا جانا، رحمت کے یقین سے بے بہرہ ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بہترین توقعات اور حسن ظن کی بہترین کیفیتوں کے ساتھ یاد رکھنا چاہیے، نہیں معلوم دروازہ کب کھل جائے اور رحمت کب جوش میں آ جائے، کیونکہ رحمت کا ناگہانی جوش اس کی بے نیازی کی دلیل ہے ؎

اگر بخشے زہے قسمت، نہ بخشے تو شکایت کیا
سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

اگر دعا قبول نہیں ہوتی تو پیہم مانگتے رہنے میں انسان کو قربِ الٰہی کا شرف نصیب رہتا ہے، قبول دعا کے بعد مطمئن ہو کر اور مقبول نہ ہونے کی صورت میں مایوس ہو کر، دعا کا دامن چھوڑ دینا، قربِ الٰہی ایسی عظیم نعمت سے محروم ہو جانا ہے گویا مولا کریم سے انسانی تعلق ''یقین'' کے گرد گھومتا ہے وہاں تذبذب کی ہلکی سی رمق بھی ایمان کو ختم کر دیتی ہے۔ قرآن پاک کی ایک آیت کا ترجمہ یوں ہے:

''اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر اللہ کی بندگی کرتا ہے۔ اگر فائدہ ہو گیا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی مصیبت ہو گئی تو الٹا پھر گیا، اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی اور یہ ہے گمراہی کی انتہا۔'' (۴۵)

حق یہ ہے کہ دعا اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا سبب ہے، یہ نعمتوں کو آواز دیتی اور سعادتوں کو پکارتی ہے۔ سرِّ عبادت بھی ہے اور روح بندگی بھی، اپنے عجز کا اعتراف اور اللہ کے لطف و کرم کا اقرار ہے۔ ارشادِ ربانی کی تعمیل اور اتباعِ سنت ہے یہ انبیاء کا شعار اور مومن کا سہارا ہے نیاز مندی کا کمال اور عبودیت کا جمال ہے اور ''تیز دھار والی انی سے بھی زیادہ مؤثر و کارگر ہے۔'' (۴۶)

دعا سے شکوک و شبہات، ایمان و ایقان میں بدل جاتے ہیں۔ یہ ایمان بالغیب کا ایک عملی مظاہرہ ہے۔ اس سے فلسفی کی سرگرداں عقل کو منزل کا احساس ہوتا ہے۔ اسی سے ارادوں میں شگفتگی، عزائم میں ولولہ اور نگاہوں میں تلوار کی کاٹ پیدا ہوتی ہے اور انسان نفسیاتی طور پر ایک ایسی قوت سے بہرہ یاب ہوتا ہے جو فی الواقع ''خیبر شکن'' ہوتی ہے۔ گویا دعا سے عزم و یقین کو استقامت ملتی ہے اور خدا کا خوف انسان کو ہر خوف سے بے نیاز کر دیتا ہے اور انسان ماسوا کو بتانِ آزری سمجھ کر حقارت کے پاؤں کی ٹھوکر سے اُڑا دیتا ہے۔ جبینوں کو نیاز، سجدوں کو کیف، دلوں کو سکون، روحوں کو گداز اور آنکھوں کو نم، اسی دعا سے ملتا ہے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر یقین کامل اور اپنی

بے بسی کا احساس اُبھرتا ہے اور اسی سے تمرد و سرکشی سراپا نیاز ہو کر رخ انسانیت کا غازہ بن جاتی ہے ۔

بھٹکتے ہیں سبھی دشتِ انا میں
دعاؤں کے اثر کو کون سمجھے؟

دعا، رسول پاک ﷺ کی حیاتِ اقدس کا مستقل سہارا تھی۔ حضور ﷺ سے زیادہ مولا کریم کا ادا شناس کون ہو سکتا ہے؟ بنا بریں آپ ﷺ نے جس انداز سے دعائیں کیں، وہ انداز اللہ تعالیٰ پر ایک نا قابل شکست اعتماد کا اظہار ہے، اس انداز میں، موزوں الفاظ کا حسن، التجا کا دل آویز قرینہ اور بے قرار دل کی بے ساختہ ہوک موجود ہے۔ اور التجا و دعا ہی وہ واحد وسیلۂ اظہار ہے جس سے سچی بے ساختگی نمایاں ہوتی ہے، دعا میں دل کھول کر رکھ دیا جاتا ہے، دھڑکنیں، زبان بن جاتی ہے، نطق، سکوت میں ڈھل جاتا اور گداز، آنکھوں میں نمی بن کر چمکتا ہے، ایسی بے ساختگی کسی اور صنف سخن میں نہیں مل سکتی اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انداز کا بے ساختہ پن اور ہنگامی اضطرار، بسا اوقات، ادبی شکوہ، شعری دلپذیری اور لفظی حسن سے بے نیاز ہوتا ہے۔ مگر حضور ﷺ افصح العرب تھے اور مولا کریم نے انہیں برمحل کلام کی صلاحیت عطا فرمائی تھی، اس لیے اُن کی زبان مبارک سے نکلنے والا ہر لفظ، فصاحت و بلاغت کی اثر آفرینیوں اور مفہوم و مطالب کی دل نشینیوں کا مظہر ہوتا تھا اور پھر حضور ﷺ اپنی مرضی سے کب لب کشا ہوتے تھے، آپ ﷺ کی زبان مبارک، الہام کی گزرگاہ اور وحی کی شاہراہ تھی۔ آپ ﷺ کے دل پر قرآن کا نزول ہوا تھا، آپ ﷺ کی نگاہوں نے عرش کی رفعتوں اور رعنائیوں کو دیکھا تھا اور آپ ﷺ کی روح، خشیتِ الٰہی سے لبریز تھی۔ اس لیے آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والی ہر صدا، جامعیت و ادبیت کے لحاظ سے اس قدر مؤثر ہے کہ آج بھی غیر مسلم، اسلام کی تعلیم سے کہیں زیادہ، حضور ﷺ کی دعاؤں سے متاثر ہوتے ہیں اور وہ ان دعاؤں کو پڑھ کر سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ جس وجود ذی جود ﷺ کا اپنا کلام اس قدر حسین و دل نشیں ہے، اس کے خدا کا کلام کس قدر افصح و احسن ہوگا۔

آپ ﷺ کی دعائیں، نور نبوت سے مستنیر، عرفانِ حق سے بھرپور اور اعجازِ بلاغت سے معمور ہیں۔ آسمانی صحائف کے بعد اگر کوئی اسلوب اور کوئی لب و لہجہ روح و دل میں کیف بن کر اُترتا ہے تو وہ انہی دعاؤں کا اسلوب ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے الفاظ میں:

> ''یہ دعائیں مستقل معجزات اور دلائل نبوت ہیں، ان کے الفاظ شہادت دیتے ہیں کہ وہ ایک پیغمبر ہی کی زبان سے نکلے ہیں، ان میں نبوت کا نور اور پیغمبر کا یقین ہے۔ عبد

کامل کا نیاز ہے، محبوب رب العالمین کا اعتماد و ناز ہے۔ فطرت نبوت کی معصومیت و سادگی ہے، دل دردمند و قلب مضطر کی بے تکلفی اور بے ساختگی ہے۔ صاحب عرض و حاجت مند کا اصرار و اضطرار ہے اور بارگاہِ الوہیت کے ادب شناس کی احتیاط بھی، دل کی جراحت اور درد کی کسک بھی ہے اور چارہ ساز کی چارہ سازی اور دل نوازی کا یقین و سرور بھی۔'' (۴۷)

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح چہرۂ نبوت، آپ اپنی دلیل تھا اور دیکھنے والا بے ساختہ پکار اُٹھتا تھا کہ یہ چہرہ صادق اور امین ہی کا ہوسکتا ہے، اسی طرح مسنون دعائیں خود بولتی ہیں اور ان کا گداز و تاثر، بندے کے عجز کو قبولیت کی سرمدی سربلندی عطا کرتا ہے۔ یہ دعائیں اس قدر جامع ہیں کہ زندگی کی جملہ ضروریات کے لیے مکتفی ہیں اور دعاؤں کا یہ قیمتی سرمایہ اللہ کے فضل سے محفوظ ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ کو پکاریں، جن کے ذریعے ہمارے نبی ﷺ مخاطب ہوئے۔ آج کل بعض لوگ قرآنی اور نبوی ﷺ دعاؤں میں اپنی جانب سے بعض ٹکڑے، تراکیب اور جملے ایزاد کر دیتے ہیں۔ اس نوع کی جسارت، توہین کے زمرے میں آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دعاؤں میں کوئی کمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترمیم و اضافے کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی نقص ہو۔ اگر ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کے الفاظ اور حضور ﷺ کا کلام ہر نوع سے مکمل ہے تو ہمیں اپنی طرف سے پیوند لگانے کی خوفناک جسارت نہیں کرنا چاہیئے، ویسے اپنے طور پر، اپنی زبان میں اور اپنے لفظوں میں، اللہ تعالیٰ کے حضور میں جو بھی دعا کی جائے وہ سنی بھی جاتی ہے اور قبول بھی ہوتی ہے، وہاں تو دھڑکنوں، آہوں، لرزشوں اور آنسوؤں کی بھی پذیرائی ہے ؎

دیدۂ تر سے ڈھلک کر دامنِ رحمت میں تھا
لغزشِ مستانۂ اشکِ ندامت دیکھیے

O

کتابیات

۱۔ نہج البلاغہ

۲۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا'' جب انسان آخرت میں دعاؤں کا ذخیرہ نعمتوں کی شکل میں پائے گا تو بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ اے کاش میری کوئی بھی دعا قبول نہ ہوئی ہوتی، تو ہر دعا کا پھل مجھے یہیں ملتا۔

۳۔ سورۂ زمر، آیت ۸، ۴۹، سورۂ یونس، آیت ۲۲، ۲۳

۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن ۱/،

۵۔ بقرہ آیت ۱۸۶

۶۔ سورۂ ہود، آیت ۶۱/ بقرہ، آیت ۱۲۷، ۱۳۷، ۹۶، ۲۳۳

۷۔ خلیقی دہلوی، ادبستان

۸۔ مجمع الزوائد/ ج ۱۰، کتاب الادعیہ

۹۔ مولانا ظفر علی خاں

۱۰۔ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا، **الدعا مخ العبادۃ**، ترمذی

۱۱۔ حدیث میں ہے کہ جس کے لیے دعا کا دروازہ کھل گیا، اس کے لیے رحمت کا دروازہ کھل گیا، تاریخ جرجان ہیثمی، بیروت/ ص ۲۸۴،

۱۲۔ سورۂ المومن، آیت ۶

۱۳۔ سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۵۶، ۵۷

۱۴۔ سورۂ رعد آیت، ۱۴، ۱۵

۱۵۔ سورۂ حشر، آیت ۱۰،

۱۶۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۰۳،

۱۷۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۵۵،

۱۸۔ سورۂ الزمر، آیت ۱۸، ۴۵،

۱۹۔ سورۂ ہود، ۶۱، ۱۶۱،

۲۰۔ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ سے اس کا فضل مانگو، کیونکہ اللہ اسے پسند فرماتا ہے کہ اس سے مانگا جائے، صحیح ابن خذیمہ/ ۴۷۳،

۲۱۔ مجمع الزوائد، ہیثمی/ ج ۱۰/ ص ۱۴۶

۲۲۔ مسند بزار/رقم ۳۱۳۵

۲۲/الف۔ مجمع الزوائد/ج ۱۰/ کتاب الادعیہ،

۲۳۔ سورۂ رحمٰن، آیت ۲۹، **کل یوم هو فی شان.**

۲۴۔ قرآن سورۂ رعد آیت ۳۹، **یمحو اللّٰه ما شآء و یثبت و عنده ام الکتاب.**

۲۵۔ مفتی سید جعفر حسین، صحیفۂ کاملہ، دیباچہ

۲۶۔ **وقالت الیهود ید اللّٰه مغلولة غلت ایدیهم۔** سورۂ مائدہ آیت ۶۴

۲۷۔ نمل، آیت ۶۲، **امن یجیب المضطر اذا دعاه و یکشف السوء.**

۲۸۔ زرقانی علی مواہب اللدینہ، ۱/ ۲۷۰، سیرتا لمدزینی ۱/ ۲۴۴، سبل الہدیٰ والرشاد ۲/ ۳۶۱

۲۹۔ ابن حجر، ہدی الساری، مقدمہ فتح الباری،

۳۰۔ الترتیب والترہیب/ ۳/ ص ۲۰۷،

۱۳۔ مجمع الزوائد، /۱۰/ کتاب الادعیہ

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ توبہ آیت ۸۰،

۳۴۔ بخاری، بیروت، ج ۹/ ص ۱۰۴/ ترمذی، ۲۴۸۳

۳۵۔ مجمع الزوائد/ ج ۱۰/ کتاب الادعیہ

۳۶۔ سنن دار قلنی، بیروت، ۱۳۶/۲، ومجمع الزوائد، ج ۱۰، کتاب الادعیہ

۳۷۔ اعراف، ادعوربکم تضرعا وخفیہ

۳۸۔ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں دعا سے بڑھ کر کوئی چیز باوقعت نہیں، الحدیث

۳۹۔ ملاحظہ کیجئے حوالہ نمبر ۲۱،

۴۰۔ مجمع الزوائد، ج ۱۰، کتاب الادعیہ

۴۱۔ حدیث نبوی ہے: انا عندظن عبدی بی، مجمع الزوائد، ج ۱۰، کتاب الادعیہ،

۴۲۔ نہج البلاغہ

۴۳۔ ومجمع الزوائد، ج ۱۰، کتاب الادعیہ

۴۴۔ سورۂ انبیاء، آیت ۹۰

۴۵۔ سورۂ حج، آیت ۱۹

۴۶۔ قول امام جعفر صادقؑ

۴۷۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، سیرت محمدی ﷺ دعاؤں کے آئینے میں، دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد، ص ۱۰

O

بارگاہِ اُلوہیّت میں

ملتزم

کے نام

پھر کسی جانِ وفا کی یاد نے
اشکِ بے مقدور کو دریا کیا

☆

الٰہی! برقِ غیرت کی تڑپ مجھ کو عطا کر دے
مجھ آتش زیرپا کو ساتھ ہی آتش نوا کر دے
مری تحریرِ نقص آلود میں کر دے اثر پیدا
کہ اہلِ درد کے حلقوں میں اک محشر بپا کر دے
بتا دوں گا کہ خاکِ پاک یوں اکسیر بنتی ہے
مری پلکوں کو جاروبِ حریمِ مصطفیٰ ﷺ کر دے

(منشور ہزاروی)

O

دنیا کے بت کدوں میں پہلا یہ گھر خدا کا
ہم اِس کے پاسباں ہیں، یہ پاسباں ہمارا

خانہ کعبہ کے تعمیر کنندگان کی ترتیب یوں ہے:

۱۔ ملائکہ ۲۔ حضرت آدم علیہ السلام ۳۔ حضرت شیث علیہ السلام ۴۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ۵۔ قوم عمالقہ ۶۔ قبیلہ جرہم ۷۔ قصی بن کلاب ۸۔ قریش مکہ ۹۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ۱۰۔ حجاج بن یوسف ۱۱۔ سلطان مراد (ترکی)

علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

''قومی زندگی کے لیے مرکز ضروری ہے۔ ملت اسلامیہ کا مرکز بیت اللہ شریف ہے۔ دائروں کے لیے مرکز یوں ہے جیسے بدن میں جان، دائرے کا خط مرکز کا مرہون منت ہے، اسی طرح قوم کا ربط ونظام بھی مرکز سے ہے اور مرکز ہی سے قوم دائمی زندگی پاتی ہے اور ہمارا مرکز بیت اللہ شریف ہے۔ بیت اللہ ہمارا راز بھی ہے اور راز دار بھی۔ اس سے ہماری جان میں سوز بھی ہے اور ساز بھی۔ ہم اس سینے میں سانس کے مانند پرورش پاتے ہیں، ہم بدن ہیں اور وہ ہماری جان شیریں، اس کی شبنم سے ہمارا باغ تازہ رُو ہے، ہماری کھیتی اس کے زمزم سے سیراب ہے، اس کے ذروں سے آفتاب روشنی پاتے ہیں، اسی نے دنیا میں ہمیں بلند آوازہ کر دیا ہے، اس نے ہمارے وجود کو قدم سے پیوست کر دیا ہے، اس کے طواف سے ملت اسلامیہ یک نفس ہے۔''

علامہ محمد اسدؒ کے الفاظ میں:

''کعبہ کے معمار کو معلوم تھا کہ حسین سے حسین عمارت اور بڑے سے بڑا فن تعمیر خدا کے تصور کو ادا نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس نے ایک مثلث الابعاد شکل بنائی جس کو عقل پتھر کا ایک مکعب ٹکڑا تصور کر سکتی ہے۔ مجھے اس سے قبل مختلف اسلامی ممالک میں شاندار مساجد دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا جس میں معماروں اور انجینئروں نے اپنے فن کے کمالات دکھائے تھے۔ یہ سب میں دیکھ چکا تھا لیکن میرا احساس اور شعور اتنا طاقت ور اور اتنا بیدار کبھی نہیں ہوا تھا جتنا کعبہ کو اپنے سامنے دیکھ کر۔ اس لیے کہ اس کے معمار کا ہاتھ دینی مفہوم سے قریب تر تھا۔''

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے الفاظ میں:

''عالم اسلام کے اندر خانہ کعبہ کی مثال وہی ہے جو انسان کے جسم میں دل کی ہے۔ انسان کے جسم میں دل کا مقام یہ ہے کہ وہ رگ رگ سے خون کھینچ کر اپنی طرف لاتا اور پھر اس کو پمپ کر کے ایک صالح شکل میں انسان کے جسم کی رگ رگ میں واپس پہنچاتا ہے۔ جسد ملت کے لیے ایسا ہی عمل خانہ کعبہ کرتا ہے، یہ ہر سال دنیا کے ہر گوشے سے مسلمانوں کو کھینچ لاتا ہے اور پھر ان کو گناہوں کی آلایشوں اور سیرت و کردار کی خامیوں سے پاک کر کے دنیا کے گوشے گوشے میں واپس بھیج دیتا ہے۔ اس دل کی یہ دھڑکن جب تک جاری ہے دنیا کی کوئی طاقت اسلام کو نہیں مٹا سکتی۔ یہ ایک ایسی تحریک ہے جو ہر سال مسلمانوں کو کھینچ بلا کر ایک جگہ جمع کرتی ہے۔ ان کو ایک وقت تک ایک دوسرے سے ملا کر رکھتی ہے۔ ان سے مختلف عبادات انجام دلاتی ہے اور ان عبادات کے دوران میں تمام اسلامی جذبات کو تازہ کر کے ایک متحرک اور فعال اسلامی روح ان کے اندر پھونک کر انہیں واپس بھیجتی ہے جس طرح انسان کے جسم میں دل جب تک دھڑکتا رہتا ہے اس کا جسم زندہ رہتا ہے۔ اسی طرح حج حقیقت میں دنیائے اسلام کے دل کی دھڑکن ہے جو خون کو کھینچ کر لا رہی ہے اور پھر اس کو صالح اور پاکیزہ بنا کر واپس پہنچا رہی ہے۔ یہ عمل جب تک جاری رہے گا اسلام قائم رہے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک۔''

چونکہ خانہ کعبہ روبرو ہے اس لیے درج بالا شعر میں نظر کی رسائی اور نظارے کی رعنائی کے پیش نظر ضمیریں خود بخود تبدیل ہوگئی ہیں۔

یہی کعبہ ہے جس کو میری نگاہیں ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہی ہیں، یہی وہ سیاہ شمع ہے جس کے گرد سفید پروانے والہانہ انداز میں محوطواف ہیں، یہی وہ سنگ در ہے، جس سے لپٹ لپٹ کر رونا اور رو رو کر لپٹنا، آہ وفغاں کی آبرو ہے۔ ؎

اُن کی دہلیز پہ رکھی ہے جبیں رہنے دو
اور کچھ دیر مجھے عرش نشیں رہنے دو

یہ اللہ تعالیٰ کا اولین گھر ہے جس کی تصدیق خود صاحب خانہ نے فرمادی ہے۔ اس سے اہل یہود کا یہ دعویٰ بھی باطل ہو گیا کہ بیت المقدس اولین عبادت گاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کعبے کو اولین عبادت گاہ قرار دیتے ہوئے اسے امن وسکون اور سعادت و برکت کا گہوارہ بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس گھر کا خود محافظ ہے۔ اس کو مٹانے کی ناپاک آرزو لے کر، آنے والے خود غبارِ معصیت بن کر اُڑ گئے۔ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ مست ہاتھیوں پر مشتمل ایک لشکر جرار، ننھے ننھے پرندوں کے ہاتھوں ''کھایا ہوا بھُس'' بن کر رہ گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہماری ایمانی حمیت کو آزمانے کے لیے ہمیں مکلّف ٹھہراتے ہیں کہ ہم اس کے راستے میں اپنی جانیں نچھاور کریں مگر جب دل ایمان و یقین کی حرارت سے خالی ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے دین اور شعائر دین کا خود تحفظ فرما لیا کرتے ہیں۔

گویا ہمیں کعبے کی پاسبانی کی توفیق ملے گی تو یہ ہمارا شرف ٹھہرے گی اور کعبہ ہمارا پاسبان تب بنے گا جب ہم اس عظیم الشان گھر کے عظیم مالک سے کیے گئے وعدوں کا پاس کریں گے کہ یاد کرنے والے ہی یاد رکھے جاتے ہیں۔ وعدوں کی اس پاسبانی سے اس گھر کا مالک بہرنوع ہمارا پاسبان بن جائے گا، یہاں بھی، وہاں بھی کہ وہ یہاں بھی مالک ہے وہاں بھی۔ حق یہ ہے کہ ہم نے دنیا میں آنے کے بعد 'شب تارالست' سے متعلق وعدوں کو بھلا دیا بلکہ دنیا کی رنگینیوں میں خود کو بھول گئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ؎

دنیا میں ہوں، دنیا کا طلبگار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

مگر ہمیں وعدوں کو بھلانے اور یاد کر کر کے توڑنے میں لطف آتا رہا اور اس غفور ورحیم ذات بلند و برتر کو وعدوں کے ایفا کی تلقین میں، چنانچہ یاددہانی کے لیے مرسلین کے ورود کا سلسلہ پیہم جاری رہا اور حضرت محمد ﷺ کی بعثت پر اپنی تکمیل کو پہنچا۔ ہدایت بھی مکمل، ہادی بھی اکمل، اللہ تعالیٰ

نے اپنی محبت کو اس ہادیٔ کامل ﷺ کی اطاعت سے مشروط کر دیا اور اس ہادیٔ کامل ﷺ نے واضح کر دیا کہ نہ کوئی ربوبیت میں شریک ہے نہ کوئی الوہیت میں، کوئی اس کا مقابل نہیں، نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ حقوق میں۔ ضروری ہے کہ دل اس کی یاد سے معمور رہیں۔ حق یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو یہاں یاد کریں گے اللہ تعالیٰ ہمیں ملائکہ کی مجلس میں یاد کریں گے۔ ہم چل کر اس کی طرف آئیں گے اس کی رحمت دوڑ کر ہمیں اپنے انوار کے ہالے میں لے لے گی۔ ؎

دل پژمردہ اک بے نام خوشبو سے مہک اُٹھا
سجایا میں نے لرزیدہ لبوں پر نام جب اُس کا

کعبہ روبرو ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ کیا میں نے وعدوں کی پاسبانی کا حق ادا کیا؟ گریبان میں جھانکتا ہوں تو ندامت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ نگاہ اُٹھاتا ہوں تو اس کا دامانِ کرم، آغوش میں لینے کے لیے بے چین دکھائی دیتا ہے۔ ؎

چھوٹے نہ گنہ مجھ سے، چھوڑا نہ کرم اس نے
بندہ ہو تو ایسا ہو، مولا ہو تو ایسا ہو

نبیٔ پاک ﷺ نے علامات قیامت کے ضمن میں اپنے ایک خطبے میں یہ لرزہ خیز انکشاف فرمایا تھا کہ

''حج تو اس وقت بھی ہوگا لیکن شاہوں کی سیر و تفریح کے طور پر ہوگا۔ مالدار تجارتی مفاد کے لیے حج کریں گے، مسکین سوال کرنے اور گدائی کے لیے حج کو جائیں گے، علماء کا حج اس لیے ہوگا کہ ان کے نام سے پہلے الحاج لکھا جائے گا۔''

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق بخشے کہ ہم روح کی لرزشوں، پلکوں کے ستاروں، جبیں کے سجدوں اور دل کی فریادوں سے اس گھر کو آباد رکھیں۔ اگر ہم نے صرف اپنے ''اونٹوں'' کی حفاظت پر اکتفا کی تو سنت اللہ بہر حال اپنے آپ کو دہرائے گی اور خدا، از خود اس کی حفاظت فرمائے گا ؎

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اللہ کا گھر تو آباد ہے اور رہے گا۔ بصارت ابابیلوں اور بصیرت ملائکہ کو اب بھی محو طواف پاتی ہے۔ یہی وہ عبادت خانہ ہے جس کے عین اوپر، بیت المعمور ہے کہ ستر ہزار فرشتے اس کا طواف کرتے رہتے ہیں جبکہ ملائکہ کا یہ گروہ ہر روز نیا ہوتا ہے۔ یہ گھر جو اس وقت نظروں کے سامنے ہے

آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک کتنے ہی نفوسِ قدسیہ اس کا طواف کر چکے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہو چکے ہیں اور کتنے ہی نیک انسان قیامت تک اس کے روبرو نیاز و ناز کے نذرانے پیش کریں گے اور لمحۂ موجود میں اس کا طواف کرنے والے، تاریخ کے اس عظیم اور غیر مختتم تسلسل کا حصہ ہیں، یہ گنہگار نازاں ہے کہ اُسے بھی اس کاروانِ شوق میں شریک ہونے کا شرف مل گیا ہے۔

حیرت سے جو تم میری طرف دیکھ رہے ہو
لگتا ہے کبھی تم نے سمندر نہیں دیکھا

O

☆

میں اس کو کعبہ و بت خانہ میں کیوں ڈھونڈنے نکلوں
مرے ٹوٹے ہوئے دل ہی کے اندر ہے مقام اس کا

(ظفر علی خاں)

O

حرم میں اذانِ سحر ، اللہ اللہ
کہ ہیں وجد میں بام و در، اللہ اللہ
بہر طوف یہ ملتزم پر دعائیں
یقینِ قبول و اثر، اللہ اللہ
وہ میزابِ رحمت، یہ رکنِ یمانی
مقاماتِ اہلِ خبر، اللہ اللہ
دھڑکتے ہوئے دل کا لے کر سہارا
مناجات باچشم تر، اللہ اللہ
تجلّی میں دھوئے ہوئے سنگ پارے
یہاں کے نجوم و قمر، اللہ اللہ
تصور بھی ہے ایک زندہ حقیقت
تخیُّل بھی ہے معتبر، اللہ اللہ
مقامِ براہیمؑ پر یہ نمازیں
بہر سجدہ، معراجِ سر، اللہ اللہ
جمالِ الٰہی کی تابندگی میں
جھلکتے ہوئے بام و در، اللہ اللہ
وہ کعبہ جسے دیکھ لینا عبادت
مسلسل ہے پیشِ نظر، اللہ اللہ

O

میرے نزدیک یہ ایک مسلسل غزل ہے جسے ماہر القادریؒ نے اپنے سفر نامۂ حجاز میں درج کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اذانِ سحر کی گونجتی صداؤں میں، جب انہوں نے خانہ کعبہ پر نظر ڈالی ہوگی تو یہ اشعار، آمد کی شکل میں، شاعر کے تخیّل کے حاشیوں کو بھی رنگ و نور کی قوس قزح بنا گئے ہوں گے۔ کہیں بھی آورد کا شائبہ نظر نہیں آتا، یوں لگتا ہے کہ یہ اشعار، شاعر کے ذہن میں آئے ہیں، لائے نہیں گئے، جبکہ وہ خود لایا گیا ہے، آیا نہیں۔ ان اشعار میں، تغزل، بدرجۂ اتم موجود ہے۔ تغزل سے مراد غزل نہیں بلکہ تاثیر کی وہ کیفیت ہے، جو تیرِ نیم کش بن کر ذہن اور دل دونوں کو ایک ہی ادا میں رضامند کر جاتی ہے ؎

غزل سوز دروں کی آنچ سے لفظوں میں ڈھلتی ہے
فقط رنگینیٔ حسن بیاں سے کچھ نہیں ہوتا

کعبہ روبرو ہو، سحر کی اذانِ دل آویز فضا میں گونج رہی ہو، تب ان اشعار کو گنگنائیے اور کیف و نشاط کے اس سحر آگیں ماحول میں شاعر کے حسن عاقبت کے لیے دعا کیجیے کہ تب یہ ایک فرض سا بن جاتا ہے اور غائبانہ دعاؤں کو اللہ تعالیٰ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور دوسروں کے لیے دعا کرنے والے کی اپنی حاجات، اللہ تعالیٰ خود ہی پوری فرما دیا کرتے ہیں۔ ''دعا وہ وظیفہ ہے جو بندے کو احساسِ بندگی دلاتا اور رحمت حق کو مہمیز کرتا ہے۔ دعا وہ نقطۂ اتصال ہے جو بندے کی تمنا اور اللہ کی عطا کو ایک جگہ جمع کر دیتا ہے۔ دعا وہ حالت ہے جب بندہ اللہ سے سرگوشی کرتا ہے تو اللہ کی رحمت بڑی دیر تک کان لگائے رہتی ہے۔''

ماہر القادری کے درج بالا اشعار کو بار بار پڑھیے، آنکھوں کو بند کیجیے، کعبے پہنچ جائیے، روشنی ہی روشنی، ہر نقش اُجاگر، کعبے کے نظر افروز اور دل آویز منظر میں، پلکوں پر لرزتے ستاروں کی چمک، التجاؤں کی قبولیت کا یقین، سجدے ہیں کہ معراج سر بنے ہوئے ہیں، رنگ و نور کی کہکشاں ہے کہ روح کو تابندہ اور دل کو رخشندہ کرتی چلی جا رہی ہے، ایسے ہی لمحے، پوری انسانی زندگی کو وقار و اعتبار عطا کر جایا کرتے ہیں۔ ماہر القادری کے اپنے الفاظ میں ''جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو نصیب اسی طرح جاگا کرتے ہیں اور حقیر ذروں کو درخشانی اور ذلیل خار و خس کو رعنائی دی جاتی ہے۔ داتا جب دینے پر آئے تو اُسے کون روک سکتا ہے۔ اس کی جود و عطا ہم دنیا والوں کے قانون اور ضابطہ کی پابند نہیں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اُس شہنشاہ حقیقی کے دربار سے کس کو کیا دیکھ کر نوازا جاتا ہے جو انسان نفس اور روح کی ماہیت کو نہ سمجھ سکا اور خود اپنے جذبات و

احساسات کا تجزیہ نہ کر سکا، وہ اللہ تعالیٰ کے اسرار کی پرچھائیں کو بھی بھلا پا سکتا ہے، بندے کا کام صرف سمع و اطاعت ہے، اسرار و غیوب کے حجابات اُٹھانے کی فکر میں لگے رہنا بندے کا منصب ہی نہیں ہے۔''

ماہر القادری کا نام منظور حسین تھا۔ آبائی وطن کیسر کلاں ضلع بلند شہر (یو۔پی) والد گرامی قدر کا نام محمد معشوق علی ظریف تھا۔ تقسیم ملک کے بعد کراچی میں مقیم ہوئے اور فاران رسالہ نکالا، جسے ماہر کی علمی صلاحیتوں، فکری رفعتوں، شعری عظمتوں اور دینی نزہتوں نے وقعت عطا کی۔ آپ نے زبان و بیان کی خداداد قدرت کو اظہار و بیان ہی کی نہیں، عقیدہ و عقیدت کی صحت کے لیے بھی وقف رکھا۔ آپ جدہ میں ایک مشاعرے میں شریک تھے کہ ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء کو وہیں بلاوا آ گیا۔ آپ کی تدفین جنت المعلّٰی (مکہ مکرمہ) میں حضرت خدیجہؓ کے مرقد کی پائینتی کی طرف ہوئی۔ یوں عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ گیا ؎

موت بن جاتی ہے اُن کی زندگیٔ جاوداں
کچھ تو ایسا کام بھی دنیا میں کر جاتے ہیں لوگ

O

☆

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
(الطاف حسین حالی)

O

ترے جلووں کے آگے، طاقتِ شرحِ بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی، نگاہِ بے زباں رکھ دی

بیت اللہ کی تعمیر میں بظاہر کوئی سی فنی خوبی ورعنائی اور پرکاری دکھائی نہیں دیتی اس کے باوجود اس میں ایک ایسی دلکشی اور نظرافروزی ہے کہ ہر بار دل کو ایک نئی سرخوشی اور نظر کو ایک نئی روشنی ملتی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین ہیکل ،خانہ کعبہ کے بارے میں اپنا تاثر یوں پیش کرتے ہیں:

''اس سے پیشتر میں مصر کی ہزاروں سال پرانی یادگار محرابوں اور مسجدوں کے اندر جاچکا تھا۔ یورپ کے مختلف عجائب گھروں اور معبدوں کی سیر کر چکا تھا اور اُن مکانات کی ہیبت اور رعب وجلال سے بے حد متاثر ہوا تھا۔لیکن جب میں نے خانہ کعبہ میں داخل ہونے کے لیے (یاد رہے کہ انہیں خانہ کعبہ کے اندر جانے کا شرف ملا تھا) سیڑھی پر قدم رکھا تو میرے تاثرات کی کیفیت کچھ اور ہی تھی۔ یہ تاثرات ماضی کے تاثرات سے کہیں گہرے اور قوی تھے۔ یہ قلب وروح کی گہرائیوں سے اُٹھے اور رگ وپے میں سما گئے تھے۔فرط تاثر سے میرے قدم لڑکھڑانے لگے۔ میں سیڑھی پر چڑھ رہا تھا اور میری نگاہیں کعبہ مقدس کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں، میرا دل خشوع وخضوع اور احساسِ عظمت سے پر کیوں نہ ہوتا! مجھے بیت اللہ میں داخل ہونے کی سعادت میسر آ رہی تھی۔''

بیت اللہ کا محل وقوع، الوہی ہدایت کے عین مطابق ہے اور اس کی تعمیر الوہی نگرانی کی مرہون منت ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایک پتھر کو حکم دیا کہ وہ معمارِ کعبہ کے لیے پائیدان کا کام دے۔

خوش نصیب تھا وہ پتھر کہ وہ خلیل اللہ کے پائے مبارک کو مسلسل بوسہ دیتا رہا اور اس نے ان بوسوں کو اپنے سینے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نقش کر لیا اور آج وہ نقوشِ پا بھی مقدس نشانیوں میں سے ہیں اور ان کی سیدھ میں خانہ کعبہ کے روبرو، سجدہ ریزی، لازم قرار پائی ہے ؎

وہاں چاندنی کے قدم ڈولتے ہیں
جہاں تیرے نقش قدم سو رہے ہیں

بیت اللہ کی انتہائی سادہ تعمیر کے حسنِ بے پناہ کو، اظہار و بیان کا کوئی سا اسلوب، فکر و خیال کی کوئی سی ندرت، اور شعر و ادب کا کوئی سا پیرایہ بھی کماحقہٗ بیان نہیں کر سکتا۔ لفظ عاجز اور اظہار گنگ ہو کر رہ جاتا ہے اور انوار و تجلیات کا ایک ہالہ، ناظر کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور وہ خود کو نور و سرور کی ایک پر کیف دنیا میں مبہوت و مسحور پاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ حسن، ہوتا ہی سادگی میں ہے، حسن، زیب و زینت اور بناؤ سنگھار سے بے نیاز ہوا کرتا ہے کہ تصنع نظر فریب تو ہو سکتا ہے، دل نواز نہیں۔ خانہ کعبہ کے حسن میں جو سادگی ہے اور اُس سادگی میں جو حسن ہے، اس کا کیف نگاہ و دل کو تو رنگ و نور کی قوس قزح بنا جاتا ہے مگر کوئی سی زبان اور کوئی سی تحریر بھی اس حسن کی ہلکی سی جھلک بھی نہیں دکھا سکتی۔ یہی وہ منظر ہے جس کی دلکشی کا بیان کسی کے بس میں نہیں۔ یہاں معجز بیان، عاجز ہیں ؎

جب دمکتے حسن کے جلووں پہ پڑتی ہے نظر
ایک دل میں جذب ہو جاتے ہیں کتنے آفتاب

یہی وجہ ہے کہ اسے محض دیکھتے رہنا بھی عبادت قرار پایا ہے اور یہ نگہی عبادت نیاز و ناز کی وہ پھوار ہے جس سے دیکھنے والے کا رواں رواں سرشار ہو جاتا ہے اور یہ سرشاری اُسے عمر بھر مسحورِ لذت رکھتی ہے ؎

دیکھنے والے تجلی کم نہیں ہے کم نہ دیکھ

کاش! دیکھنے والی نظر، زبان رکھتی اور زبان صلاحیتِ دید کی حامل ہوتی۔ افسوس!

کہ نگاہ، بے زبان ہے اور زبان بے نگاہ ؎

آخر زمانہ آئینہ دکھلا کے رہ گیا
لانا پڑا تمہی کو تمہاری مثال میں

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کے طواف اور حج وعمرہ کے لیے اذن عام دیا، تب سے اب تک لوگ فوج درفوج چلے ہی آ رہے ہیں۔ طواف ہے کہ رکتا ہی نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کی تعمیل کا یہ منظر، حق وصداقت کی ایک روشن دلیل ہے۔ یہ مرجعِ خلائق بھی ہے اور جائے امن بھی۔ اس کا گردوپیش بھی محترم ہے۔ حرم کی حرمت، صدیوں سے ہے، حرم تب بھی حرم تھا جب پورا عرب خونریزی اور فساد کی زد میں تھا۔ اس کے فیض سے دلوں کے غنچے بھی پھول بنتے ہیں اور کام ودہن کو پھلوں کا رزق بھی ملتا ہے۔ ان پھلوں کی تازگی اور بالیدگی خزاں ناآشنا ہے اور ان پھلوں کی فراوانی حیرت افزاء ؎

اے آنکھ حسن کعبہ کو تو بار بار دیکھ
کیا شان کیا جلال ہے یہ نور بار دیکھ
کیا کیا مطالبے تھے دل وچشم وروح کے
تینوں کو ایک وقت میں تو کامگار دیکھ
یہ سرزمیں کہ کشت سے خالی ہے، اس جگہ
نخلِ مراد دل بہ ہمہ برگ و بار دیکھ
یہ برکت دعائے خلیل اللہ ہے
ثمرات نشاتین یہاں بے شمار دیکھ
ہر ذرہ اس کی خاک کا خورشید در بغل
ہر قطرہ اس کی چاہ کا یم درکنار دیکھ

O

☆

بیت اللہ کی مرکزیت اور جاذبیت اعلانِ ربانی کی ایک ابدآثار صداقت ہے۔

O

نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

سند ذہن میں نہیں مگر کہتے ہیں کہ اللہ کا گھر روبرو آتے ہی لازم ہے کہ تلبیہ رک جائے اور نگاہ حسن آستاں پر ٹک جائے، تب نگاہ جو آرزو کرے گی اُسے شرفِ قبول ملے گا کہ داستانِ دل کو نگاہوں کی زبان ہی بیان کرسکتی ہے.....زبان کو اگر یارائے بیان مل جائے تو زہے نصیب ؎

نہیں ہے قید حرف وصوت کی اس آستانے پر
مری حیراں نگاہی میں بھی اک طرزِ بیاں نکلا

یہ رب العالمین کا گھر ہے، یہاں یاس، آس کے دامن میں مسکراتی ہے۔ یہاں رحمتوں کے در کھلے ہیں اور یہاں ہر ایک باریاب ہے ؎

مرے جذبوں کو ساری وسعتیں تو نے عطا کی ہیں
مرے احساس کے شام وسحر تیرے عطا کردہ
یہ لفظوں کے گہر، یہ آرزوؤں کے حسیں خاکے
دعاؤں میں جو آتے ہیں نظر، تیرے عطا کردہ

کوئی یہاں تک، ایک قدم آئے تو رحمت، دس قدم بڑھ کر اُسے آغوش میں لے لیتی ہے، پھر یہاں کیا نہیں ہے؟ ہر سامانِ ناز موجود ہے، رکن یمانی ہے، حجرِ اسود ہے اور وصید در کے درمیان ملتزم ہے۔ گویا مصافحہ بھی ہے۔ تقبیل بھی معانقہ بھی.....اور یوں محبّ، فخر وناز میں ڈوب کر، خود کو زمین پر نہیں، آسمان پر محسوس کرتا ہے۔

جمال میں جلال اور جلال میں جمال لیے یہ وہ واحد مرکز ہے جس کے گرد حضوری کا کیف وسرور، والہانہ انداز میں گھومتا اور جھومتا چلا جاتا ہے۔ جذب وجنوں اور عشق ومستی کا یہ بانکپن، اس بھری کائنات میں صرف اور صرف اسی گھر کا حصہ ہے۔ اسی ایک نظر اور اسی ایک کیف کے حصول کے لیے چاہنے والے، قرب و جوار اور دور دراز سے چلے ہی آ رہے ہیں۔ اس گھر کا طواف کرتے کرتے اُن کے تلوے پھٹ جاتے ہیں، آبلے پڑ جاتے ہیں مگر دل کی پیاس ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو پاک وصاف رکھنے کا حکم دیا تھا اور اس لق ودق صحرا میں اعلان حج کرایا تھا اور یہ اعلان اُن سب کو سنوا بھی دیا گیا تھا اور اُن سب تک پہنچا بھی دیا گیا تھا جنہوں نے پا پیادہ بھی اور سوار بھی، قرب و جوار سے بھی اور دور دراز سے بھی، بہر حال یہاں پہنچنا تھا اور اپنے نصیب پر ناز کرنا تھا کہ

یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوقِ سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں ، اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے

مجھ ایسے عمر رسیدہ، شکستہ ودر ماندہ، ذرا دور بیٹھے طواف وسجود اور نیاز ونازکی اس وارفتگی کو بس تکتے ہی چلے جاتے ہیں کہ یہاں نظارہ خود نگاہوں سے لپٹ لپٹ جاتا ہے جنبش نگاہ بار ہو کر رہ جاتی ہے اور ایک ایسی آنکھ کی آرزو رہ رہ کر اُبھرتی ہے جو جھپکنا نہ جانتی ہو، بس دیکھتی دیکھتی اور دیکھتی ہی چلی جائے اور دیکھتے، دیکھتے دل کی آنکھ کھل جائے ۔

صرف پتلی کی روشنی کیا ہے
آنکھ اگر صاحب نظر نہ ہوئی

حضرت شیخ شرف الحق والدین احمد یحییٰ منیریؒ اپنے ایک مکتوب میں ''اسی دیدۂ بیدار'' کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

''حج کے متعلق گروہ صوفیہ کا حال کچھ نہ پوچھو، اس میں بڑے بڑے اسرار اور عجیب عجیب معاملات ہیں۔ درحقیقت زیارت کعبہ معظّمہ، زیارت خداوند جل وعلا ہے یعنی مکان کی زیارت سے، مکین کی زیارت حاصل ہوتی ہے۔ اس عزت وتوقیر کا منشا اس کا کرم عمیم ہے۔ حق تو یہ ہے کہ طالبان صادق کا مقصودِ حج خانہ سے خداوند خانہ ہے۔ خانہ صرف درمیان میں بہانہ ہے۔''

O

سر سینکڑوں، جہاں میں سروں کی کمی نہیں
اس آستاں کی خیر ہو، یہ آستاں رہے

مکان، مکین کی نسبت سے عزیز و محترم ہوا کرتا ہے، محبت کی نظر کسی راستے کے آثار، شجر، حجر یہاں تک کہ مٹی کے ذروں کو بھی عقیدت وارادت سے اس لیے چوما کرتی ہے کہ وہ راستہ محبوب کی رہگزر رہ چکا ہوتا ہے ؎

لوگ کہتے ہیں اُسے تاریخ انسانی کے موڑ
راستے جب جھوم اُٹھتے ہیں تری رفتار سے

خانہ کعبہ اور مسجد نبوی ﷺ، پتھر اور اینٹ ہی سے بنی ہوئی عبادت گاہیں ہیں مگر ایک دنیا ان کی طرف یوں کھنچی چلی آ رہی ہے جیسے لوہے کے ذرے، مقناطیس سے چمٹنے اور لپٹنے کے لیے بیقرار ہوتے ہیں اور چمٹ کر، لپٹ کر، اُن کے دل کی ساری بیقراریاں، سکون وطمانیت کا مظہر ہو جاتی ہیں۔

مکان بہر کیف اس لیے محبوب ہوتا ہے کہ وہ محبوب کا مکان ہوتا ہے، خانہ کعبہ اور مسجد نبوی ﷺ ہماری محبتوں کا اسی لیے مرکز ہیں کہ اُن کا تعلق اسی ذات گرامی قدر ﷺ سے ہے۔ جو مسکرائے تو چمنستان کونین کے پھولوں نے ہنسنا سیکھا، جو اُٹھے تو پہاڑوں نے سر بلندی پائی جو بیٹھے تو فرش، عرش بن گیا۔ جن کے حسن پر خود حسن آفرین نازاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ تفہیم مطالب کے لیے اُس شہر اور ان راستوں کی قسم کھاتا ہے، جہاں محبوب رہتا اور جہاں محبوب چلتا پھرتا ہے۔ ورنہ مکانوں میں کیا رکھا ہے اور راستوں میں کیا حسن ہے.....اور حضرت عمرؓ نے حجر اسود کو چومنے سے پہلے یہ کہہ کر، محبت کے اس انداز کو سند عطا کر دی کہ ''تو محض پتھر ہے، تجھے اس

لیے چوم رہا ہوں کہ میرے محبوب ومحترم ﷺ کے مبارک لب تجھ کو مس کر چکے ہیں۔''

غزل کی حسین دنیا میں، سنگِ آستانِ محبوب، بوسہ گاہ بھی ہے اور سجدہ گاہ بھی، صرف اسی لیے کہ وہ سنگ در، محبوب کے قدموں کو چوم چکا ہے اور غزل وہ حقیقت ہے جو حسن میں بستی ہے۔ یہ واردات کی سہیلی اور جذبات کی ہمجولی ہے۔ یہ ذکر محبوب ہی سے سنورتی اور نکھرتی ہے۔ ایک نظر ڈالیے کہ غزل کے ہاں آستاں اور سنگ آستاں کی حیثیت واہمیت کیا ہے۔ نہیں معلوم صاحبان جبّہ ودستار، غزل کے نام کیوں بدکتے ہیں اور غزل کے اشعار کی آفاقی قدروں کو کیوں نہیں دیکھتے اور کیوں نہیں سمجھتے کہ غزل کا ہر شعر مضمون کے اعتبار سے ایک وحدت ہے، ایک قطرہ ہے جس میں سمندر کی گہرائی اور پہنائی سمٹی ہوئی ہے۔ یہ قاری کے دل کی نظافت ہے جو بات کو لطیف اور اس کے دل کی خباثت ہے جو بات کو کثیف بنا دیتی ہے۔ حق یہ ہے کہ نظر کا انداز، منظر بدل دیا کرتا ہے۔ بات آستاں اور سنگ آستاں کی ہو رہی تھی، ذرا دیکھیے تو غزل کس طرح رنگ میں آہنگ پیدا کر کے، دل کی ہر دھڑکن، نگاہوں کی ہر آرزو اور روح کی ہر لرزش کا ساتھ دے رہی ہے کہ وہ ''انسانی فطرت کی خلقی افتاد کا ابدی اظہار ہے''۔

جھک گیا جو ترے آستاں پہ سر
پھر کسی آستاں پہ خم نہ ہوا

وہ جبیں نے نذر سنگ آستانہ کر دیئے
چُن کے رکھے تھے جو سجدے آستانے کے لیے

سر ہے سجدے میں، یہ دعویٰ ہے جبینِ شوق کا
آستاں میرے لیے، میں آستانے کے لیے

ترا آستاں جو نہ مل سکا، تری رہگزر پہ جبیں سہی
ہمیں سجدہ کرنے سے کام ہے، جو وہاں نہیں تو یہیں سہی

ترے قدموں پہ سر ہے، سامنے تو ہے تصور میں
مرا نقشِ جبیں پھر بار سنگ آستاں کیوں ہو

جوشِ سجدہ میں سر کہیں میرا
آپ کا سنگ در نہ ہو جائے

مدت ہوئی رسائی قسمت کو رو چکے
وہ سنگ در کہاں، یہ ہماری جبیں کہاں

تمہارے سنگ در کو سنگ در اب کس طرح کہہ دوں
کہ جب سجدہ کیا، سر کو، جبینِ عرش پر دیکھا

تیز ہے رفتار دل کی، سست رفتار قدم
اب یقیناً منزل جاناں بہت نزدیک ہے

آج آیا اُن کے در پہ جبیں سائیوں کے کام
کل تک جو جسم زار پہ سر، بار دوش تھا

۱۹۹۸ء میں اللہ تعالیٰ نے حج کی توفیق عطا فرمائی۔ صبح منیٰ کی جانب روانگی تھی، جملہ حجاج کرام مکہ معظّمہ میں جمع تھے۔ نماز ظہر کا وقت ہوا۔ میں جانماز لے کر، اپنی قیام گاہ سے قدرے تاخیر سے نکلا، حرم کعبہ میں جانا ممکن نہ تھا۔ پورا مکہ حرم بنا ہوا تھا، ان ایام میں مکہ ہی نہیں پوری دنیا حرم بن جاتی ہے۔ ''لبیک لبیک'' کی صدائیں سن کر شجر حجر تک زبان حال سے یہی صدا لگا رہے ہوتے ہیں اور یہ پکار متصلاً بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یوں پوری کائنات اس کے احاطے میں آ جاتی ہے۔ میں نے نماز کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈی کہ وہاں جانماز بچھا لوں۔ سڑک پر ایک جگہ نظر آئی، ایک صاحب جانماز بچھائے بیٹھے تھے میں نے اُن کے ساتھ اپنا جانماز بچھا لیا۔ تب حرم کے چاروں طرف جہاں جہاں تک نظر جاتی تھی سر ہی سر دکھائی دے رہے تھے۔ میرے ساتھی نے (وہ وضع قطع سے پاکستانی لگتے تھے) گرد و پیش دور دور تک ایک نظر ڈالی، جب انہیں انسانی سروں کا ایک وسیع و عریض سمندر نظر آیا تو بے ساختہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ ''دیکھیں! مرکز میں کتنی کشش ہے کہ جدھر نظر جاتی ہے سروں کی ایک دنیا آباد دکھائی دیتی ہے۔'' یہ سن کر میرے منہ سے بے ساختہ یہ شعر نکلا ؎

سر سینکڑوں جہاں میں سروں کی کمی نہیں
اس آستاں کی خیر ہو، یہ آستاں رہے

غزل کا یہ شعر سن کر وہ بے چین ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک دریا بہہ نکلا، وہ یہ شعر دہرا بھی رہے تھے اور رو بھی رہے تھے۔ جب کچھ دیر کے بعد ان کی کیفیت سکوں آشنا ہوئی تو میں نے ان کا نام پوچھا۔ وہ تھے کیپٹن ڈاکٹر مختار علی، میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال سیالکوٹ۔ پاکستان آنے کے بعد میں نے انہیں ایک خط لکھا تھا ان کا جواب بھی آیا بڑی خوبصورت تحریر تھی۔ بعد میں جب بھی اللہ پاک نے اپنے گھر بلایا تو یہ شعر اکثر یاد آیا۔

جب بھی خانہ کعبہ نگاہوں کے سامنے ہوتا اور انسانوں کا بحرِ زخار اس پر نثار ہو رہا ہوتا تو یہ شعر ایک عجیب کیف عطا کرتا۔ اللہ تعالیٰ مرکز کی اس کشش کو دوام بخشے۔ اپنے اس آستاں کو قیام عطا فرمائے۔ اسے ہنود و یہود کے شر انگیز ارادوں سے محفوظ رکھے کہ وہی اس کا محافظ ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ امن و برکت والے اس گھر کو قائم و دائم رہنا چاہیے۔ انسانی سر تو آنی جانی شے ہیں، اُن کی حیثیت ہی کیا ہے؟ آستانِ محبوب کے حسن و جمال اور عظمت و رفعت کے سامنے تو اہل صدق و صفا ازل سے اپنی جانیں قربان کرتے رہے ہیں کہ ؎

سر بیچ کر متاعِ دل و جاں خریدنا
سودا ہے وہ کہ جس میں خسارہ کوئی نہیں

O

سروری زیبا فقط اِس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک یہی، باقی بتانِ آزری

میں نے اللہ تعالیٰ کے اس قدیم و عظیم گھر کے روبرو، جب اس شعر کو پڑھا تو لفظ اُس کو اِس سے بدلا اور دوسرے مصرع کے لفظ وہی کو یہی کر دیا۔ اس احساس کے ساتھ کہ حقیقی مالک اللہ ہیں، حقیقی حاکم وہی ہیں، کارکشا بھی، کارساز بھی، ہر چیز ان کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہی واحد و یکتا ہیں اور وہی حی و قیوم.....اس ذات بلند و برتر نے، اپنی ہر تخلیق کو جو کام سونپا ہے، وہ وہی کام اُسی اسلوب کے ساتھ کر رہی ہے۔ جو حکم دیا گیا اس سے سرمو انحراف نہیں ہو رہا۔ سورج طلوع و غروب کے ضابطے اسی حکم کے مطابق انجام دے رہا ہے۔ ہوا اسی طرح رواں دواں ہے جس طرح اُسے حکم دیا گیا، درخت ویسے ہی پھل، پھول اور پھیل رہے ہیں جیسے انہیں ارشاد کیا گیا، سمندر اور دریا ویسے ہی بہہ رہے ہیں جیسے انہیں سمجھایا گیا، آگ ویسے ہی جل رہی ہے جیسے اُسے خصوصیت بخشی گئی۔ الغرض کائنات کی کسی چیز پر غور کر لو، وہ ضابطۂ الٰہی سے نہ ہٹ رہی ہے نہ ہٹ سکتی ہے۔ دوسری طرف یہ اشرف المخلوقات، ؎

یہی انساں ہے سلطاں بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں، نے خدا بیں، نے جہاں بیں
یہی شہکار ہے تیرے ہُنر کا

یہ الوہی ہنر کا شاہکار، اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ اختیارات سے غلط فائدہ اُٹھا رہا ہے،

نہ اپنے خالق کو مان رہا ہے نہ اپنے مالک کو، نہ رازق کو نہ معطی کو، غرور و تکبر میں یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ خود، خدا بن بیٹھا ہے ۔

خودی کا نشہ چڑھا، آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ، مگر بنا نہ گیا

گو ایسے فرعون صفت انسانوں کو اسی دنیا میں اپنا انجام نظر آ جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جو فرعون، خدائی کا دعویدار تھا، وہ سمندر میں غرق ہوا، قرآن پاک نے اُس 'خود ساز خدا' کو چیلنج کیا کہ ''تیری لاش، نشان عبرت کے طور پر محفوظ رہے گی۔'' تب اس کی لاش کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ بہت بعد میں اس کی لاش ملی کہ اس پر سمندری نمک جما ہوا تھا۔ وہ قاہرہ کے میوزیم میں آج بھی پڑی ہوئی ہے۔ جب کبھی وہ علیل ہوتی ہے اس کی ہڈیوں کو پھپھوندی لگ جاتی ہے تو اُسے علاج کے لیے دنیا کے بہترین شفا خانوں میں لے جایا جاتا ہے کہ اُسے عبرت کا نشان بن کر محفوظ رہنا ہے کہ یہی ہے وہ ڈھانچا، جو خود کو خدا کہتا تھا۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' کا ایک بند ہے:

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا — شدّاد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا — یہ بات ہے سمجھنے کی، آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

قرآن میں ہے کہ قیامت کے دن جب سبھی فرعون، صفیں باندھے خائب و خاسر انداز میں حاضر ہوں گے۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کہو ''آج کس کی بادشاہی ہے'' حدیث پاک کے مطابق ''اللہ تعالیٰ زمین کو اپنی مٹھی میں اور آسمان کو اپنے دائیں ہاتھ میں لپیٹ کر کہے گا'' میں بادشاہ ہوں، زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟'' تب کوئی نہ بولے گا تو خود ہی اللہ تعالیٰ جواب دے گا کہ ''فقط اللہ واحد و قہار کی'' بعض کے مطابق اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک فرشتہ منادی کرے گا جس کے ساتھ ہی تمام کافر اور مسلمان بیک آواز یہی جواب دیں گے..... کسی نوعیت کا ذرا سا اختیار بھی مل جائے تو اس انسان کو خدا بنتے ہوئے دیر نہیں لگتی ۔

رہا ہے مبتلا انسان سودائے خدائی میں
اُسے اپنے خدا کی بندگی اچھی نہیں لگتی

حق یہی ہے کہ الوہیت، ربوبیت، حاکمیت، ملوکیت اور مالکیت، اللہ تعالیٰ ہی کے لیے

وقف ہے اور اُسی جلال و اکرام والے کو زیبا ہے کہ اس کی یکتائی پر خود اسی کی ذات شہادت کے لیے کافی ہے اور جو لوگ بزعم خود، خدا بنے ہوئے ہیں ان کی حیثیت بتانِ آزری سے زیادہ نہیں ہے۔ جنہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بت شکن ہاتھوں نے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ اس لیے لازم ہے کہ ہر دل کی پکار کا مخاطب وہی ہو۔ ہاتھ اسی کے حضور میں پھیلیں اور سر اسی کے سامنے جھکے کہ اسی کا لطف و کرم، زندگی کے ہر مرحلے میں شریک حال ہو کر، خواب کو تعبیر، سوچ کو تکمیل، تعمیر کو تزئین، نشو کو بلوغ، یاس کو اُمید، ظلمت کو نور اور کفر کو ایمان تک لے جاتا ہے ؎

دل پژمردہ اک بے نام خوشبو سے مہک اُٹھا
سجایا میں نے لرزیدہ لبوں پر نام جب اس کا

O

☆

جو اسمِ ذات ہویدا ہوا سرِ قرطاس
ہوا خیال منوّر، مہک گیا احساس
(حفیظ تائب)

O

اس سنگِ آستاں پہ جبینِ نیاز ہے
واللہ! کیا نماز ہماری نماز ہے
وہ خاکِ آستاں ہے تری خاکِ آستاں
جس پر جبینِ شوق کے سجدوں کو ناز ہے
کس کی طرف کو دستِ تمنا دراز ہو
عالم میں کوئی آپ سا بندہ نواز ہے
زاہد کو اپنے زہد و عبادت پہ ہے غرور
مجھ کو ترے کرم، تری رحمت پہ ناز ہے

حرم کعبہ کی اُجلی اُجلی اور دُھلی دُھلی فضا میں، درج بالا چار شعر بار بار زبان پر آئے اور خوش نصیب ہوں کہ عمر بھر جس عظیم گھر کی جانب منہ کر کے غائبانہ نماز ادا کرتا رہا آج وہ گھر نگاہوں کو طراوت عطا کر رہا ہے اور میری جبین نیاز، جس میں بقول اقبال، ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں اس آستان ناز پر ہے جس سے بڑا آستاں کوئی اور نہیں کہ یہ اس کا آستاں ہے جو بہر اعتبار عظیم و جلیل اور بہر نوع بزرگ و برتر ہے۔ جبیں کو جو فخر یہاں جھکنے میں نصیب ہوتا ہے اس کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے لفظوں میں نہیں ڈھالا جا سکتا کہ ؎

کسی کا آستاں اونچا ہے اتنا
کہ سر جھک کر بھی اونچا ہی رہے گا

اور یہ فخر، اپنا نہیں ہے، بلانے والے کی عطا ہے کہ اس نے سر کو سجدے کے لیے اپنے گھر کی دہلیز عطا کی ہے اور اس آستاں کی خاک، وہ خاک ہے جس پر جبینِ شوق عمر بھر نازاں رہ سکتی ہے اور میرے لیے تو یہی ناز فکری بالیدگی اور روحانی شادابی کا باعث ہے ؎

تصور عرش پر ہے، وقفِ سجدہ ہے جبیں میری
مرا اب پوچھنا کیا، آسماں میرا، زمیں میری

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ مجھ سے میرا فضل مانگو، اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہو تو سر کے ساتھ ساتھ دل بھی جھکا رہتا ہے۔ یہ فضل نصیب نہ ہو تو رگوں میں لہو بن کر گردش کرنے والا، شیطان قیام وقعود اور رکوع وسجود میں لفظ لفظ گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہماری عبادت کو بارور کر دے اور مسلمانوں کی طرح عبادت کرنے والوں کے اعمال کو بھی مشرف بہ اسلام کر دے۔ ورنہ صورتحال تو یہ ہے کہ ؎

شیطاں پہ بھروسا ہے، سہارا ہے خدا بھی
شرمندہ ہے سجدہ بھی مرا، حرفِ دعا بھی

اللہ تعالیٰ ہی کی بارگاہ، بندوں کو نوازنے والی، دردمندوں کی پکار سننے والی اور تشکیک کے صحراؤں میں بھٹکنے والے قدموں کو منزل کا سکون عطا کرنے والی ہے۔ ہم لوگ اسی کی عبادت کرتے ہیں، اسی سے اعانت کے طلبگار رہیں، حق یہ ہے کہ وہ شخص جو اس آستاں پر جھک گیا، وہی فی الواقع سرکشیدہ رہتا ہے، ہر فرعون کے دربار میں۔ وہ ہاتھ جو یہاں پھیل گئے وہی بے نیاز ہیں، ہر دروازے سے، وہ دل جن میں اس حیّ وقیوم کا خوف سما گیا۔ وہی بے خوف ہیں، ہر خوف سے ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

بڑائی اور کبریائی اسی گھر والے کے لیے ہے اور میرا انکسار اسی گھر کے فیض سے افتخار کا اعتبار ہے۔ اسی خاکِ آستاں کو اپنی جبیں کا غازہ بنا لینا ہی میرا سرمایۂ حیات ہے اور یہاں جھکنا ہی سر بلندی کی واحد دلیل ہے۔ بے ثمر شاخ اکڑی جبکہ میوہ دار جھکی ہوتی ہے، ہر سوار جب منزل نصیب ہوتا ہے تو گھوڑے سے اُتر آتا ہے، مٹی میں رُلنے اور رونے والے بچے کو ماں گود میں اُٹھا لیتی ہے، فقیر، خاک نشین ہوتا ہے مگر ہر آنے والا اُسے جھک کر سلام کرتا ہے۔ تاجوری پر غرور کرنے والا سر، تخت نشین ہوتا ہے اور اُسے دیکھنے کے لیے سر اُٹھانا پڑتا ہے۔ ہمیں ناز ہے کہ ہم اپنا سر نیاز،

زمین پر رکھتے ہیں اور ہماری فریادوں کا جواب عرش سے آتا ہے ؎

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر، اُٹھتے ہیں حجاب آخر

O

☆

اُسی اک حُسن کا جلوہ زمیں سے آسماں تک ہے
اُسی اک ذات کو پایا، نظر اپنی جہاں تک ہے

(حمید عظیم آبادی)

O

پہنچتا ہے ہر اک مے کش کے آگے دورِ جام اس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لطفِ عام اس کا
گواہی دے رہی ہے اس کی یکتائی پہ ذات اس کی
دوئی کے نقش سب جھوٹے ہیں سچا ایک نام اس کا

قرآن مجید میں ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے عالم پیری میں اولاد کے لیے چپکے چپکے دعا کی تھی کہ ''اے پروردگار! میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں اور بڑھاپے کی وجہ سے سر پر سفیدی شعلے مارنے کے لیے لپک رہی ہے اور وَلَمْ اَکُنْ بِدُعَآئِکَ رَبِّ شَقِیًّا.

کہ میں کبھی بھی تجھ سے دعا کر کے محروم نہیں رہا اور ربِ کائنات، کب محروم رکھنے والے تھے۔ انہوں نے ظاہری اسباب کے فقدان کے باوصف بیٹا عطا کیا اور اس کا نام بھی تجویز فرما دیا۔ سچ یہ ہے کہ ساقیٔ ازل کا یہی وہ میکدہ ہے جہاں کوئی بھی محروم نہیں رہتا۔ اس ساقی کا دورِ جام سب کے لیے ہے، کسی کو تشنہ لبی کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ عالمین کا رب ہے۔ یہ الگ بات کہ

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

یا دوسرے لفظوں میں سورج تو سب پر چمک رہا ہے مگر ذرے اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسبِ نور کرتے ہیں۔ بعض لوگ محبوب کا گھر دیکھ کر اور اس کا طواف کر کے شاد کام ہوتے اور شاد کام لوٹتے ہیں۔ بعض خانہ کے ساتھ ساتھ صاحب خانہ کی ایک جھلک دیکھنے کے آرزومند رہتے ہیں۔ بعض کے دلوں کو دینے والا خود وسعت عطا کرتا اور ہمت بخشتا ہے کہ وہ انوار سمیٹتے چلے جاتے ہیں کہ ؎

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

دل ہی اللہ کا گھر ہے، وہ دل جو ''مہماں سرائے کثرت موہوم'' ہو کر رہ جائے اس پر اللہ کے جلوے تجلّی ریز نہیں ہوتے کہ دلِ خالی ہی اس کا خاص خلوت خانہ ہے۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا، اب تو خلوت ہو گئی

انسانی جسم میں دل ہی وہ عضو ہے کہ سنورتا ہے تو زندگی نکھر جاتی ہے، بگڑتا ہے تو روز و شب پر اندھیرے چھا جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی نے اسے دھڑکنا سکھایا ہے۔ یہ تب بھی بیدار رہتا ہے جب انسان سو رہا ہوتا ہے۔ اس دل کی زندگی کو پایندگی اس وقت ملتی ہے جب یہ محبوبِ حقیقی کی یاد میں دھڑکتا ہے...... اور اللہ والوں کے دل کی اس دھڑکن کو قبر کی گہرائی بھی خاموش نہیں کر سکتی۔ دلوں کی اپنی اپنی دھڑکنیں ہیں، نگاہوں کے اپنے اپنے زاویئے ہیں، پلکوں کے اپنے اپنے ستارے ہیں، فکر کی اپنی اپنی اڑانیں ہیں، طلب کے اپنے اپنے انداز ہیں، چاہت کے اپنے اپنے اسلوب ہیں...... کہنے والے تو یہ بھی کہہ گئے کہ ؎

وہ طور تھا جو برقِ تجلّی سے جل گیا
میری فضائے دل پہ وہ بجلی گرا کے دیکھ

حالانکہ طور کو ریزہ ریزہ کرنے والا جلوہ تو ستر ہزار پردوں میں سے چھن چھن کر آیا تھا گویا ؎

برق کیا طور پر گری ہو گی
اُن کا آنچل ڈھلک گیا ہو گا

بہر کیف یہاں اللہ تعالیٰ کے جلوے فراواں ہیں، ہر ایک کے لیے ہیں، کوئی محروم تجلّی نہیں رہتا، ہر ایک اپنے اپنے ظرف کے مطابق سرشار بھی ہے اور مطمئن بھی اور ہر سوچ یہی ہے کہ جو ملا، اپنی حیثیت سے بڑھ کر ملا ؎

چمکا قسمت کا ستارہ، میں تو اس قابل نہ تھا
میں کہاں اور در تمہارا، میں تو اس قابل نہ تھا

جنگ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے سبھی گروہوں کو، اپنی تائید خاص سے تتر بتر کر دیا، اس موقع پر نبیٔ پاک ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور کارفرمائی کا یوں اعتراف فرمایا'' لَا اِلٰـــہَ اِلَّا اللّٰـہُ وَحْـدَہ صَـدَقَ وَعْدَہٗ، وَ نَصَرَ عَبْدَہٗ وَ اَعَزَّ جُنْدَہٗ وَ ھَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہ، فَلَا

شَيءَ بَعْدَهٗ . ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی، اپنے لشکر کو سرخرو کیا اور تمام گروہوں کو اکیلے اسی نے شکست دی، اس کے بعد کوئی شے نہیں۔ محمد علی جوہر کہتے ہیں ؎

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

درج بالا دو شعر مولانا ظفر علی خاں کے ہیں۔ دوسرا شعر اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات واحد ہے اور اس کی یکتائی ایک حقیقت

حقیقت ایک وہ، باقی فسانہ

وہی مالک ہے، وہی رب ہے، وہی رازق ہے، وہی کارساز ہے اور وہی کارکشا، سب کچھ وہی ہے اور سب کچھ اسی کے پاس ہے۔ نہ کوئی اس کا مماثل ہے، نہ مقابل۔ دوئی کے جتنے بھی نقوش ہیں وہ سب باطل ہیں اور باطل بے وجود ہوتا ہے۔ حق کے مقابل اس کا ٹھہرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ حق ہے اور حق دلوں میں اُتر جائے تو باطل کی تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے سورج کی اولین کرن، شب کے اندھیروں کو دم بھر میں نگل جاتی ہے۔ اس واحد و یکتا کے مقابل تو وہ آئے جو مشرق سے طلوع ہونے والے آفتاب کو مغرب سے اُبھار سکنے کے قابل ہو ؎

وہیں سے فکر پر کھلتی ہیں راہیں تیرے عرفاں کی
خرد جس موڑ پر خود کو غبارِ کارواں کر دے

O

کیا ہے خلق مجھے باوجودِ علمِ گناہ
یہ ابتدا ہے کرم کی، تو انتہا کیا ہے

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہرحال رحیم وکریم ہے، بندہ بھٹکتا بھی ہے اور بہکتا بھی، پھسلتا بھی ہے اور گرتا بھی، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت اُسے ہر حال میں تھامتی ہے ؎

مری افتادگی بھی میرے حق میں اس کی رحمت تھی
کہ گرتے گرتے بھی میں نے لیا دامن ہے تھام اس کا

مغفرت آرزومند رہتی ہے کہ بندہ اپنے کیے پر نادم ہو جائے کہ انسانی ندامت ہی الوہی رحمت کو آواز دیتی اور اُسے عرش سے فرش پر لے آتی ہے۔ تخلیق آدم علیہ السلام کے وقت ملائکہ نے انسانی لغزشوں ہی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے سامنے سربسجود رہے مگر ابلیس نے انکار کیا اور بندے کو صراطِ مستقیم سے بھٹکانے کی مہلت مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے مہلت بھی دی اور بندوں کو گمراہ کرنے کی اجازت بھی۔ ساتھ ہی اعلان بھی کیا کہ میں گم کردہ راہ انسانوں کو راستہ بھی دکھاؤں گا اور منزل بھی۔ انہیں معاف بھی کروں گا اور اُخروی نعمتوں سے بھی نوازوں گا، اللہ تعالیٰ بخوبی جانتے تھے کہ خطا، لازمۂ بشریت ہے جبکہ فرشتہ غلطی نہیں کرتا کیونکہ وہ صرف تعمیلِ ارشادِ خداوندی پر مامور ہے، اللہ تعالیٰ نے اس خطا کار انسان کو علم کی رفعتوں اور محبت کی عظمتوں سے نوازا اور فرشتوں کو اس کے حضور میں جھکا دیا ؎

فرشتہ مجھ کو کہنے سے مری تحقیر ہوتی ہے
میں مسجودِ ملائک ہوں مجھے انسان رہنے دے

اور احمد ندیم قاسمی یہی بات ایک نئے رخ سے کرتے ہیں کہ ؎

اس قدر پیار ہے انساں کی خطاؤں سے مجھے
کہ فرشتہ مرا معیار نہیں ہو سکتا

انسانی لغزشوں، خطاؤں اور گناہوں کے علم کے باوصف اللہ تعالیٰ نے بندے کو احسنِ تقویم بنایا، اپنا نائب قرار دیا اور پوری کائنات کو اس کے لیے مسخر کر کے رکھ دیا اور توقع یہی کی کہ وہ لغزشوں سے بچنے کی امکان بھر سعی کرتا رہے اور کی گئی لغزشوں کا معترف بھی رہے اور ان پر نادم بھی ؎

پشیمانی ذریعہ ہو گئی بخشش کا، اے واعظ!
بہے جب اشک تو بہنے لگا دریائے رحمت بھی

اللہ تعالیٰ کا گھر سامنے ہو اور لغزشیں قطار اندر قطار تصور میں آ رہی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ اس کی رحمتوں کا خیال بھی، خطاؤں کی اس ظلمت میں برق بن کر کوندر ہا ہو تو مسرتوں کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہتا کہ اللہ نے ہم خطا کاروں کو مسجود ملائک بنایا، محبت کا نور اور علم کا حسن عطا کیا۔ مجبوری کے ساتھ ساتھ مختاری بھی دی، اشرف المخلوقات کا مقام بخشا، ارض وسما کو ہمارے لیے مسخر کر دیا اور اُخروی سرخروئی کو ہمارا مقدر بنایا۔ یہ رحمتوں کی ابتدا تھی تو اس ابتدا کی انتہا کیا ہوگی؟ یہ تصور انتہائی مسرت افزا ہے کہ مغفرت ہم گناہ گاروں ہی پر نازاں ہے کہ ہماری وجہ سے اُسے مظاہرے کا موقع ملتا ہے۔ اللہ رحیم ہیں اور اللہ کے نبی ﷺ رحمتِ عالم ؎

سلام اس پر کہ جس نے فضل کے موتی بکھیرے ہیں
سلام اس پر بُروں کو جس نے فرمایا ''یہ میرے ہیں''

الغرض، خطا، لازمۂ بشریت بھی ہے اور ایک اعتبار سے شانِ بشریت بھی۔ ایک شاعر نے نے تو یہ کہا ہے کہ میدانِ حشر میں ہم گنہگاروں پر رحمت کی بارش اس قدر برسی کہ پرہیز گار دوڑ دوڑ کر ہماری صفوں میں شامل ہو گئے ؎

شوق سے لکھیں فرشتے میرے عصیاں رات دن
ایک رحمت اس کی ہے اس سارے دفتر کا جواب

O

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو

یہ عظیم الشان گھر جو اس وقت پیش نظر ہے یہ اس کا گھر ہے جو سب عظیموں سے عظیم ہے اور سب کریموں کا کریم ہے۔ جس جیسا اور کوئی نہیں، دوئی کے نقش سب جھوٹے ہیں اور اُسی کا نام سچا اور پکا ہے، اُسی کی ذات یکتا ہے۔ یہ گھر اللہ تعالیٰ کی یکتائی کا ایک نشان ہے۔ اسی یکتائی کو ماننے اور مانتے رہنے کا وعدہ، دنیا میں آنے والی ہر روح سے لیا گیا تھا۔ مگر جب دنیا میں آ کر اور دنیا کی دلفریبیوں میں کھو کر، روحیں اس اقرارِ عبودیت کو بھول گئیں تو اُس ذات پاک نے اپنے برگزیدہ انسانوں کو مبعوث فرمایا۔ رنگ و بو کے یہ قافلے ایک ہی رنگ اور ایک ہی خوشبو کی یاد کو تازہ کرتے اور تازہ کراتے رہے۔ اسی رنگ سے کائنات کو رنگین بنانے اور اسی خوشبو کو لوگوں کے مشام جاں میں اُتارنے کے لیے کائنات کے سب سے عظیم انسان اور نبیوں میں سب سے عظیم نبی ﷺ تشریف لائے ؎

پھوٹا جو سینۂ شبِ تارِ الست سے
اس نورِ اولیں کا اُجالا تمھی تو ہو

انہوں نے گالیاں سہیں، پتھر کھائے اور اس قدر دُکھ اُٹھائے کہ انہیں کہنا پڑا کہ ''دنیا میں کوئی نبی اتنا نہیں ستایا گیا جتنا میں ستایا گیا ہوں۔'' طائف کے میدان میں اور احد کے دامن میں وہ مقدس خون بہا جس کا ایک قطرہ تمام کائنات سے افضل ہے۔ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی توحید کے قیام و ثبات کے لیے کہ نہ کوئی اللہ کی ذات میں شریک ہے نہ کوئی اس کی صفات میں ہم سر اور نہ

کوئی اس کے حقوق میں شامل۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مسلمانوں نے اللہ کی توحید سے دل کے کاشانوں کو آباد رکھا تو کائنات اُن کے حضور میں جھک جھک گئی اور جب دل ویران ہوئے تو زندگی سراب اور روز و شب خراب ہو کر رہ گئے ؎

تجھ سے مل کر زندگی مقصودِ مہر و ماہ تھی
تجھ سے کٹ کر در بدر بے آبرو ہونے لگی

اُس ایک دروازے پر جھک جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان امیروں، وزیروں اور شاہوں کے تبختر کو سر پائے استحقار سے ٹھکراتا چلا جاتا ہے اور ہر دنیاوی جاہ و حشمت کے روبرو سر کشیدہ رہتا ہے۔ خدا کے خوف نے ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کو تمام دنیا سے بے خوف کر دیا تھا اور ان کا استقلال ضرب المثل بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ موت سے بھی بے خوف ہو گئے تھے۔ موت ان کی محبوب بن گئی تھی، وہ مرنے کے لیے دعائیں مانگتے تھے اور نہ مرنے پر افسوس کرتے تھے۔

اقبالؒ نے بھٹکے ہوئے آہو کو حرم کا راستہ دکھاتے ہوئے کہا تھا ؎

یا رب! دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

وہ سر جو بارگاہِ الٰہی میں جھک جائے وہی سر بلند ہے، وہ ہاتھ جو اس بارگاہ میں پھیلے، وہی دنیاوی خزانوں سے بے نیاز ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ جب تک فقر، مسلمانوں کا فخر بنا رہا تب تک شاہوں کو حسرت ہی رہی کہ وہ کچھ مانگیں تو سہی ؎

ہے اہلِ کرم کو یہ غریبوں سے شکایت
صورت ہے سوالی تو صدا کیوں نہیں دیتے

خانہ کعبہ روبرو ہو اور زیب عنوان شعر زبان پر مچل رہا ہو تو دل اس سوچ میں ڈوبا رہتا ہے کہ فی الواقع ہمارا نشیمن بھی اللہ ہے اور شاخِ نشیمن بھی وہی کہ ہم اُسی کی عبادت کرتے ہیں اور اُسی سے ہر نوع کی مدد چاہتے ہیں کہ وہ مالک اسباب بھی ہے اور خالق اسباب بھی۔ ہم دن میں کئی بات کہتے ہیں۔ ایاک نعبد وایاک نستعین. اس میں اللہ تعالیٰ نے مفعول کو بطور خاص فعل پر مقدم کر دیا ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے استعانت چاہتے ہیں ؎

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

O

بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو
بے غرض جو دیا، دیا تو نے
داغؔ کو کون دینے والا تھا
جو دیا، اے خدا، دیا تو نے
مجھ گنہگار کو جو بخش دیا
پھر جہنم کو کیا دیا تو نے

داغؔ کے یہ تین شعر جوان کی ایک غزل کا حصہ ہیں، بیت الحرام میں اس عاجز کو اس لیے یاد نہیں آئے کہ داغؔ ایک عظیم غزل گو تھے اور انہوں نے زبان کے خوبصورت تیوروں کے ساتھ، غزل کو غزل ہی کے مفہوم میں سنوارا اور نکھارا، اس لیے بھی نہیں کہ غزل وہ حقیقت ہے جو حسن میں بستی ہے ''اور تخیّل کی وہ معراج ہے جو دیوانگی میں قیس وفرہاد اور فرزانگی میں میر وغالب کو عطا ہوتی ہے۔'' اس لیے بھی نہیں کہ وقت کے عظیم شاعر، داغؔ کی شاگردی پر فخر وناز کیا کرتے تھے یہاں تک کہ اقبالؔ نے بھی داغؔ کی اصلاح کو اپنی شاعری کے لیے وجہ فخر وناز سمجھا اور اس پر ایک خوبصورت نظم لکھی۔ بلکہ یہ اشعار اس لیے یاد آئے کہ ان میں داغؔ نے اپنے سادہ وپُرکار اسلوب بیان کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ذکر کیا ہے۔ داغؔ کا یہی وہ انداز ہے جسے سہلِ ممتنع کہتے ہیں کہ پڑھا جائے تو یوں لگے کہ ایسا کہنا تو انتہائی آسان ہے مگر جب کہنے پر آئے تو معجز بیان بھی عاجز نظر آئے۔ داغؔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا، انہیں کوئی دینے والا نہیں اور اس دینے والے

نے جود یا، بے طلب دیا اور بے غرض دیا کہ وہ رب العالمین ہے۔ ''رب اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے جس کے معنی ہیں ہر چیز کو پیدا کر کے، اس کی ضروریات مہیا کرنے اور اس کو تکمیل تک پہنچانے والا، اس کا استعمال بغیر اضافت کے کسی اور کے لیے جائز نہیں۔ لفظ عالم کی جمع نہیں لائی جاتی کیونکہ تمام خلائق کے مجموعے کو عالم کہا جاتا ہے۔ لیکن سورۃ فاتحہ میں عالمین کہہ کر، اللہ کی ربوبیت کاملہ کے اظہار کے لیے عالم کی بھی جمع لائی گئی ہے جس سے مراد مخلوقات کی الگ الگ جنسیں ہیں۔ ان تمام مخلوقات کی ضرورتیں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں لیکن ''رب العالمین'' سب کی ضروریات ان کے احوال وظروف اور طبائع واجسام کے مطابق مہیا فرماتا ہے۔'' اور یہ شعر ؎

مجھ گنہگار کو جو بخش دیا
پھر جہنم کو کیا دیا تو نے

دل کہتا ہے کہ یہ ایک شعر داغؔ کی مغفرت کے لیے کافی ہے۔ داغؔ نے کس شوخ ادا اور محبت بھرے لہجے میں خود کو گنہگار ترین قرار دیا اور پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت کا تذکرہ کیا کہ اس نے داغؔ کو بھی بخش دیا اور جب یہ گنہگار ترین بندہ بھی بخشا گیا تو اور کوئی بھی باقی نہ رہا۔ گویا داغؔ اپنے ساتھ ہم سب کو بخشوا گیا اور جہنم کی آگ کو کوئی غذا نہ مل سکی کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن ورحیم ہیں۔ رحمٰن اور رحیم دونوں مبالغے کے صیغے ہیں جن میں کثرت اور دوام کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ لفظ رحمٰن میں صفت مبالغہ کچھ زیادہ ہے کہ وہ دنیا میں بھی رحمٰن ہے اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں اس کی رحمت سے متبعین اور منکرین دونوں فیض یاب ہیں اور آخرت میں وہ صرف ہمارے لیے رحیم ہوگا۔

سوچتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ حقیر وناچیز کو بھی بے طلب اور بے غرض بہت کچھ دیا۔ وہ تمام اسباب عطا فرمائے جنہیں دنیاوی خوش بختی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کرے کہ یہ دنیاوی حسن، اُخروی حسن کا پیش خیمہ بن جائے۔ اس کے علاوہ زبان کو گفتار اور قلم کو تحریر کا حسن عطا کیا۔ عزت و آبرو عطا کی۔ والدین کی دعاؤں کو میرے لیے وقف رکھا۔ اپنے گھر میں بار بار آنے اور مدینہ منورہ میں حاضری کی توفیق عنایت فرمائی۔ ساتھ ہی حمد وثنا کے آداب عطا کیے۔

کلک ثنا کو نور کی موجوں میں رکھ دیا
یعنی گدازِ عشق کو ہونٹوں میں رکھ دیا

کتنا کرم کیا ہے خدائے رحیم نے
اپنی ثنا کو ڈوبتی سانسوں میں رکھ دیا

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے ایک لطیف روح سے نوازا، افسوس! کہ میں نے روح کی اس لطافت کو کثافت سے بوجھل بنا دیا اور اس کی شگفتگی کو قائم رکھنے کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ نتیجہ معلوم کہ روح روز بروز پژمردہ ہوتی چلی جا رہی ہے ؎

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو ایک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے گھر میں سراپا انکسار بھی ہوں اور سراپا اعتراف بھی کہ ؎

میرے ساقی نے عنایت کی تھی مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے میں ہے

O

☆

کام میرا خطا خطا، شان تیری عطا عطا
میرے خدا کرم کرم، میرے کریم اماں اماں
(عاصی کرنالی)

O

ترے ہی فیض سے میری نگاہ ہے روشن
ترے ہی فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

اللہ تعالیٰ کی عطاؤں کا تذکرہ اگر بیت اللہ کے روبرو تشکر آمیز انداز میں کیا جائے تو ان سراپا سپاس لمحوں کے طفیل، رحمتیں بھی بڑھتی ہیں اور نعمتیں بھی۔ میں یہ شعر پڑھتا اور سوچتا رہا کہ مولا کریم نے مجھے، میری حیثیت سے کہیں بڑھ کر وہ کچھ عطا کیا ہے جس پر جس قدر بھی فخر و ناز کیا جائے کم ہے ؎

مجھ پہ یہ لطف فراواں، میں تو اس قابل نہ تھا
تیری اس رحمت کے قرباں، میں تو اس قابل نہ تھا

رسول پاک ﷺ نے اُسے خوش نصیب قرار دیا ہے جس کے پاس یہ تین نعمتیں ہیں۔ (۱) سعید بیوی (۲) نیک اولاد (۳) وطن میں روزگار۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے راقم الحروف کو تینوں نعمتوں سے نوازا بلکہ وطن میں نہیں، گھر میں روزگار عطا فرمایا۔ بے وطنی تو بہت دور کی بات ہے۔ اُن والدین کی آغوش تربیت عطا کی جو خاصانِ بارگاہ میں سے تھے۔ میرے والد مجھے کہا کرتے تھے کہ وہ اس امر پر شکر کرتے ہیں کہ ان کے پوتے پوتیاں بھی نماز کی پابند ہیں۔ بفضلہٖ میرے پوتے، نواسے اور نواسیاں بھی دینی ماحول میں تربیت پا رہی ہیں اور ہم سب مالی اعتبار سے آسودہ ہیں۔ میری اہلیہ بھی ایک متقی اور دیندار خاندان سے متعلق ہے۔ ان کے والد اپنے علاقے کے رئیس بھی تھے اور تحریک ختم نبوت کے پرجوش کارکن بھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کروڑوں کی زمین درسگاہ دیوبند اور مجلس تحفظ ختم

نبوت کے لیے وقف کر دی تھی۔ فیوضات ربانی کے تذکرے کے لیے دفتر مطلوب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بطور معلم عزت بھی دی اور عظمت بھی۔ میرے بے شمار شاگرد میرا ذکر احترام اور فخر سے کرتے ہیں۔ تمنا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ میری لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر فرماتے رہیں اور لطف و کرم کے اس تسلسل کو جاری و ساری رکھیں ۔

شکلِ صدف خدا سے دعا مانگ، اُٹھا کے ہاتھ
بحرِ جہاں میں مثلِ گہر آبرو رہے

آرزو (دعا، دلی آرزو ہی کا نام ہے) یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دل کو رعنائی اور زبان کو سچائی عطا کر دے۔ مجھے وہ رزق دے جو پاک ہو، وہ علم دے جو پر منفعت ہو، وہ عمل کرنے کی توفیق دے جو اس کے ہاں مقبول ہو، میں پناہ مانگتا ہوں، اُس علم سے جس میں نفع نہ ہو، دل کے ان جذبوں سے جن میں اس کی عظمت کا اعتراف نہ ہو، اُس نفس سے جس میں قناعت نہ ہو اور اس دعا سے جو اُسے پسند نہ ہو ۔

آتے نہیں انداز مجھے حسنِ طلب کے
اے رحمتِ یزداں ، یہ مرا دستِ دعا ہے

اللہ تعالیٰ کی بے حد و بے حساب مہربانیوں اور کرم فرمائیوں کا تذکرہ ہے تو اس امر کا اظہار بھی لازم سا ہو جاتا ہے کہ ۱۹۷۹ء میں میری خوش دامن کی وفات ہوئی۔ اُن کی آرزو کے مطابق حج بدل کے لیے مجھے کہا گیا (تب میرے علم میں نہ تھا کہ حج بدل کے لیے خود حاجی ہونا ضروری ہے) میں گاؤں والد محترم کو مطلع کرنے گیا حالانکہ اُن کی زندگی میں مجھے ان سے اجازت لینے کے لیے جانا چاہیے تھا۔ انہوں نے سن کر فرمایا ''نہیں جانا'' دل پیچ و تاب کھاتا رہا مگر زبان نے ''ہاں'' میں جواب دیا کیونکہ میں والد سے اُن کے ارشاد کی وجہ نہیں پوچھا کرتا تھا۔ بس تعمیل کیا کرتا تھا۔ وجہ پوچھتا بھی تو یہی جواب ملتا ''بیٹا! یہ کام نہیں کرنا، کیوں نہیں کرنا، مجھے نہیں پتا، پر نہیں کرنا۔'' میں نے وجہ نہیں پوچھی تھی۔ بس ماننے والوں میں شامل رہنا چاہتا تھا کہ میرے نزدیک یہی فلاح کا راستہ تھا اور ہے۔ جبکہ آج کی پود وجہ و دلیل کے بعد بھی بات نہیں مانتی بلکہ اپنی ہی کرتی ہے کہ جدیدیت نے اُسے یہی سکھایا ہے۔ نتیجہ معلوم کہ آج چھوٹے بڑے بنے ہوئے ہیں اور بڑے چھوٹے۔ میری معذرت کے بعد بھائیوں نے میرے ہم زلف (جناب قاضی عبدالرؤف صاحب) کو حج بدل کے لیے بھجوا دیا۔ عین حج کے ایام میں میرے والد بیمار ہوتے ہیں اور میں

انہیں گاؤں سے گوجرانوالا لے آتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کم وبیش ڈھائی سال اُن کی خدمت کی توفیق دی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مجھے حج بیت اللہ، زیارت مسجد مصطفیٰ ﷺ اور روضۂ اقدس پر حاضری کی توفیق عطا کی بلکہ کئی بار عمرے کے لیے بھی اپنے گھر بلایا کہ کوئی پوچھے تو گننا پڑتا ہے ؎

ہے جس قدر وسیع ترا دامن کرم
اتنا ہی اپنا دستِ تمنا دراز ہے

حق یہ ہے کہ والد ماجد کے ارشاد کی تعمیل کے صلے میں اللہ تعالیٰ ان سعادتوں سے پیہم نواز رہے ہیں اور دل یہ کہتا ہے کہ وہ اسی طور نوازتے رہیں گے۔

میں یہ واقعہ لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ آرزو یہی تھی کہ خوشبو، پھول کے اندر رہے، بکھرے نہیں۔ مگر نسلِ نو کی رہنمائی کے لیے لکھنا ضروری سا ہو گیا ہے کہ اُسے احساس ہو کہ والدین کی اطاعت کا صلہ اللہ تعالیٰ کس کس رنگ سے عطا کرتے ہیں۔ میں خوش نصیب ہوں کہ والد ماجد نے مجھے ایک بار لکھا کہ ''زندگی کے میدان میں تم محسوس کرو گے کہ تمہارے گرد دعاؤں کا حصار قائم ہو چکا ہے۔'' اور یہ بات میرے لیے کل بھی ایک حقیقت تھی اور آج بھی۔ دعاؤں کا یہ حصار میرے ڈگمگاتے قدموں کو مسلسل اپنی موجودگی کا احساس دلائے چلا جا رہا ہے ؎

ہستی کی تمازت میں کیا نام نے تیرے
جو کام کہ ویرانے میں دیوار کرے ہے
ہر شام جماتی ہے ترے خواب کی محفل
ہر صبح تری یاد کو بیدار کرے ہے

بات اللہ تعالیٰ کے فیضان سے شروع ہوئی تھی کہ اُسی کے کرم سے نگاہ میں روشنی بھی ہے اور سبو میں سمندر بھی مچل رہے ہیں اور اس کے حضور میں دل بھی جھکا ہوا ہے اور سر بھی۔ لفظ 'فیض' میں لبالب ہو کر بہہ نکلنے کا مفہوم پایا جاتا ہے اور فیض، مستحق تک بخوبی پہنچ جائے تو اُسے 'فیضان'' کہتے ہیں جبکہ فیاضی سے مراد یہ ہے کہ دینے والا، اتنا دے دے کہ دامن کی کوتاہی کا احساس شدید تر ہو جائے، گویا لطفِ جمال کے منتہائے کمال پر پہنچ کر، نوازنے کا دوسرا نام فیضان ہے۔ حق یہ ہے کہ لطف وکرم نہ کسی کی اطاعت دیکھتا ہے نہ معصیت، اس کا کام تو بس نوازنا ہے اور اس نوازش کے بغیر، ہر انسانی خاکہ بے رنگ، ہر آرزو بے ثمر اور ہر انسانی سعی بے توفیق رہا کرتی ہے۔

طرازِ عنونِ شعر، شاعرِ مشرق کا ہے جو بالِ جبریل کی ایک غزل کا آخری شعر ہے۔ میں نے بہ تصرفِ ادنیٰ فیوضاتِ ربانی کے اعتراف کے طور پر اسے خانہ کعبہ میں بار بار پڑھا، اصل شعر یوں ہے ؎

اُسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اُسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

O

☆

رہے یارب! تری توفیق میری راہبر ہو کر
بھٹک جاتے ہیں اکثر آدمی اہلِ نظر ہو کر

(عاصی کرنالی)

O

مرے دردِ نہاں کا حال محتاجِ بیاں کیوں ہو
جو لفظوں کا ہو مجموعہ، وہ میری داستاں کیوں ہو

بیدم وارثی کا یہ خوبصورت شعر، کم و بیش پچپن برس پہلے پڑھا تھا۔ تب سے ذہن پر نقش ہے۔ افسوس کہ بیدم کو ادب میں وہ مقام نہ مل سکا جس کا وہ مستحق تھا۔ نقادوں نے اُسے نظر انداز کیا کہ وہ صوفی منش تھا اور قوالوں نے اُسے لہک لہک کر ہوا میں اُڑا دیا۔ حالانکہ بیدم وارثی کی غزلیات میں فکر کی زیبائی، سوچ کی سچائی اور اظہار کی رعنائی لفظ لفظ لو دے رہی ہے، بیدم کی ایک غزل کا مقطع ہے ؎

سنا ہے صوفیوں سے ہم نے اکثر خانقاہوں میں
کہ یہ رنگیں بیانی، بیدمِ رنگیں بیاں تک ہے

دل کی داستان دل ہی بیان کر سکتا ہے اور دل ہی سمجھ سکتا ہے کہ کسی کا حال، کسی سے کہا نہیں جاتا۔ انسان کوشش کرتا ہے کہ لفظوں میں دردِ دل بیان کرے مگر لفظ ساتھ نہیں دیتے کیونکہ لفظ، جذبات بن ہی نہیں سکتے ؎

سینے میں وہ کچھ اور ہے، لفظوں میں ہے کچھ اور
غم کے کئی انداز بیاں میں نہیں ملتے

بیانِ درد کے لیے دل کو زبان دینا پڑتی ہے اور دل کی زبان، آنسو ہیں کہ وہی درد دل کا بے ساختہ اظہار ہوتے ہیں۔ آنسو، زبان بے زبانی سے سوز و کرب کی شدتوں کو بیان کر جایا کرتے ہیں ؎

آنسو چھلک پڑے تو مری لاج رہ گئی
اظہارِ غم کا ورنہ سلیقہ نہ تھا مجھے

مگر آنسو بھی، ایک حد تک غم دل کی بیان کر سکتے ہیں، ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ غم بڑھتا چلا جاتا اور آنسو، خشک ہوتے چلے جاتے ہیں، تب دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے اور لہولہو دل، سرخ اشکوں کی شکل میں بہہ نکلتا ہے۔ محاورے میں اسی کو خون کے آنسو رونا کہتے ہیں ؎

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے، جب نہیں آتا

سوچتا ہوں کہ اگر غزل نہ ہوتی تو فکر و خیال کو یہ جمالیاتی دلپذیری کیسے نصیب ہوتی، کہ لاکھ نظمیں مل کر بھی غزل کے ایک شعر کی نشتریت اور ایمائیت کا جواب نہیں بن سکتیں۔ بات آنسو کی ہو رہی ہے، غزل کہتی ہے ؎

آج تو اے جوشِ گریہ، خوب کیں گلکاریاں
خونِ دل دامن پہ ہے، خونِ جگر آنکھوں میں ہے

دیارِ حسن و جمال میں بسا اوقات لفظ عاجز اور زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ تب آنسو، حضورِ ناز تک، ترسیلِ غم کا ایک معتبر ذریعہ بن جاتے ہیں۔ بیت اللہ ہو یا مسجد مصطفیٰ ﷺ، مواجہہ شریف ہو یا قدمین شریفین کی جانب واقع سفید ستون، وہاں لفظوں سے کہیں زیادہ آنسو ہی بولتے ہیں، کیونکہ اُن میں سچائی اور رعنائی کا ایک خوبصورت امتزاج ہوتا ہے۔ بات بہرکیف تشنہ، الفاظ، بہرا سلوب مُبہم اور آنسو، بہرا عتبار، معتبر ہیں اور حق یہ ہے کہ بارگاہِ محبوب میں سچائی ہی کی قدر ہے۔ لفظوں کا بے محل اور بے جا استعمال ناراضی کا باعث بھی بن سکتا ہے اور محرومی کا سبب بھی۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائیں اور اگر کوئی لفظی کوتاہی ہوگئی ہو تو درگزر فرمائیں کیونکہ نیت بہرحال راست تھی اور ہے۔ دل میں جذبات کا تلاطم ہو تو اکثر اسلوب کو قابو میں رکھنا مشکل سا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی بے حد و بے حساب مہربان ہیں اور اُن کے حبیب ﷺ بھی حرص (عربی میں اس لفظ کا مفہوم ہے کسی چیز کو پھاڑنا، چھیدنا اور چھیلنا سختی کے ساتھ، اس میں سختی اور شدت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ گویا شدید ترین آرزو، جس نوع کی بھی ہو) کی حد تک ہمارے لیے شفیق و مہربان اور رؤف و رحیم ہیں۔ اہل عرب، حریص کسی کے لیے منفعت کی شدید آرزو رکھنے والے کو کہتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ نبیٔ پاک ﷺ ہماری منفعت کے لیے حریص ہیں کیونکہ اُن پر ہماری تکلیف انتہائی شاق گزرتی

ہے۔اس لیے یقین کامل ہے کہ معذرت قبول ہوگی ؎

اللہ اللہ! وہ رحمت ہے خطا کاروں پر
جو خطا ہونے سے پہلے ہی خطا پوش ہوئی

میرا خیال یہ ہے کہ دیارِ ناز میں زبان چپ ہی رہے تو بہتر ہے۔ یہ ایک عجیب کیف آور بات ہے کہ یہاں آنسو، بے ساختہ، پلکوں پر لرزنے اور چمکنے لگ جاتے ہیں اور دل کی وادیوں میں خود بخود چراغاں کا سا ایک سماں ہو جاتا ہے۔ تب لفظوں کی نارسائی اور اشکوں کی پذیرائی کا ایک احساس سا ہونے لگتا ہے اور یہی احساس اس سفر کا حاصل ہے ؎

چپ چاپ ہیں لب، کُوکتی آنکھوں میں ہے دیپک
پلکوں میں، سر اشکوں میں نہاں رقصِ شرر ہے

O

☆

ربِّ جہاں دکھا مجھے میری اسی حیات میں
میری تڑپ کے آب و رنگ، میری دعاؤں کا اثر

(عزیز احسن)

O

اگر سیاہ دلم، داغِ لالہ زار توام
وگر کشادہ جبینم، گلِ بہارِ توام

اس گنہگار انسان پر یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ اس نے مجھے ایک دیندار گھرانے کا ماحول عطا کیا۔ کیا معلوم کہ کسی اور گھرانے میں ہوتا تو کیا ہوتا۔ شکر کے مواقع بہر کیف بہت زیادہ ہیں اپنی تمام تر کوتاہیوں اور نارسائیوں کے باوجود، اللہ تعالیٰ کی عطاؤں پر نازاں ہوں کہ وہ نوازے ہی چلا جا رہا ہے۔ بے طلب، بے غرض، سوچتا ہوں تو تشکر و استحسان کے لیے لفظوں کا قحط نظر آتا ہے۔ بہر کیف جو کچھ بھی ہوں جس نوعیت سے ہوں جس رنگ، ڈھنگ اور آہنگ سے ہوں، اُسی کے دامن سے وابستہ ہوں، جس کی پہچان اور جس کا عرفان، کائنات کے سب سے بڑے اور سب سے سچے انسان نے ہمیں عطا کیا۔ نبیٔ کریم ﷺ کے فیضان نے ہم عصیاں شعاروں کے لیے رنگ و نور کا ایک گلزار کھلا رکھا ہے جس کی مہک دلوں کو مہکاتی رہے گی اور جس کے جلوے نگاہوں کو روشنی عطا کرتے رہیں گے۔ یہ نسبت، یہ تعلق اور یہ واسطہ ہی ہماری حیات مستعار کی واحد آبرو ہے۔ اگر میں سیاہ دل ہوں تو اسی گلزار میں کھلنے والے لالے کے پھولوں کا داغ ہوں کہ وہ داغ، بھی سیاہ ہوتا ہے مگر وہ ہوتا تو لالے کے دل میں ہے۔ اگر دل کا اُجلا ہوں، اگر میری سوچ شفاف، نگاہ بینا اور دل پاک ہے تو بھی میرا تعلق اسی گلزار کی بہاروں سے ہے۔ یہ الگ بات کہ میری سیاہیاں میری اپنی پیدا کردہ ہیں اُن کا ذمہ دار میرا ہی نفس خطاوار ہے اور جو روشنیاں ہیں وہ اُس ذات پاک کی عطا کردہ ہیں جو زمین اور آسمانوں کا نور ہے۔ آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اطاعت اور نبیٔ پاک ﷺ کی محبت عطا کر دیں۔ قرآن پاک کی تفہیم اور عمل کی توفیق عطا فرما دیں اور اپنے حسب منشا بنا دیں۔ بھلا ہو برادر مکرم پروفیسر عطاء الرحمٰن عتیق کا کہ اب کے انہوں نے دعائیہ نوعیت کا ایک فارسی شعر عنایت

فرمایا کہ اسے حرم پاک میں پڑھنا، میں نے بساط بھر پڑھا بھی، آپ بھی سن لیں۔ ؎

دلم را محوِ یادِ خویش گرداں
مرا حسبِ مرادِ خویش گرداں

اللہ تعالیٰ ہم سیہ کاروں کو ''حسب مراد خویش'' کر دیں تو اُن کا عفو و کرم ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے نہ ڈر کر اور بدعات و رسومات پر اڑ کر، خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کر کے، غضب الٰہی کو دعوت دے رہے ہیں اور نہیں سمجھ رہے کہ بدعات، شیطان کے گل پوش جال ہیں، ایمان کے ساتھ، عمل کی صالحیت بھی ضروری ہے۔ سنت کے مطابق عمل ہی قابل تحسین اور قابل قبول ہے۔ فرائض و واجبات کا ترک اور بدعات و رسومات پر عمل ہی، دلوں کی سیاہی کا باعث ہے، نبیٔ پاک ﷺ نے بدعات کو شرالامور (بدترین کام) قرار دیا ہے۔

انسان کو قدم قدم اور نفس نفس اپنی لغزشوں کا احساس ہونا چاہیے۔ شرمندگی کا احساس، توبہ کا نقطۂ آغاز ہے، توبہ کا خیال ہی زندگی کی خزاں کو بہار میں بدل دیا کرتا ہے۔ ابلیس کو اپنی غلطی کا احساس ہی نہیں تھا۔ توبہ کا خیال کیسے آتا، نتیجہ معلوم کہ وہ مردود ٹھہرا، کتنی رحمت ہے اُس رحیم و کریم ذاتِ بلند و برتر کی کہ اس نے اعتراف و اعتذار کا اسلوب بھی آدم کو خود ہی سکھا دیا کہ

''اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم واقعی نقصان پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔'' (الاعراف ۲۳)

ہمارے اسی اعتراف و اعتذار کے سامنے ملائکہ بھی سربسجود ہیں اور پوری کائنات بھی مسخر، یہ اعتراف و اعتذار ہی خانہ کعبہ میں صاحبِ خانہ کو مائل بہ کرم کیا کرتا ہے۔ افسوس کہ ہمیں نہ حمد و ثنا کا کوئی انداز آتا ہے، نہ معذرت کا کوئی اسلوب ؎

پشیماں ہے ازل سے اس لیے لوحِ گماں میری
نہیں توصیف کے قابل قلم میرا، زباں میری
مرے اوہام پر اپنی صداقت منکشف کر دے
غلط سوچوں کو دیتی ہیں جنم، مجبوریاں میری

O

مری بندگی سے مرے جرم افزوں
ترے قہر سے تیری رحمت زیادہ

یہ شعر اپنے اندر ایک عجیب دعائیہ کیفیت لیے ہوئے ہے۔ بندگی کی بے کیفی اور خطاؤں کی کثرت کا اعتراف اور اللہ تعالیٰ کے غضب پر حاوی اس کی رحمتِ بے پایاں کا ذکر۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم سے ناراض ہو کر اور انہیں عذاب الٰہی کی دھمکی دے کر، اللہ کے حکم کے بغیر ہی وہاں سے چل دیئے جس پر اللہ تعالیٰ نے ناراض ہو کر انہیں مچھلی کا لقمہ بنا دیا اور وہ ظلمات میں گھر کر رہ گئے۔ رات کی تاریکی، سمندر کی گہرائی اور مچھلی کے پیٹ کا اندھیرا، ایسے میں انہوں نے دعا کی۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ.

''الٰہی! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے، بے شک میں ظالموں میں سے ہوں۔''

نتیجہ معلوم کہ اندھیرے چھٹ گئے اور شدائد کٹ گئے۔ اپنی لغزشوں کو جان کر اور اپنی خطاؤں کو مان کر جب کوئی خلوص دل کے ساتھ اللہ کو پکارتا ہے تو قبولیت خود استقبال کو آیا کرتی ہے۔ گوربچن سنگھ کوشاںؔ کہاں یاد آ گئے، کہتے ہیں ؎

یہ راز اہلِ فقر سے میں نے بھی پا لیا
جب تک خلوصِ دل نہیں، کوشاں دعا نہ مانگ

حدیث پاک کے مطابق درج بالا دعا کے ساتھ جو بھی مانگا جائے، اللہ پاک عطا فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا فرمان ہے کہ ان کے غضب پر ان کی رحمت حاوی ہے۔ اس شعر میں اسی

حقیقت کے پیشِ نظر اپنے جرم ہائے سیاہ کے ساتھ ساتھ اپنے بے ذوق سجدوں کا بیان ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے غضب کے کم ہونے اور رحمت کے زیادہ ہونے کا اظہار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص سے حریمِ ناز میں بلایا ہے اور ہم 'لبیک لبیک' کی صداؤں کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں تو یقیناً بلانے والے نے باریابی ہی کے لیے بلایا ہے ؎

میں خس و خاشاک، مشتِ خاک، مجھ پر یہ کرم
یوں پذیرائی مری، یہ کب تھا اندازہ مجھے

اس یقین کے ساتھ جب درج بالا شعر کو سنگِ در سے لپٹ لپٹ کر، آنسوؤں کی قوس قزح میں دُہرایا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گناہ دُھلتے چلے جا رہے اور دل کی ظلمتیں نور بداماں ہوتی چلی جا رہی ہیں کہ تاریکی ہوتی ہی بے وجود ہے وہ تو محض نام ہے روشنی کے نہ ہونے کا۔ اندھیرا جتنا سنگین ہوگا، سحر کا حسن اتنا ہی رنگین ہوگا ؎

ظلمتوں کو فروغ پانے دو
اور چمکے گی منزلِ جاناں

حق یہ ہے کہ ہماری صفیں کج، دل پریشاں اور سجدے بے ذوق ہیں اور خیال و فکر سکون و عافیت سے تہی ہیں، ہمیں علم ہی نہیں ہوتا کہ ہم کس کے حضور میں، قیام و قعود اور رکوع و سجود کر رہے ہیں، محض ایک رسم، وہ بھی ایک معمول کے تحت ادا ہو رہی ہوتی ہے، کہاں وہ نماز کہ..... وہیں کعبہ سرک آیا، جبیں ہم نے جہاں رکھ دی..... کہاں دورانِ نماز میں محبوبِ حقیقی کے جلوے ..... کہ جسم میں گڑا تیر نکل جائے اور علیؓ کو پتا بھی نہ چلے۔ یہ تو زمانۂ رسالت مآب ﷺ کی بات ہے۔ ماضی قریب میں جناب مفتی محمد حسنؒ کی ایک ٹانگ بوجوہ کاٹنا مقصود تھی اور اُن کی سرجن کو یہ ہدایت تھی کہ انہیں بیہوش نہ کیا جائے کہ وہ عالم نشہ میں اپنے اللہ سے نہیں ملنا چاہتے۔ اُن کی ہدایت پر عمل کیا گیا وہ اپنے اللہ سے لو لگا کر خود کو بھول گئے اور ٹانگ کٹ گئی ؎

جلوہ گاہِ ناز کے پردوں کا اُٹھنا یاد ہے
پھر ہوا کیا اور کیا دیکھا، یہ کس کو ہوش ہے

میں حضورِ ناز میں بار بار زیبِ عنوان شعر پڑھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اپنی نماز بھی کیا ہے کہ بار بار سجدۂ سہو کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، ایسے ایسے خیالات کی یلغار، جنھیں کہا نہ جا سکے۔ البتہ عالم ندامت میں ایسے خیالات کو جھٹکنے کی سعی، اور پھر یہ اطمینان کہ رحمتِ عالم ﷺ نے اسی کیفیتِ قلبی

کو ایمان سے تعبیر فرمایا ہے۔ یقیناً ہماری بندگی سے ہمارے جرم افزوں اور اللہ تعالیٰ کے قہر سے اس کی رحمت کہیں زیادہ ہے اور یہی رحمت ہم عاصیوں کا واحد سہارا ہے۔ ''اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم کا سمندر چونکہ غیر محدود ہے، اس کے کنارے ازل سے ابد تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی لیے اس کی رحمت کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ وہ بخشنے پر آتا ہے تو ان مجرموں کو بخش دیتا ہے جن کی بخشش کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ نوازنے پر آتا ہے تو گداؤں کو شاہ بنا دیتا ہے۔ ایسے کریم کے دروازے سے وہی محروم لوٹ سکتے ہیں جن کی نظر اس کے الطاف پر نہیں ہوتی اور جو گدائی کے سلیقے سے محروم ہوتے ہیں۔ گدا کی آواز کا سوز، سخی کے رحم و کرم کو متحرک کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور بندے کی آواز میں جب سوز پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی صدا دردناک بن جاتی ہے۔ تو رحمت بڑھ کر اُسے آغوش میں لے لیتی ہے اور اس کے لیے پردہ پوش بن جاتی ہے۔ پردہ پوشی خدا کی رحمت کا خاصہ ہے بشرطیکہ بندہ خود کو اس کا اہل ثابت کرنے کی صلاحیتوں سے محروم نہ ہو۔''

O

☆

دل سمندر، تشنہ لب صحراؤں جیسے ہو گئے
اب کوئی ابرِ کرم، اے منبعِ جود و سخا

(محمد فیروز شاہ)

O

عفو و خطا میں ضد ہو گئی تھی
وہ بھی نہ ہارے، میں بھی نہ ہارا

خطا تو خیر لازمۂ بشریت ہے، ہوتی ہی رہتی ہے مگر عفو کے لیے استغفار ضروری ہے۔ لازم ہے کہ خود کو پر تقصیر اور حقیر سمجھا جائے اور بارگاہِ خداوندی کی توقیر کو پیش نظر رکھا جائے۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ نہیں ہاریں گے ہمیں ہار مان لینی چاہیے۔ نہیں معلوم کس نے کہہ دیا ''باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار'' ﷺ۔ میرے خیال میں تو دونوں مقامات پر خبردار اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کہ یہ آیت نطق محمد ﷺ ہی نے ہم تک پہنچائی۔

مَالَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَاراً ۔ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نے اللہ کا وقار دل سے اُٹھا دیا ہے۔''

نبیٔ کریم ﷺ سے محبت، اپنی جان، مال اور اولاد سے زیادہ ہونی چاہیے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ سے محبت کا تعلق ہے وہاں قرآن نے ''اَشدّ'' کا لفظ استعمال کر کے اس محبت کو انتہائی بلند و بالا کر دیا ہے ہمیں انتہائی محبت، انتہائی احترام، انتہائی خوف اور انتہائی اُمید کے ساتھ استغفار کرتے رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اپنی خطاؤں پر نہ اَڑنا ہی دلیلِ عبودیت ہے۔ استغفار سے معافی ہی نہیں ملتی بلکہ رحمتوں کی بارش یوں ہوتی ہے کہ دنیاوی مال و دولت اور اولاد میں کثرت اور آخرت میں مغفرت کا وعدہ ہے۔ قحط سالی ہو یا فقر و فاقہ، بے اولادی ہو یا نا اُمیدی، استغفار ہی سے نوازشوں اور سعادتوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''اگر تم بڑے گناہوں سے بچے رہو گے جن سے تم کو منع کیا گیا ہے تو ہم تمہارے چھوٹے

گناہ معاف کردیں گے اور عزت و بزرگی کی جگہ میں داخل کریں گے۔'' (النساء ۳۱)

ہمیں اس خوشخبری کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ صغیرہ گناہوں پر اصرار اور مداومت انہیں کبیرہ بنا دیا کرتی ہے۔ اجتناب کبائر کے ساتھ احکام و فرائض اسلام کی پابندی اور اعمال صالحہ کا اہتمام ضروری ہے۔ صحابہ کرامؓ نے شریعت کے اس مزاج کو سمجھ لیا تھا اس لیے انہوں نے صرف وعدۂ مغفرت ہی پر تکیہ نہیں کیا بلکہ مغفرت و رحمت الٰہی کے یقینی حصول کے لیے مذکورہ باتوں کا بھی اہتمام کیا جب کہ ہمارا دامن عمل سے خالی ہے لیکن دل اُمیدوں اور آرزوؤں سے معمور ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عفو و کرم اللہ تعالیٰ کی شانِ رحیمیت کا مظاہرہ ہے اور یہ اظہار اُس رحمٰن و رحیم کو انتہائی پسند ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ اس اظہار کے لیے وہ بلند و برتر ذات بہانوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ اُسے کسی خاطی و عاصی کی کوئی ادا پسند آ جائے تو اس کی عمر بھر کی لغزشوں کو نہ صرف محو کر دے بلکہ چاہے تو انہیں نیکیوں میں بدل دے اور کسی عابد و زاہد کی کوئی حرکت نازیبا محسوس ہو تو اس کی عمر بھر کی ریاضت ''هَبَآءً مَّنثُوراً'' بنا دی جائے۔ اسی کو تو بے نیازی کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تو ہیں ہی بے نیاز..... رہ گئیں شاعرانہ شوخیاں، ڈرنا ہی چاہیے۔ حسن ظن ہی رکھنا چاہیے کہ یہ شوخیاں حسن طلب ہی کے ذیل میں آتی ہیں۔ گلہ اور شکوہ تو ہوتا ہی وہاں ہے جہاں تعلقِ خاطر ہو، آخر شکوہ لکھنے والے کو بھی جواب شکوہ لکھنا ہی پڑا۔ نہیں معلوم شکوہ کی ادا پسند آتی ہے یا جواب شکوہ کا انداز۔

کہتے ہیں کہ ایک پٹھان خانہ کعبہ میں رو رو کر یہی کہتا رہا کہ ''اے اللہ! ہمارے گھر میں جانی دشمن آ جائے تو ہم اُسے معاف کر دیتے ہیں، اب میں تیرے گھر میں آ گیا ہوں، تُو تو ہے ہی رحیم و کریم۔'' گویا خود دیکھ لے کہ مناسبِ شانِ عطا ہے کیا؟ ایک بدو مسجد نبوی میں یہ کہتے سنا گیا کہ ''اے اللہ! میرے گناہوں کو معاف کر دے۔ معاف کر دے گا تو یہ (ﷺ) خوش ہوں گے جو اس روضۂ اقدس میں آرام فرما رہے ہیں، نہیں معاف کرے گا تو شیطان خوش ہوگا''..... ؎

بات کرنے کی ادا ہوتی ہے
نکہتِ گل بھی صدا ہوتی ہے

درج بالا شعر بھی حرمِ کعبہ میں یاد آتا رہا۔ مقصود یہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ معاف کرتے نہ ہارا اور میں ارادتاً گناہ کرتے نہ ہارا کہ معافی تو بہر کیف ملنا ہی ہے، مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی شانِ مغفرت کے تسلسل کو بیان کرنا ہے اور اپنی اُس فطرت کو جس کا خاصہ بہکنا اور بھٹکنا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ توبہ کی

توفیق دے دیں تو کوشش یہی ہونی چاہیے کہ اس گناہ کی یاد بھی دل میں باقی نہ رہے۔ یہی قبولیت توبہ کی دلیل ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ؎

شاید ابھی نہ پہنچی ہو بابِ قبول تک
ساقی! ذرا سی اور کہ توبہ سفر میں ہے

اور پھر.....توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرا کے پی گیا۔

میرا تجربہ ہے کہ دیارِ پاک میں قدرت بعض اوقات خود رہنمائی کرتی، راستہ دکھاتی اور یاس کو آس کا سہارا دیتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات، سوچ کا انداز بدل دیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۹۸ء میں حج کے موقع پر میں، اہلیہ کے ساتھ حرم جا رہا تھا۔ سیڑھیوں پر میں نے اہلیہ سے کہا کہ ذرا رش کا جائزہ لو، آج نماز کے بعد طواف کر لیں، ہمارے پیچھے ایک بہت ضعیف شخص احرام میں ملبوس تھا۔ اس نے میری بات سن کر کہا کہ ''بابا! رش کی طرف نہ دیکھ بلکہ اللہ کی طرف دیکھ، یا میری طرف دیکھ کہ میں نے ابھی عمرہ بھی کرنا ہے۔'' میں نے مسکرا کے کہا کہ آج ان شاء اللہ طواف ہوگا اور ضرور ہوگا۔ صبح منیٰ جانا تھا۔ ہوٹل میں، ملازم، میز پر برتن چن رہا تھا کہ میں نے اہلیہ اور بیٹی سے کہا کہ ''عالم پیری میں آ گئے ہیں اور تھک جاتے ہیں یہاں جوانی میں آنا چاہیے تھا۔' ہوٹل کے ملازم نے میری بات سن کر کہا کہ ''حاجی بابا! جوانی میں آپ کے اختیار میں تھا تو آ کیوں نہیں گئے۔ جب بلانے والے نے بلانا ہے تب ہی آنا ہے۔''

غالباً ۵ مئی ۲۰۰۶ء کی بات ہے کہ میں نماز مغرب کے بعد صحنِ حرم میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ساتھ ایک انتہائی ضعیف شخص احرام میں تشریف فرما تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ ''حضرت! کب پاکستان سے تشریف لائے، کہنے لگے تین دن ہو گئے ہیں۔'' میں نے کہا کہ ابھی عمرہ نہیں کیا۔ کہنے لگے کہ وہ تو آتے ہی کر لیا تھا۔ میں نے کہا، یہ احرام؟ کہنے لگے ''اتارنے کو دل ہی نہیں چاہا اور آج طواف میں تین چکر نیچے لگائے اور پھر اوپر کے برآمدوں میں چلا گیا اور چکر ہی لگاتا رہا۔ کچھ زیادہ ہی ہو گئے ہیں'' میں نے کہا'' سات دانوں والی تسبیح لے لو۔ انہوں نے ذرا خشمگیں ہو کر کہا۔ بابا! میں کیوں حساب کتاب رکھتا رہوں جب کہ اس گھر کا مالک مجھے بے حساب دیتا ہے؟'' میں لاجواب ہو گیا اور اُسے سمجھا نہ سکا کہ جذب و جنوں کے ساتھ آداب کی بجا آوری اور تعمیلِ ارشاد بھی لازم ہے۔ اس پس منظر میں، سراج الدین ظفر کا یہ رندانہ شعر دہرانا چاہتا تھا مگر حرم کے احترام نے دہرانے کی اجازت نہ دی ؎

تسبیح سے سبو کو بدل کر ، خدا کو آج
بالا تر از شمار و عدد ہم نے کر دیا

غزل میں ساقی، میکدہ، ساغر، سبو، مے، استعارے ہوتے ہیں، یہ شعر کو استعمال کرنے والے کا اپنا ذوق ہے، کہ وہ موقع کی مناسبت سے ان استعارات کو مطالب کا کون سا حسن عطا کرتا ہے، گو اللہ تعالیٰ نیتوں کا خلوص دیکھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی ذات ہو یا رسولِ پاک ﷺ کی شخصیت، ہر مقام پر ہمیں احترام اور ادب کے انتہائی تقاضوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے، شعر و سخن میں بھی شوخی سے بچنا چاہیے کہ کہیں وہ نادانستہ طور پر گستاخی تک نہ پہنچ جائے کہ حضورِ ناز میں بے باکی، نامرادی تک لے جاتی ہے۔

ہر کہ گستاخی کند در راہ دوست
رہزن مرداں شد و نامردیٔ اوست

(جو راہ یار میں گستاخی کرتا ہے وہ مرد نہیں ہے، مردوں کا رہزن ہے، اس کی نحوست مردان راہ کے لیے بھی سدّ راہ بن جاتی ہے۔)

اب سادہ لوحی کی بعض باتیں بھی ہو جائیں گی۔ اب کے (۳ مئی ۲۰۰۶ء تا ۸ مئی ۲۰۰۶ء) بہ سلسلہ عمرہ، اللہ تعالیٰ مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ لے گئے۔ مکہ میں ایک پاکستانی خاتون نے میری اہلیہ سے پوچھا کہ 'یہاں نوگزے کی قبر کہاں ہے؟ میں نے اس کی زیارت کے لیے جانا ہے۔'' معلوم نہیں کہ اہلیہ نے اسے کیا کہا، مجھ سے پوچھا جاتا تو میں کہتا کہ یہاں تو کسی ''دوگزے'' کی قبر پر بھی کسی خاتون کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' مدینہ منورہ میں ایک خاتون نے اہلیہ سے کہا کہ ''ہمیں مدینہ میں وہ جگہ بھی دکھا دیں جہاں شیطان کو کنکریاں ماری جاتی ہیں۔'' یاد رہے کہ وہ خاتون اور اس کا خاوند مکہ سے بذریعہ بس ہمارے ساتھ ہی مدینہ آئے تھے اور مدینہ میں حاضری کے بارے میں وہ خاتون معلومات لے رہی تھی۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے، اے خدا!

اور آخر میں ایک لمحۂ فکریہ! یہ واقعہ بھی اسی قیام کے دوران میں پیش آیا، شاہ فہد نے حرم میں خوبصورت اضافہ کیا ہے، وہاں گوجرانوالا سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے یہ جان کر کہ میری رہائش سیٹلائٹ ٹاؤن میں ہے، مجھ سے ایک امیر کبیر، سیاسی نوعیت کی شخصیت کے بارے میں پوچھا کہ آپ اُسے جانتے ہیں؟ میں نے ہاں میں جواب دیا۔ کہنے لگے کہ میں اس کا ملازم ہوں، وہ کروڑ پتی ہے اُسے اللہ تعالیٰ یہاں آنے کی توفیق نہیں دے رہے

اور مجھے کم و بیش ہر سال بلاوا آ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہیں کتنے ہی مجھ ایسے غریبوں اور مسکینوں کو نواز رہے ہیں اور کتنے ہی زرداروں کو محروم کیے ہوئے ہیں۔ یہ لکھ رہا ہوں تو سوچ رہا ہوں کہ نبیٔ پاک ﷺ ایک دعا مانگا کرتے تھے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ''اے اللہ! مجھے مسکینوں میں زندہ رکھ اور میری موت بھی مسکینوں میں ہو اور حشر بھی.....''۔

O

☆

توبہ کی بھی توفیق اسی در سے ہے ملتی
یہ آخری بخشش بھی اسی گھر سے ہے ملتی

O

میں گنہگار و گرفتارِ ہوس، لغزیدہ پا
اپنے کس کس عیب کا میں تذکرہ تجھ سے کروں

یہ ایک انتہائی خوشگوار تجربہ ہے کہ حرم کعبہ میں داخل ہوتے ہی جہاں اللہ کی بڑائیوں پر انسان کی نظر جاتی ہے وہاں اپنی برائیوں پر بھی توجہ مرتکز ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ انسان اس سمیع وبصیر کے دربار میں ہوتا ہے جو اس کے ہر عمل کو بھی دیکھتا ہے اور اس عمل میں مخفی نیت کو بھی سمجھتا ہے۔ جو دل میں پیدا ہونے والے وسوسوں سے بھی خوب آگاہ ہے اور زبان وقلم پر لودینے والے لفظوں سے بھی۔

یہ کس مقام پہ لایا جنوں، خدا جانے
سنبھل سنبھل کے قدم رکھ رہے ہیں دیوانے

چونکہ اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن دونوں سے آگاہ ہے۔ اس لیے اس کے حضور میں کچھ چھپانے کا فائدہ، یوں انسان خود کو سراپا معذرت بنا کر، ہر لمحہ مغفرت کا طلبگار رہتا ہے۔ نہ اس کے پاس کوئی دلیل ہوتی ہے اور نہ وہ اپنے عمل کی کوئی توجیہ پیش کرتا ہے۔ وہ مجسم اعتراف بن کر، اپنی غلطیوں کی معافی چاہتا ہے کیونکہ وہ اسی دربار عالی میں بلایا ہی اسی لیے گیا ہے کہ ''یوم الدین'' سے پہلے پہلے، خود ہی اپنے خلاف گواہ بن کر پیش ہو جائے اور گزشتہ کو بخشوا کر، آئندہ کے لیے محتاط ہو جائے۔ یہی مقصود ہے اس حاضری کا، عجیب بات ہے کہ یہاں آنے والے کو یوں بنا سنوار کر، ہاروں سے لاد کر اور باجے بجا کر بھیجا جاتا ہے کہ وہ یہاں آنے سے پہلے ہی اہتزاز نفس کے ہاتھوں از خود رفتہ سا ہو جاتا ہے اور لوٹنے کے بعد بھی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ سارا کیا دھرا هَبَآءً مَّنْثُوْراً بن کر اُڑ جاتا ہے۔ حالانکہ ایک مجرم کی عدالت میں حاضری اور واپسی کسی بھی جشن کی متحمل نہیں ہوا کرتی اور

اگر اس عدالت سے وہ مطمئن لوٹتا ہے تو اس کے لیے تشکر لازم ہے اور تشکر کا بہترین انداز ''سجدہ'' ہے، اُس مالکِ کائنات کے حضور میں، جس نے اُسے خود بلایا، خود رُلایا اور خود ہنسایا ہے اور جس کے حضور میں کائنات کی ہر شے، اپنے اپنے انداز سے حمد سرا بھی ہے اور سجدہ گزار بھی۔ یہی بہترین انداز ہے اُس سرمائے کو بچانے کا جو وہ دیارِ ناز سے سمیٹ کر لایا ہے۔ ہمیں دربارِ خداوندی میں باریابی اور نعمتوں کی ارزانی پر خوش ہونا چاہیے مگر خوشی منانے سے حتّی الوسع احتراز کرنا چاہیے کہ دورِ حاضر کی تقاریبِ مسرت سے نفس ہی کو غذا ملتی ہے اور اس نوع کی محفلیں اہتزازِ نفس ہی کو ہوا دیتی ہیں۔ افتخار، انکسار ہی بنا رہے تو بہتر ہے۔ دینے والے کا احسان قدم قدم، قلم قلم اور لفظ لفظ پیش نظر رہنا چاہیے اور جب تک زندگی ہے سراپا دعا رہنا چاہیے کہ اے اللہ! تو ہم کو کھلے اور چھپے فحش سے پاک کر دے، ہماری بصارت اور سماعت، گفتار اور رفتار کو شستہ و شائستہ بنا دے۔ ہمیں اپنی رحمتیں عطا کر، اپنی نعمتوں کا شکر گزار بنا، ہمیں توفیق بخش کہ ہم تیری ثنا کرتے رہیں اور تو ہم پر اپنی نعمتوں کو پورا فرماتا رہے۔'' یہ صرف خدائے رحیم ہی کی عدالت ہے کہ انسان کسی مرحلے پر بھی گناہ کا اعتراف کر لے اور عجز کا سرمایہ لے کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہو جائے تو اس کی بخشش و رحمت کا حقدار بنتا ہے۔ تمام عمر معصیت کی زندگی بسر کرنے کے بعد اس کی رحمت کو پکارتا ہے تو مایوس نہیں لوٹتا۔ دنیا کی عدالتیں کسی انسان کو بار بار قانون شکنی کرنے کے بعد عادی مجرم قرار دے دیتی ہیں اور اس کے ساتھ کوئی رعایت برتنا گوارا نہیں کرتیں لیکن خدا تعالیٰ بار بار توبہ توڑنے والوں کو اپنی بارگاہ سے نہیں دھتکارتا، ہر بار اُن کے لیے بخشش و رحمت کے دروازے کھلتے ہیں، عادی مجرم قرار دے کر رحمت کا دروازہ بند نہیں کر دیا جاتا'' (۲) روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک نوجوان فوت ہو گیا اس نے وصیت کی کہ اس کی سیاہ ڈاڑھی پر آٹا چھڑک دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو سفید بالوں سے حیا آ جاتی ہے، حق یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے جو حسن ظن وابستہ کر لے وہی مقدر ہو جاتا ہے۔ میں تو حرمِ کعبہ میں اپنے سفید بالوں کے واسطے ہی سے رحمت اور مغفرت کی آرزو کرتا رہا۔

چشمِ رحمت برکشا، موئے سفیدِ من بہ بیں
گرچہ از شرمندگی روئے سیاہ آوردہ ام

O

اے کرم پرور! کرم، میرے گناہوں پر نہ جا
رحم کے قابل ہوں میں، انصاف کے قابل نہیں

واقعی ہم رحم کے قابل ہیں، انصاف کے قابل نہیں، اسی لیے اللہ پاک نے خود ہی فرما دیا کہ مجھ سے میرا فضل مانگو۔ رہ گئی عدل کی بات، اللہ تعالیٰ عادل ہیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ بندے کا ہر عمل ریکارڈ ہو رہا ہے..... ہر بات جو ہم کہتے ہیں، ہر سطر جو ہم لکھتے ہیں، ہر قدم جو ہم اُٹھاتے ہیں، ہر کام جو ہم کرتے ہیں، آج ہمارا عمل ہے کل ہمارا نامۂ اعمال ہوگا اور فیصلہ اسی کی بنیاد پر ہو گا۔ آج ہم اختیار رکھتے ہیں، اپنے کل کے لیے، کل جوابدہ ہوں گے، اپنے آج کے لیے (۳) ؎

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے

وہ علیم و خبیر ذات، ماتھے کی سلوٹوں سے لے کر ہونٹوں کی حکایتوں تک، نگاہ کی خیانتوں سے لے کر دل کی خباثتوں تک، ہر حرکت سے بخوبی آشنا ہے۔ ایک چیونٹی چلتی ہے اور اس کے چلنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ ذات وہ بھی سنتی ہے۔ جس اللہ نے ہمارے کان بنائے ہیں وہ خود کس قدر سمیع ہوگا، جس نے ہمیں آنکھیں عطا کی ہیں وہ خود کس قدر بصیر ہوگا۔ یہ بھی عیاں ہے کہ ایک ذرہ خیر بھی میزان میں تُلے گا اور ایک ذرہ شر بھی تاکہ عدل میں اعتراض کا موقع نہ رہے۔ یہ بھی صداقت ہے کہ ہمارے جسم کے تمام اعضاء خود ہمارے بارے میں شہادتیں دیں گے اور روزِ حشر ہم کو ہمارے ہی سامنے شہادت کے لیے پیش کر دیا جائے گا ؎

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

حفیظ ہوشیارپوری مرحوم یاد آ گئے۔ان کی زندگی کے آخری لمحے تھے،نظام تنفس کی بحالی کے لیے آکسیجن لگی ہوئی تھی، زبان بند ہو چکی تھی۔اس عالم میں کاغذ،قلم مانگا اور ایک طویل نظم لکھی، جس کے چند شعر خیال کے اُفق پر لہرا رہے ہیں۔آپ بھی سن لیں ؎

لفظ ابھی ایجاد ہوں گے ہر ضرورت کے لیے
شرحِ راحت کے لیے،غم کی صراحت کے لیے
اب مرا چپ چاپ رہنا امر مجبوری سہی
میں نے کھولی ہی زباں کب تھی شکایت کے لیے
آکسیجن سے شبستانِ عناصر تابناک
مضطرب ہر ذی نفس اس کی رفاقت کے لیے
میرے چشم وگوش ولب سے پوچھ لو سب کچھ یہیں
مجھ کو میرے سامنے لاؤ شہادت کے لیے
آہ ، مرگِ آدمی پر آدمی روئے بہت
کوئی بھی رویا نہ مرگِ آدمیت کے لیے

''مجھ کو میرے سامنے لاؤ شہادت کے لیے'' عدل کے اس رخ کا سامنا کرنے کی ہمت کس میں ہوگی؟ حفیظ ہوشیارپوری شاعرانہ انداز میں، اسی دنیا میں معافی کے آرزومند ہیں، روزِ حشر میں عدل کے خواہاں نہیں ہیں۔تب تو سب لرزاں وترساں ہوں گے۔اس لیے مجھ ایسے لغزیدہ پا، سوختہ پر اور شکستہ ناخن انسان کو عدل کی نہیں، فضل ہی کی طلب کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر یہ دعا مانگنا چاہیے کہ وہ روزِ حساب رسولِ رحمت ﷺ کو ہمارا شفیع بنا دیں۔چند نعتیہ اشعار ؎

فصیلِ زیست پہ بجھتا ہوا دیا ہوں میں
منارِ نور ترا عکس چاہتا ہوں میں
میں خاکِ محض، میں انبارِ گل، میں مشتِ غبار
تری نگاہ جو پڑ جائے، کیمیا ہوں میں
درود ہو تری رحمت مآب کملی پر
ردائے یاس میں لپٹی ہوئی خطا ہوں میں

تو رحمتوں کا تجمل، تو شفقتوں کا جمال
یہ میری سوچ کا محور نہیں کہ کیا ہوں میں

سچ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے جو گمان بھی وابستہ کرے گا اس کے ساتھ اُسی نوع کا سلوک ہوگا۔ زیرِ لب شعر میں بھی شاعر دعائیہ انداز میں یہی گزارش کر رہا ہے کہ اے رحیم و کریم ذات! میرے گناہوں کے حساب کتاب میں کیا رکھا ہے؟ میزان عدل میں تلنے کے لیے نامۂ اعمال میں کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ الگ بات کہ بائیں ہاتھ والا فرشتہ مسکرا رہا ہے اور دائیں ہاتھ والا سر جھکائے کھڑا ہے۔ اے اللہ! تیری رحمت واسعہ ہی میرا واحد سہارا ہے، مجھے اسی کی طلب ہے اور اسی کی آرزو، میرا نشیمن بھی تو 'شاخِ نشیمن بھی تو' واضح ہے کہ جب اس نوع کی آرزو دل کی گہرائیوں سے اُبھرے گی اور رخساروں پر بہتے آنسوؤں کے ساتھ، لرزتے لبوں سے ادا ہوگی تو یقیناً شانِ عفو و مغفرت جوش میں آجائے گی اور پھر ؎

میں رحمتوں کے باب سے ہو کر نکل گیا
میزانِ عدل میرے عمل تولتی رہی

انسان کو اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے فضل ہی کی دعا کرنا چاہیے۔ دل سچی طلب سے لبریز ہو تو خطائیں بھی حسنات میں بدل جائیں گی اور کسی ایسی بظاہر معمولی سی ادا پر بخشش ہو جائے گی جو ذہن سے بھی محو ہو چکی ہوگی ؎

رحمت حق بہا نمی جوید
رحمت حق بہانہ می جوید

میرے مرحوم دوست پروفیسر غلام حسین نے مجھے بتایا کہ ایک سال حج کے بعد حاجی واپس آئے اور محلے کے ایک حاجی نے انہیں بتایا کہ وہ انہیں مکہ معظّمہ، ایک رات خواب میں ملے تھے اور انہوں نے حرم کعبہ میں اُن کے لیے بہت دعا کی تھی۔ پروفیسر موصوف نے اُن سے اس رات کا تعین کرنے کو کہا اور پھر اس معین شب کے بارے میں اپنے اعمال کا جائزہ لیا تو ایک بات سامنے آئی کہ اُن کے مکان کی چھت پر ایک کمرہ فالتو چیزوں اور کاٹھ کباڑ کے لیے مخصوص تھا، اس میں ایک بلّی نے بچے دے رکھے تھے کسی نے اس کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا اور آدھی رات کو بلّی، دروازے پر بیٹھ کر رو رہی تھی اور انہوں نے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولا تھا تاکہ بلی اپنے بچوں کے پاس جا سکے۔ اِدھر اس بے زبان بلی پر رحم کیا گیا اُدھر اللہ تعالیٰ نے مکہ معظّمہ میں اپنے گھر میں

ان کی یاد کا اہتمام فرمادیا۔

نبیٔ پاک ﷺ غالباً لشکر اسلام کے ساتھ میدانِ جنگ سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ آپ ﷺ نے دیکھا کہ دور ایک کتیا اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی ہے۔ آپ ﷺ نے لشکر کو راستہ بدل دینے کا حکم دیا کہ مامتا اور اس کے بچے پریشان نہ ہوں۔ نبیٔ پاک ﷺ سے کسی نے ''دین'' کی تعریف پوچھی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

الدین التعظیم لا مر اللّٰہ والنصیحة لخلق اللّٰہ.

کہ دین اللہ تعالیٰ کی عظمت اور خلق خدا سے شفقت کا نام ہے۔

مولانا احمد علی لاہوریؒ نے 'دین اسلام' کو ایک جملے میں یوں سمیٹا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ کو عبادت، اس کے نبی ﷺ کو اطاعت اور خلق خدا کو محبت سے خوش رکھو۔''

ہم اپنے بارے میں جو سلوک اللہ تعالیٰ سے چاہتے ہیں، چاہیے کہ ہم چھوٹے پیمانے پر ویسا ہی سلوک اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ کریں۔ ہم آرزومند ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم کرے، بنا بریں لازم ہے کہ ہم مخلوق خدا پر بساط بھر رحم کریں۔ ہم یہاں رحم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ وہاں ہم پر مہربان ہوں گے۔ ہم یہاں اُنھیں یاد کریں گے، اللہ تعالیٰ فرشتوں کی محفل میں ہمیں یاد کریں گے۔ بہر کیف ہمیں اپنے لیے کم اور دوسروں کے لیے زیادہ جینا چاہیے ؎

ابھی تک ہے یہی معیار انساں کے پرکھنے کا
جہاں سے کیا لیا ہم نے، جہاں کو کیا دیا ہم نے

O

☆

وہ نیتوں میں چُھپے خیر و شر کو تولتا ہے
قریب رہتا ہے، سازِ نفس میں بولتا ہے
(صبیح رحمانی)

O

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

اس بار (۸ مئی ۲۰۰۶ء) دیارِ خدا و رسول ﷺ میں حاضری کی توفیق ملی تو ارادہ یہ کیا کہ اب کے کوئی شعر نہیں پڑھنا بلکہ مکہ معظّمہ میں صرف استغفار اور مدینہ منورہ میں صرف درود پاک ہی پر اکتفا کرنی ہے کہ استغفار سے صرف لغزشوں ہی کو معافی نہیں ملتی بلکہ آسمان سے بارش بھی خوب برستی اور ہر ویران کھیتی کو سرسبز و شاداب بناتی ہے۔ مالی اعتبار سے بھی آسودگی نصیب ہوتی ہے اور اولاد میں بھی ہر نوع کی برکت و سعادت عطا ہوتی ہے۔ باغات پھلتے پھولتے اور نہریں لبالب بہتی ہیں۔ یہ خیالات سورۂ نوح کی آیات سے مستعار ہیں۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے نماز استسقا کے لیے صرف انہی آیات کا سہارا لیا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ ''میں نے بارش کو، بارش کے اُن راستوں سے طلب کیا ہے جو آسمانوں میں ہیں اور جن سے بارش زمین پر اُترتی ہے۔'' حضرت حسن بصریؒ نے مختلف اشخاص کو، قحط سالی، فقر و فاقہ اور بے اولادی کے لیے استغفار ہی کی تلقین کی تھی۔ مکہ معظّمہ میں قبل ازیں بیت اللہ کو جاتے ہوئے اور آتے ہوئے:

استغفر اللّٰہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ

ہی وردِ زبان ہوا کرتا تھا مگر ایک ساعت استغفار کے ساتھ یہ دعا بھی زبان پر آ گئی۔

لَا اِلٰـہَ اِلَّا اَنْـتَ سُبْـحٰـنَکَ اِنِّیْ کُنْـتُ مِنَ الظّٰلِمِیْـنَ

اور اس دعا کے ساتھ ہی اقبالؒ کا زیبِ عنوان شعر بھی بے ساختہ لبوں پر آ گیا، غزل کو کیسے چھوڑ دوں کہ ''یہ انسانی فطرت کی خلقی افتاد کا ابدی اظہار ہے، یہ جذبات کی سہیلی اور واردات کی

ہمجولی ہے۔'' اور ؎

شاعری کیا ہے؟ دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے

اور غزل کو شاعری کی لطیف ترین شکل کہا گیا ہے۔

اقبالؔ کا یہ شعر، ایک حقیقت کا عکاس ہے، اقبالؔ خود آ گاہ بھی تھا اور خدا آ گاہ بھی کہ خود آ گہی، خدا آ گاہی کی پہلی منزل ہے، خودشناسی، عرفانِ حق کی اوّلین شرط ہے، خودی کا رازداں ہی خدا کا ترجمان ہوتا ہے۔ اب جو شعر لکھ رہا ہوں غالباً اقبالؔ کا نہیں ہے کسی اور شاعر کا ہے ؎

خودی کی ابتدا یہ تھی کہ اپنے آپ میں گم تھا
خودی کی انتہا یہ ہے، خدا کو یاد کرتا ہوں

انسان کو خود آ گاہی نصیب ہو جائے تو یوں لگتا ہے کہ میں ہی سب سے زیادہ لغزیدہ پا اور آلودہ داماں ہوں۔ جب وہ اپنے گریبان میں جھانکتا ہے تو اپنا ہی سراپا اچھا نہیں لگتا۔ ننگی خیانتیں اور قلبی خباثتیں اُسے سوچ کی سولی پر لٹکا دیتی ہیں۔ ؎

منصفو! کچھ تو کہو، کیوں سر بازار حیات
مجھ کو احساس نے سولی پہ چڑھا رکھا ہے

اُسے خود سے نفرت ہونے لگتی ہے اور یہ احساس جاگ اُٹھتا ہے کہ یہی اعمال، جب نامۂ اعمال بن کر، روزِ حشر، روبرو ہوں گے تو کیا بنے گا۔ جوابدہی کا یہ احساس انسان کے ذہن، فکر اور دل کو ہلا کے رکھ دیتا ہے۔ وہ اپنے اعمال کی سیہ دلی کو لے کر در در جاتا ہے مگر کہیں بھی سکون قلب کی دولت نہیں ملتی، کہیں بھی اس کی بے کلی کو آسودگی نصیب نہیں ہوتی۔ جملہ مذاہب اُسے خدا سے ملانے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اُسے خودشناسی نہیں دیتے، نتیجہ معلوم کہ وہ اپنے آپ سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ عالم تشکیک و یاس میں منطق و فلسفے کی پناہ لیتا ہے مگر ذہنی اُلجھنیں فزوں تر ہو جاتی ہیں ؎

نہ دیا نشانِ منزل مجھے اے حکیم! تو نے
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے، تو نہ رہ نشیں نہ راہی

بالآخر اُسے، اُس اللہ کے دامنِ عفو و کرم میں پناہ ملتی ہے جس نے محمد ﷺ کو اپنا آخری پیغمبر بنا کر بھیجا جس نے اسلام کو مذہب کے طور پر نہیں بلکہ دین کے طور پر پیش کیا۔ ایک مکمل نظام حیات،

دونوں دنیاؤں کے لیے۔(یادرہے کہ ہمارے ہاں زندگی رنگ بدلتی ہے آہنگ نہیں۔اور ختم نہیں ہوتی بلکہ مختلف انداز سے جاری رہتی ہے۔) اللہ تعالیٰ نے سیرتِ رسول ﷺ کی شکل میں، اس ضابطۂ حیات کا عملی نمونہ بھی کائنات کے سامنے رکھ دیا۔خود کو رحمٰن ورحیم اور اپنے پیغمبر ﷺ کو رحمت عالم بنا کر پریشاں حال لوگوں کو آسودگیٔ خاطر سے نوازا اور پھر یہ اعلان عام کہ صرف ندامت کا احساس لے کر، اس سراپا کرم اور سراپا رحمت کی چوکھٹ پر آ جاؤ، دل کی گہرائیوں سے توبہ کرلو، تو ماضی کے تمام گناہ محو کر دیئے جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی ایک نئی زندگی اپنا آغاز کرے گی جس میں اُجالے ہی اُجالے ہوں گے۔ ؎

افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا درِ شاہِ زماں نہیں

O

☆

کہاں سے لاؤں سلیقہ بیانِ غم کے لیے
لبِ طلب پہ ہے پیہم دعا، کرم کے لیے
(حفیظ الرحمٰن احسن)

O

رحمت اگر معاف کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

میرے نزدیک دیارِ خدا و رسول ﷺ میں حاضری کا مقصد وحید، زندگی بھر کے گناہوں پر ندامت اور اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم پر یقین و وابستگی ہے کہ ؎

شوق سے لکھیں فرشتے میرے عصیاں رات دن
ایک رحمت اس کی ہے اس سارے دفتر کا جواب

غالبؔ کا یہ شعر، جو اس تحریر کا عنوان ہے، اس حقیر انسان کو اپنی پر تقصیر زندگی کا، لحہ لحہ اور قدم قدم احساس دلاتا رہا۔ اس شعر کے تناظر میں کعبے کے روبرو سوچتا رہا کہ میں تو اس قدر شرمندہ ہوں کہ اپنی لغزشوں کا کوئی سا عذر بھی پیش نہیں کر سکتا۔ دل کے ساحل سے گزرنے والے قبیح خیالات پر تو شاید گرفت نہ ہو کہ وہ خود آئے ہیں، لائے نہیں گئے مگر نگاہوں کو سنبھالنا اور جھکانا تو میرے بس میں تھا۔ زبان و بیان کو تو ادب کا سلیقہ سکھا سکتا تھا۔ اپنے تلامذہ کو تو نصیحت کرتا رہا کہ

اَدب زباں کو سکھاؤ، حیا نگاہوں کو

مگر خود اس پر عمل نہ کر سکا۔ یہ جان کر لرزتا رہا کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہے جو کہی گئی باتوں پر عمل نہیں کرتے۔ یہاں تو کچھ کہنے کی حاجت ہی نہیں کہ وہ علیم و خبیر ذات سب کچھ جانتی ہے، عیاں بھی، نہاں بھی، یہاں تو صرف نادم سکوت مطلوب ہے کہ وہ بھی تکلمِ بلیغ کی حیثیت رکھتا ہے ؎

سکوت آموز طولِ داستانِ درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہے

انسان بسا اوقات، کعبۃ اللہ کے روبرو چپ میں ڈوبا رہتا ہے مگر جب کبھی ملتزم سے چمٹنے اور لپٹنے کا موقع مل جائے تو خامشی کے بندھن ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں اور یہی چپ چپ انسان پھوٹ

پھوٹ کر روتا ہے کہ یہیں آنسو، موتی سمجھ کر چنے جاتے ہیں۔ یہیں نالہ وفریاد خود کو آبرومند محسوس کرتے ہیں۔ یہیں ندامت کھل کر اپنا اظہار کرتی ہے، یہیں، رحمت، جوش میں آتی ہے، یہیں دل کی سیاہی دھلتی اور نگاہ کو دیکھنے کا سلیقہ ملتا اور یہیں سے آئندہ سنبھلنے، سنورنے اور نکھرنے کی توفیق عطا ہوتی ہے۔ برادرِ عزیز سید محمد صبیح الدین صبیح یاد آ گئے ؎

خوشا وہ دن، حرم پاک کی فضاؤں میں تھا
زباں خموش تھی، دل محو التجاؤں میں تھا
در کرم پہ صدا دے رہا تھا اشکوں سے
جو ملتزم پہ کھڑے تھے میں ان گداؤں میں تھا
دھڑک رہا ہے مرے سازِ روح پہ اب بھی
وہ ایک نغمہ جو 'لبیک' کی صداؤں میں تھا

اللہ تعالیٰ اپنے گھر بلاتے ہی اس لیے ہیں کہ انہیں ہمارے قلب ونظر کی ویرانیوں کو شادابیوں میں بدلنا ہے۔ انہیں ہماری حیران وویران آنکھوں کو گریہ عطا کر کے، اشکِ بے مقدور کو موتیوں کی تاب وتب دینا مقصود ہے۔ غالبؔ نے تو اپنے شعر میں کہا تھا کہ ''رحمت اگر معاف کرے۔'' مگر اس عاصی کو تو یقین کامل ہے کہ رحمت، ہماری لغزشوں کو معاف کرے گی، ہم کوئی عذر پیش کریں یا نہ کریں، زبان ہلائیں یا نہ ہلائیں، ہاتھ اُٹھائیں یا نہ اُٹھائیں، رحمت کو دل کی ندامت مقصود ہے کہ ندامت، عجز کا اعتبار اور فوز وفلاح کا افتخار ہے، ندامت کا بہترین اظہار آنسو ہیں۔ آنسو وہ کچھ کہہ جاتے ہیں جسے اظہار وادا کا کوئی سا پیرایہ بھی بیان نہیں کر سکتا، پلکوں پر لرزتے ہوئے یہ ستارے، آنکھوں کا سنگار بھی ہیں اور وقار بھی ؎

سرا بے کہ زخشد بہ ویرانہ خوش تر
ز چشمے کہ پیرایۂ نم نہ دارد

اور حرم پاک کی یہی وہ پاکیزہ فضا ہے جہاں سراب وخراب آنکھوں کو پیرایۂ نم عطا ہوتا ہے۔ یہ عطا، بخشش اور مغفرت کا وثیقہ ہے۔ شعری جمال اور نثری کمال، موتیوں کی اس چمک کے سامنے شرمندہ شرمندہ نظر آتا ہے کہ یہ جمال وکمال اظہار کی اس جامعیت سے محروم ہے ؎

طرزِ دعا بھی سونپ رہا ہوں نگاہ کو
کیوں حرف التجاؤں میں حائل دکھائی دے

O

عصیانِ ما و رحمتِ پروردگارِ ما
ایں را نہایتے است نہ آں را نہایتے

دورِ حاضر روشن خیالی کے سانچے میں کچھ یوں ڈھل گیا ہے کہ بے حیائی نگاہوں کے راستے دلوں میں گھر کرتی جارہی ہے۔ دینی قدروں سے لگاؤ ختم ہوگیا ہے۔ نسلِ نو ہنود و یہود کی ثقافت کو اپنا کر خود کو ترقی پسند سمجھ رہی ہے حالانکہ نہ قرآن پاک سے زیادہ کوئی انقلابی اور ترقی پسند ضابطۂ حیات ہے اور نہ مومن سے زیادہ کوئی روشن خیال۔ قرآن پاک کا دعویٰ ہی یہ ہے کہ وہ ظلمات کو نور عطا کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ ذرائع ابلاغ، عریانی و فحاشی کے علمبردار ہیں۔ اخبار سے لے کر بازار تک نگاہ کا سنبھلنا اور اُسے سنبھالنا مشکل ہوگیا ہے۔ شیطان کے زہریلے تیر چل رہے ہیں اور ہوس چھپ چھپ کے نہیں بلکہ علانیہ سینوں میں تصویریں بنا رہی ہے۔ نتیجہ معلوم کہ نگاہیں خائن اور دل شرابی ہوگئے ہیں، بلکہ سینوں کے اندر اندھے ہوکر رہ گئے ہیں ۔

ہو چشم اگر کور، کریں شمس و قمر کیا
بوجہل کا ہادی نہیں قرآنِ مبیں بھی

آج ہماری زندگی کی ناؤ بھنور میں بری طرح ڈگمگا رہی ہے کہ گھر، بازار اور بازار گھر بن چکا ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم راہوں میں بیٹھنے سے بچو'' لوگوں نے کہا ''یارسول اللہ ﷺ ہمیں اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر باتیں کرنے کی مجبوری ہے'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر تم نہیں مانتے تو راہ کا حق ادا کرو'' انہوں نے پوچھا ''راہ کا حق کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''آنکھ نیچے رکھنا، کسی کو ایذا نہ دینا، سلام کا جواب دینا، اچھی بات کرنے کا حکم کرنا اور بری بات سے منع کرنا''۔ افسوس! کہ آج نگاہیں بے قابو اور دل متذبذب ہو چکے

ہیں، ایک تاریکی ہے جس نے زندگی کا احاطہ کر رکھا ہے اور دن، رات سے زیادہ تاریک ہیں۔

یوں تو دیکھے ہیں بہت سے دن اُجالوں سے تہی
یہ عجب دن ہے کہ اس پر رات پہرے دار ہے

مکافاتِ عمل کا تصور بہر کیف ایک حقیقت ہے کہ انسان جو بوئے گا، سو کاٹے گا، یہاں بھی اور وہاں بھی، برے کو اس کے اعمال بد کی سزا اور نیک کو اس کے اعمال صالح کی جزا، سزا عمل کے مطابق اور جزا دینے والے کی رضا کے مطابق۔ اگر بات جزا اور سزا ہی کی ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمتِ بے پایاں کا حوالہ دے کر یاس کی تاریکیوں کو آس کے انوار سے نہ بدلتے۔ گویا رحمت، انسان کو سزا سے بچانے کا ایک بہانہ ہے۔ مطلوب صرف توبہ واستغفار ہے۔ ضرورت اپنے گریبان میں جھانکنے کی ہے۔ اپنی تنہائیوں کو ندامت کے آنسوؤں سے منور کرنے کی ہے۔ رحمت کب سے ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ رحمت جوش میں آئے تو وہ گناہوں کو صرف معاف ہی نہیں کرتی بلکہ انہیں نیکیوں میں بدل دیتی ہے اور یہ بھی رحمت ہی کا ایک خوبصورت رُخ ہے کہ وہ منکروں کو منوانے اور گنہ گاروں کو بچانے کے لیے سو سو جتن کرتی ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ہماری عصیاں شعاریوں اور عصیاں نوازیوں کی کوئی حد ہی نہیں رہی اور رسالت مآب ﷺ کا یہ فرمان پورا ہو چکا ہے کہ ایک زمانے آئے گا کہ ''ایمان بچانا یوں ناممکن ہو جائے گا جیسے ہاتھ میں انگارا پکڑنا۔''

اے رب العالمین! آج ہم آگ کے گھڑے پر کھڑے ہیں، اپنی رحمت سے ہمیں ان انگاروں سے بچالے۔ ہماری نگاہوں کو عفت اور دل کو طہارت عطا کر دے۔ بے قابو جذبات اور بے لگام احساسات کو یوں درست سمت عطا کر دے کہ ہماری خلوتوں اور جلوتوں میں ایمان جگمگا اُٹھے اور ہماری زندگی، رات کی تاریکی میں، دن سے کہیں زیادہ روشن اور حسین ہو۔

''اے خاموشی کی زبان سننے والے مالک! اے اپنی مخلوق کے ہر حال سے ہمہ حال باخبر رہنے والے مولا! ہم پر رحم فرما! تو ہی جانتا ہے کہ ہم کس چیز سے محروم ہو رہے ہیں، اے بنانے والے، ہمیں پھر بنا، ہم شاید ہم نہیں رہے، سب کچھ وہی ہے.....لیکن سب کچھ بدل سا گیا ہے۔ ہمارا آسمان خوبصورت ہوتا تھا مگر اب وہی آسمان ہمارے سر پر وزن ڈال رہا ہے، ہم تیرے دیرینہ التفات سے محروم سے ہوتے جا رہے ہیں، ہماری زندگی تیرے محبوب ﷺ کے بتائے ہوئے راستے سے بھٹک گئی ہے۔ اے مالک! تو ہمارے دلوں کو اپنے نور سے زندہ کر دے، ہماری

راتوں کو اپنی یاد سے آباد کر دے، ہمیں سوزِ دروں سے نواز دے، ہمیں نمایش اور آلایش سے بچا، ہم پر نازل فرما اپنے کرم کی بارش، ہم پر آسان فرما اپنی معرفت کی منزل، ہمیں ایک بار پھر جام اُلفت دے، آباد کر اُجڑے ہوئے آشیانے۔'' (۴)

O

☆

ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا ہے تیرا نام
طوفاں کی شورشوں میں کنارا ہے تیرا نام

(خمار انصاری)

O

میری خطا پہ آپ کو لازم نہیں نظر
یہ دیکھیے، مناسبِ شانِ عطا ہے کیا

گزشتہ دنوں ایک دوست نے بتایا کہ وہ عمرے کے لیے گئے تو یہی دعا کرتے رہے۔

اللّٰھم انت، انت و انا ، انا. فافعل بی ما انت اھلہ و لا تفعل بی ما انا اھلہ.

اس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ''اے اللہ! تو، تو ہے اور میں میں۔ مجھ سے وہ سلوک کر جس کا تو اہل ہے، وہ سلوک نہ کر جس کا میں اہل ہوں۔'' میں حرم پاک میں یہ دعا بھی باقی قرآنی اور ماثورہ دعاؤں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ اس دعا کے ساتھ ہی درج بالا شعر یاد آ جاتا تو یوں لگتا کہ شاعر نے خوبصورت انداز کے ساتھ اسی دعا کے مفہوم کو پیش کر دیا ہے اور پھر اس شعر کو بار بار پڑھنے کو دل چاہتا، اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہیں۔ ان کے کلام کا آغاز ہی ان دو صفات سے ہوتا ہے اور یہی صفات، اللہ تعالیٰ کی ان صفات پر غالب ہیں جن میں غضب، انتقام اور عدل کا مفہوم ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو ان کی جمالی صفات کے ساتھ پکارے اور جو سلوک وہ خود اللہ تعالیٰ سے چاہتا ہے، وہی سلوک، چھوٹے پیمانے پر وہ خود دوسروں کے ساتھ کرے۔ یہاں سے محبت اوپر جائے گی تو وہاں سے بھی محبت ہی آئے گی کیونکہ یہ قانون فطرت ہے کہ جو چیز آسمان کی طرف پھینکی جائے وہی نیچے آتی ہے، ہمیں پھول، اوپر کی طرف اچھالنے چاہئیں تو ہم پر بھی گلباری ہی ہوگی..... انسان اس دنیا میں خلیفۂ خدا ہے، خلیفہ، مستخلف کی صفات کا عکس ہوتا ہے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے عفو و کرم کا معاملہ کریں تو لازم ہے کہ ہم بھی اللہ کے بندوں کے ساتھ رحم اور عفو کے ساتھ پیش آئیں اور اپنے زیر دستوں کی لغزشوں کو معاف کرتے رہیں۔ کیونکہ انسان کو پیدا ہی دردِ دل کے لیے کیا گیا ہے۔ یہی عبادت ہے، یہی دین و ایماں، اور

یہی رمز مسلمانی۔ انسان کا قرب ہی، قرب خداوندی ہے، ابلیس نے اسی قرب سے انکار کیا تھا کہ مردود و مقہور ٹھہرا، احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں ؎

داورِ حشر مجھے تیری قسم
عمر بھر میں نے عبادت کی ہے
تو مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
میں نے انساں سے محبت کی ہے

اللہ دینے والا ہے، بندہ مانگنے والا، اللہ منعم ہے اور بندہ گدا، منعم، گدا کو محروم نہیں رکھا کرتا، لازم یہ ہے کہ گدا، معطی سے نیاز مندی کا رشتہ قائم رکھے۔ اللہ تعالیٰ خطا کی سزا میں خوش نہیں ہوتے بلکہ انہیں عفو و درگزر میں خوشی ہوتی ہے۔ گدا اگر فیض یابی کے بعد سراپا سپاس و تشکر ہو جائے تو فیوض و برکات اس قدر فراواں ہو جاتی ہیں کہ گدا کو اپنے دامن کی تنگی کا احساس ہونے لگتا ہے، جس طرح ایک خوبصورت انسان کو آئینہ دیکھ کر مسرت ملتی ہے اسی طرح عطا کرنے والا گدا کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ گویا گدا اس کے لیے آئینہ بن جاتا ہے۔ وہ اس کے وجود میں اپنے جود و سخا کا کمال و جمال دیکھتا ہے یعنی جب انسان سراپا التجا بن کر، اللہ تعالیٰ کی شانِ عطا کو آواز دے تو اللہ تعالیٰ کے دل میں اس کے لیے محبت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جس طرح ایک حسین آئینے کی حفاظت کرتا ہے کہ وہ اس کے جمال کا مظہر ہوتا ہے، اسی طرح دینے والا مانگنے والے کی حفاظت کرتا ہے کہ وہ نہ ہو تو اس کے جذبۂ جود و سخا کو اپنے اظہار کا موقع نہ ملے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ناز گدا کے نیاز کو دیکھ کر مزید مائل بہ کرم ہوتا ہے اور وہ گدا کے دل کو گداز، اس کی آواز کو سوز اور اس کی پلکوں کو موتیوں سے بھی قیمتی آنسو عطا کرتا ہے تاکہ یہ دردناک آواز میں مسلسل پکارتا ہے اور وہ اُسے پیہم نوازتا رہے ؎

چھوٹے نہ گنہ مجھ سے، چھوڑا نہ کرم اس نے
بندہ ہو تو ایسا ہو ، مولا ہو تو ایسا ہو

اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا فرمایا۔ خالق، تخلیق کے حسن و قبح سے بخوبی واقف ہوا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کو ہماری بشری کمزوریوں کا بخوبی علم ہے۔ وہ ہماری تمناؤں کے لامتناہی سلسلے سے بھی کماحقہٗ آشنا ہے۔ بنابریں اس کی رحمت کا تصور، ہماری تمناؤں کو مجروحِ یاس نہیں ہونے دیتا بلکہ تر و تازہ اور پر بہار رکھتا ہے۔ حق یہ ہے کہ ہم اپنے اعمال کے سہارے نہ نجات کے آرزومند ہیں نہ جنت

کے مستحق بلکہ استحقاق کوئی سادعویٰ بھی نہیں ہے۔اعمال کے بارے میں غرور بھی اُسی ایک مغرور کا پیدا کردہ ہے جو خود ایک حکم نہ ماننے سے، معتوب اور مردُود ہو گیا تھا، اعمال پر تکیہ، عدل کو آواز دینا ہے جبکہ بگڑی، فضل ہی سے بنا کرتی ہے، اس یقین کے ساتھ سرخروئی اور کامیابی نصیب ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کا فضل، عدل پر حاوی اور رحمت، غضب سے کہیں وسیع ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور لطف و عنایت کا مستحق بننے کے لیے اُس ذاتِ اقدس ﷺ سے تعلق ضروری ہے جسے اس رحیم و کریم نے رحمت عالم بنا کر بھیجا ہے۔اُس رحمۃ للعالمین ﷺ کی اطاعت میں جس قدر بالیدگی آئے گی، تعلق میں اُسی قدر شگفتگی پیدا ہوگی اور یہی شگفتگی، اللہ تعالیٰ کے عدل کو فضل میں اور غضب کو رحمت میں بدل دے گی۔

O

☆

حمد بے حد ہے سزاوارِ خدائے دو جہاں
جس کا ذکرِ پاک ہے وجہِ قرار قلب و جاں

(راجا رشید محمود)

O

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عُذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ ﷺ پنہاں بگیر

اقبالؒ، بلال مشرق بھی تھے اور کلیم ایشیا بھی۔ وہ اللہ تعالیٰ سے کسی اور رنگ میں بات کرتے ہیں۔ تخلیق، خالق کے حضور میں سراپا سجود و سپاس بھی رہتی ہے اور بوجوہ شکوہ سنج بھی۔

اقبالؔ درج بالا رباعی کے پہلے دو مصرعوں میں عجز و نیاز کے سانچے میں ڈھل کر التماس کرتے ہیں کہ اے خالقِ کائنات! تو غنی ہے، بے نیاز ہے، سب تیرے محتاج ہیں اور تو کسی کا محتاج نہیں، تو روزِ حشر، میری لغزشوں سے صرف نظر فرما، اس عاجزانہ گزارش کے بعد اقبالؔ اپنے خاص شوخ لہجے میں کہتے ہیں کہ اگر حساب لینا ضروری ہی ہو تو پھر لے لینا اور پھر.....خود بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر۔ آخری دو مصرعوں میں تان یوں ٹوٹتی ہے کہ حساب کتاب کا یہ عمل سرورِ عالم ﷺ کے روبرو نہ ہو۔ ان کے سامنے اقبالؔ نادم نہیں ہونا چاہتا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شوخی ہے مگر فخرِ کائنات ﷺ کے حضور میں، دم بخود، نفس گم کردہ، کہ ادب کا یہ پیرایہ خالق کائنات ہی نے سکھایا ہے ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

میں حرم پاک میں اقبالؔ کی اس رباعی کا پہلا شعر ہی پڑھ سکا اور پڑھتا رہا۔ دوسرا شعر پڑھنے

کی ہمت نہ تھی کہ اقبالؔ کے دامن میں تو حساب کتاب کے لیے یقیناً کچھ ہوگا مگر اقبال جاویدؔ تو حسنِ عمل کے اعتبار سے تہی دامن تھا۔ اس کی لغزشیں اُسے خجالت و ندامت کا شدید احساس دلا رہی تھیں، وہ کیسے کہتا کہ حساب لے لے۔ کس برتے پر؟ عرصہ ہوتا ہے جناب حافظ لدھیانویؒ میرے ہاں تشریف فرما تھے۔ میں نے پہلے اُن کا یہ شعر پڑھا ؎

کچھ اشکِ ندامت ہیں مرے دامنِ تر میں
میں راہِ عدم کے لیے تیار بہت ہوں

اور پھر عرض کیا کہ حافظ صاحب! آپ کے پاس تو اشک ندامت ہیں اور آپ بڑے دھڑلے سے کہہ رہے ہیں کہ آپ راہ عدم کے لیے تیار ہیں، میں کیا کروں کہ میری آنکھیں تو آنسوؤں کو ترس گئی ہیں۔ حافظؔ شیراز کا شعر ہے ؎

خیرہ آں دیدہ کہ آبش نبرد گریۂ عشق
تیرہ آں دل کہ درو نور مؤدت نبود

''وہ آنکھ بے نور اور تاریک ہو جس کی چمک میں گریۂ عشق شامل نہیں اور وہ دل سیاہ ہو جس میں محبت کا نور نہ ہو۔''

رحمتِ دو عالم ﷺ کا فرمان ہے کہ عالم تنہائی میں کوئی شخص نادم ہو، اس کی آنکھوں کی نمی، اس کے رخسار کو چھو جائے تو اس چہرے کو جہنم کی آگ چھو نہیں سکے گی ؎

دیدۂ تر سے ڈھلک کے دامنِ رحمت میں تھا
لغزشِ مستانۂ اشکِ ندامت دیکھیے

قدرت اللہ شہابؔ نے کسی جگہ لکھا ہے کہ صدر ایوب خان، شاہی وفد کے ساتھ عمرہ پر جا رہے تھے انہوں نے اُن سے دعاؤں کی کوئی کتاب چاہی۔ کتاب دے دی گئی۔ چند لمحوں کے بعد صدر، ان کے پاس آئے اور کتاب واپس کر دی۔ استفسار پر کہا کہ ''مجھے میرے کام کی چیز مل گئی ہے میں تو اسی کا ورد کروں گا۔ وہ ایک مختصر مگر جامع دعا تھی۔

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیَ الْجَنَّۃَ مِنْ غَیْرِ حِسَابٍ.

میں بھی بغیر حساب، جنت کا طالب تھا۔ اس لیے دوسرا شعر کیوں پڑھتا۔ دعا، کھل کر مانگنا چاہیے۔ یہاں کمی کس بات کی ہے؟ یہاں تو عطاؤں کے ساتھ ساتھ تنگیٔ داماں کو بھی وسعت ملتی چلی جاتی ہے ؎

در سخی کا ہے، بہ توسیعِ تمنا مانگو
جس قدر مانگ سکو، اس سے زیادہ مانگو

دعا ہی وہ عظیم سہارا ہے جو انسان کو مایوس نہیں ہونے دیتا۔ دعا پر یقین، ایمان کی دلیل ہے۔ یہ یقین، بڑے نصیب کی بات ہے۔ دعا سے اعتماد اُٹھ جائے تو انسان کی زندگی ایک کربناک تنہائی کا شکار ہو جاتی ہے۔ دعا جیسے بھی مانگی جائے، جہاں بھی مانگی جائے اُسے سننے والا ہمیشہ قریب ترین ہوتا ہے۔ منگتے کے لیے سخی کے در سے تقرب کا واحد ذریعہ دعا ہے۔ دعا لفظوں میں بھی ہوتی ہے اور لفظوں کے بغیر بھی۔

کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیا کرتے ہیں لوگ
خامشی بھی ایک طرزِ گفتگو ہے دوستو

دل کی دھڑکن، روح کی لرزش، نظر کی تمنا اور آنکھ کا آنسو، دعا ہی کی جامع صورتیں ہیں کہ لفظ ان کا بدل نہیں بن سکتے۔ میرے نبیؐ پاک ﷺ کا بار بار آسمان کی طرف دیکھنا، دعا ہی تو تھا کہ قبلہ بدل دیا گیا اور اس ادائے پاک کو سند بنا دیا گیا۔

درج بالا رباعی اقبالؔ کی ہے بھی اور نہیں بھی۔ گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خاں میں محمد رمضان عطائی سینئر انگلش ٹیچر تھے۔ انہوں نے اس رباعی کو اپنانے کی آرزو کی۔ علامہ اقبالؔ نے ۱۹ فروری ۱۹۳۷ء کو انہیں ایک خط میں لکھا کہ ''آپ بلا تکلف وہ رباعی جو آپ کو پسند آ گئی ہے۔ اپنے نام سے مشہور کر دیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' علامہ اقبال نے اپنی زندگی میں کہہ دیا کہ یہ رباعی ''ارمغانِ حجاز'' میں شامل نہ کی جائے اور ''ارمغانِ حجاز'' میں اسی مفہوم کی درجِ ذیل رباعی شامل کر دی ؎

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہ ﷺ مارا
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

اقبال نامہ (مجموعہ مکاتیب اقبال) کے فاضل مرتب نے دونوں رباعیوں کا تاثراتی تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے ''مگر سچ یہ ہے کہ وہ بات پیدا نہیں ہو سکی، ایک شاعر کا ظرف اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ اپنا کلام یوں کسی کو دے کر اس سے تہی دست ہو جائے۔''

جناب محمد رمضان عطائی کے والد کا نام اللہ داد خاں تھا۔ عطائی کی وضع قطع فقیرانہ، چال ڈھال درویشانہ اور رنگ ڈھنگ صوفیانہ تھا۔ وہ خود شاعر بھی تھے اور علامہ اقبالؒ سے متاثر بھی۔ ایک دوست سے یہ رباعی سن کر اُن کی حالت متغیر ہوگئی تھی۔ اُنہی دنوں حج پر گئے تو یہی رباعی اُن کے وردِ زبان رہی۔ واپسی پر انہوں نے علامہ اقبالؒ کو لکھا ''آپ سُر ہیں، فقیر بے سُر، آپ اقبال ہیں اور فقیر مجسم ادبار، فقیر کی تمنا ہے کہ فقیر کا تمام دیوان لے لیں اور یہ رباعی مجھے عطا فرما دیں۔'' اُن کی التماس قبول ہوئی۔ عطائی دسمبر ۱۹۳۷ء میں ایم۔اے فارسی کا امتحان دینے لاہور آئے تو ایک دوست کے ساتھ علامہ اقبالؒ کو ملنے کے لیے گئے۔ دوست نے عطائی کے بارے میں کہا کہ ''یہ بوڑھا طوطا ایم۔اے فارسی کا امتحان دینے آیا ہے۔'' علامہ نے فرمایا ''عاشق کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔'' عطائی نے علامہ سے کہا کہ آپ مدینہ پاک جائیں تو وہاں ''میری یہ رباعی'' ضرور پڑھنا، یہ سن کر علامہ بہت روئے اور فرمایا کہ ''دربارِ نبوی ﷺ سے بلاوا تو آیا ہے مگر جانا نہ جانا برابر ہے، آنکھوں میں موتیا اُتر آیا ہے۔ یار کے دیدار کا لطف دیدۂ طلب گار کے بغیر کہاں؟'' پھر فرمایا ''عطائی! تم اس رباعی کو بہت پڑھا کرو، ممکن ہے اللہ تعالیٰ مجھے اس کے طفیل بخش دے۔'' محمد رمضان عطائی کے لوحِ مزار پر یہی رباعی کندہ ہے۔

O

☆

کیا ہوئیں، داورِ محشر! وہ خطائیں میری
کچھ نہیں فردِ عمل میں تری رحمت کے سوا

(فانی)

O

اب احتساب میرے گناہوں کا کس لیے
اب واسطہ دیا ہے تمہارے حبیب ﷺ کا

لغزش، غلطی اور گناہ، انسانی فطرت کا ایک لازم جز ہے۔ معصوم ذات انبیائے کرام کی ہے کہ وہ ہر لحظہ اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ہوتے ہیں اور الوہی ہدایت ان کے لیے براہِ راست حیثیت کی حامل ہوتی ہے، ان کا ہر لفظ، اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ادا ہوتا، ہر قدم اُسی کی ہدایت کے تحت اُٹھتا اور ہر عمل اسی کی رضا کے سانچے میں ڈھل کر ظہور میں آتا ہے۔ جبکہ ہمارا ہر لفظ اور ہر عمل، ہر لمحہ نظر ثانی کا محتاج اور مواخذے کی زد میں رہتا ہے۔ زبان کم کم دل کی رفیق ہوتی ہے یہی منافقت ہے۔ حق یہ ہے کہ اسی دوعملی نے ہماری دعاؤں کو بے تاثیر اور ہماری آہوں کو نارسا کر رکھا ہے ؎

معنی ہیں معدوم، تحریریں بہت
ہے عمل مفقود، تقریریں بہت
بغض دل میں، منہ پہ تعریفیں بہت
کفر دل میں لب پہ تکبیریں بہت
ایک اہلِ درد ہی ملتا نہیں
ورنہ دردِ دل کی تدبیریں بہت

اگر لفظ اور عمل دونوں میں حسن آ جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نوازش شمار ہوگی کیونکہ ہر خوبی، اُسی کی عطا ہے اور ہر خطا، ہمارا کارنامہ ہے، وہ لوگ جن کا ہر سانس اسی کی رضا کے تحت ہوتا ہے، جن کے روز و شب اسی کی حمد و ثنا کے لیے وقف رہتے ہیں اور جن کی زندگی کا ہر لمحہ اسی کی یاد میں گزرتا ہے۔ وہ بھی احتساب سے لرزتے رہتے ہیں کہ کوئی بھی احتساب کا سامنا نہیں کر سکتا۔ احتساب کے کڑے امتحان سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ انسان جوابدہی کے خوف سے، ہر قدم

پھونک پھونک کر اُٹھائے، فرائض کو ادا کرنے کی اپنی سی سعی اور خلقِ خدا سے محبت کی مقدور بھر کوشش کرے۔ غالبؔ کے شاگرد ہرگوپال تفتہؔ کا ایک خوبصورت شعر ہے ؎

چوں دمِ محشر، زمحشر، برخود عرصہ تنگ دید
تفتہ گریاں آمد و دامانِ پیغمبرﷺ گرفت

گویا دامانِ نبیٔ پاکﷺ سے وابستگی ہی دمِ محشر، تحفظ کی ضمانت ہے۔ اگر نبیٔ کریمﷺ کی ذات سے قلبی محبت نہیں اور اُن کے نقوشِ پا، مشعلِ راہ نہیں تو وابستگی کا ہر دعویٰ ایک لفظ ہے بے معنی اور ایک جسم ہے بے روح۔ اطاعتِ رسول پاکﷺ ہی، حبِ رسولﷺ ہے۔ اطاعت سے تہی، محبت، محض فریبِ نفس ہے۔ اِسی اطاعت کی بنیاد پر حضورﷺ ہمارا واسطہ بنیں گے، واسطہ، نام ہے نسبت اور تعلق کا، انسان مقدور بھر سنت پر عمل کرے، اس کے بعد نبیٔ کریمﷺ کی شفاعت ہماری لغزشوں کو ڈھانپ لے گی، نبیٔ کریمﷺ نے یہ کہہ کر کہ ''بُرے میرے ہیں'' ہمیں ایک حوصلہ دیا ہے اور مایوسیوں سے بچایا ہے۔ یہ نہیں کہ اس بھروسے پر، ہم زندگی کے میدان میں بگٹٹ اور بے لگام رہیں۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمارے نبیٔ پاکﷺ کے آنسو، ہماری مغفرت کے لیے وقف رہے ہیں۔ وہ آنسو جن کا ایک قطرہ کائنات سے افضل ہے۔ اُن کی دعائیں، ہماری نجات کے لیے اللہ کو پکارتی رہی ہیں۔ وہ دعائیں کہ اجابت جن کا انتظار کرتی ہے۔ حق یہ ہے کہ اُن کی رحمت ہی ہمارا سہارا اور اُن کی شفاعت ہی ہمارا آسرا ہے۔ درود پاک واحد وسیلہ ہے جس سے ہماری نوائیں باریاب اور التجائیں باب اثر سے سرخرو لوٹ سکتی ہیں اور ہمیں اسی واسطے سے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کو آواز دینا اور اس کی رحمت کو پکارنا چاہیے کہ بہتری اور نیکی کی سب صورتیں اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ برکتوں اور بلندیوں والا ہے۔ اُسی سے بخشش کا سوال کرنا چاہیے اور یہ دعا کرنا چاہیے کہ اے اللہ! ہمارے دین کو سنوار دے کہ اس میں ہمارا بچاؤ ہے۔ ہماری دنیا کو نکھار دے کہ اس میں ہماری گزران ہے ؎

اقلیمِ دو جہاں کے شہنشاہ، فضل کر
اللہ فضل کر، مرے اللہ فضل کر
عاصی ہوں، معصیت کے سمندر میں غرق ہوں
پھر بھی ہوں ایک بندۂ درگاہ فضل کر

O

بس اک داغِ سجدہ مری کائنات
جبینیں تری، آستانے ترے

حج ہو یا عمرہ، اداؤں کی پسندیدگی ہی کے مظاہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو بعض مقربین کی ادائیں اس لیے پسند آئیں کہ اُن کی اداؤں میں خلوص کا بانکپن شامل تھا۔ دل کی دھڑکنیں بھی تھیں اور روح کی لرزشیں بھی۔ انہی دھڑکنوں اور انہی لرزشوں نے ان اداؤں کو اس قدر حسین بنا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس کی پوری کائنات ان اداؤں سے تا ابد ماحول کو شادابی عطا کرتی رہے۔ یادوں کا گلزار کھلا رہے اور تاریخ ہر لمحہ خود کو دہراتی رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کہا گیا تھا کہ تعمیر بیت اللہ کے بعد، اس گھر کے طواف کے لیے آواز دو، اعلان کرو۔ ابراہیم علیہ السلام حیران ہوئے کہ کسے آواز دوں؟ میرا اعلان کون سنے گا؟ اس لق و دق صحرا میں، پہاڑوں کے اس سنگین سلسلوں میں؟ فرمایا گیا کہ آواز تم دو گے، اس آواز کو ہر ذی روح تک پہنچانا میرا کام ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی وہ سماعت نواز اور روح پرور آواز، آج ہر دل کی تڑپ اور ہر نگاہ کی آرزو بنی ہوئی ہے۔ ادھر آنے والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے ہر عمل کو روح عطا کریں وہ عمل محض جسمانی رسم ہو کر نہ رہ جائے کیونکہ جسم سے روح نکل جائے تو اس خوبصورت جسم کو منوں مٹی کے نیچے دبا دیا جاتا ہے۔ ہمیں احرام پہن کر کفن کو یاد کرنا ہے۔ طواف ایک مرکز سے وابستگی کی علامت ہے۔ زمزم پینا ہی نہیں، اسماعیل علیہ السلام کی تڑپ اور ہاجرہ کی متوکلانہ تگ و دو کو بھی پیش نظر رکھنا ہے۔ سعی بھی مامتا کی بے چین اداؤں کی ایک یاد ہے۔ حلق، نفس کی غلامی سے آزادی کا ایک استعارہ ہے۔ قیام منیٰ، اس خیال کو

تازہ کرتا ہے کہ یہی آباد میدان، کل بے آباد ہوگا اور دن یونہی ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ میدان عرفات میں، توبہ واستغفار اسی لیے ہے کہ یوم حشر، پوری خلقت ایک ہی فطری لباس میں، ایک ساتھ اُٹھے گی، قیام مزدلفہ عذاب الٰہی سے پناہ مانگنے کا مقام ہے کہ وقت کے تبختر کو خاک میں ملانے کے لیے ننھے ننھے پرندے ہی کافی ہیں، جمرات پر سنگ زنی، اپنے نفس کی سرکوبی ہے۔

قربانی بھی اسی ادا کی یاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں محبوب ترین بیٹے کی گردن پر بھی چھری رکھنے سے گریز نہیں ہونا چاہیے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی فرمانبرداری، اطاعتِ پدر کا ایک دلنواز اشارہ ہے ؎

سلام ان پہ، تہِ تیغ بھی جنھوں نے کہا
جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے

احرام اُتارتے وقت یہی سوچنا ہے کہ ایک بار پھر دنیا میں جانا ہے، وہاں جا کر دنیا کو نہیں اس کفن کی کیفیت کو پیش نظر رکھنا ہے اور انداز یہ کہ ؎

دنیا میں ہوں، دنیا کا طلبگار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

معاف کیجیے، بات اِدھر سے اُدھر چلی گئی، حالانکہ بات عدمؔ کے درج بالا شعر ہی کے گرد گھومنا چاہیے تھی۔ غزل کا شعر، خوبصورت خیال کو اظہار کی دل آویز ادا دیتا ہے اور دل کے جذبات کو زبان عطا کرتا ہے۔ ؎

غزل سوز دروں کی آنچ سے لفظوں میں ڈھلتی ہے
فقط رنگینیٔ حسنِ بیاں سے کچھ نہیں ہوتا

بے نام وادیوں میں شاعروں کا بھٹکنا اور بے لگام خیالات کو شعر بنانا، اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ معقول اور معتدل اشعار کی وہاں بھی قدر ہے۔ درج بالا شعر اس عاجز کے عجز بیان کو اظہار کا اسلوب دیتا رہا کہ اے قادر مطلق! تو نے اپنے پیاروں کی پیاری اداؤں کو زندہ و پایندہ رکھنے کے لیے یہ محفل آراستہ کی ہے، سب کچھ تیرا ہی ہے۔ تو ربوبیت، الوہیت، اسمائے حسیں اور صفات رفیع کے اعتبار سے یکتا و تنہا ہے۔ حضرت محمد ﷺ تیرے آخری رسول ہیں اور انھی کی شریعت قابل اتباع ہے۔ یہ آستانہ بھی تیرا ہے۔ سجدہ ریز جبینیں بھی تیری ہیں۔ میری کائنات تو محض ایک داغِ سجدہ ہے۔ یہ بہاریں، یہ آشیانے سب تیرے ہیں۔ میں تو ایک جلوہ لے چلا ہوں، اپنی نگاہوں

میں سمیٹ کر، تیرا بلانا اور میرا آنا، یہ سب شگفتہ شگفتہ بہانے ہیں، میری بخشش کے لیے، ورنہ میری نوائیں بھی ادھوری اور میری دعائیں بھی بے روح۔

بنتِ امیرِ شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، سیّدہ ام کفیل بخاری سے روایت ہے کہ مارچ ۱۹۵۹ء میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے سیّد عبدالحمید عدم ملتان آئے تو شاہ صاحب سے ملاقات کے لیے، حافظ لدھیانوی کی معیّت میں، اُن کے گھر بھی آئے، انھوں نے کئی غزلیں سنائیں..... اُن میں یہ غزل بھی تھی جس کا درجِ بالا شعر، حرمِ پاک میں مجھے یاد آتا رہا۔ عدم نے اِس غزل کا جب یہ شعر پڑھا ؎

ضمیرِ صدف میں کرن کا مقام
انوکھے انوکھے ٹھکانے ترے

تو سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے بے ساختہ فرمایا:

''ظالم! یہ تُو نے حمد کہہ دی ہے۔''

یہ تبصرہ سن کر عدم جُھوم گئے، کہنے لگے:

''شعر کا یہ مفہوم تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، شاہ جی! آپ نے میرے شعر کو بہت بلندی عطا کر دی ہے۔''

O

☆

میں شجر ہوں شہرِ ملال کا، مری ٹہنیوں کو نہال کر
کبھی بھیج اپنی نوازشیں، کسی جامِ ابر میں ڈال کر

(اظہار ادیب)

O

زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے، جامۂ احرام بہت ہے

اقبالؒ، بانگ درا میں مرزا غالب کی فکری رفعتوں اور شعری عظمتوں کا یوں اعتراف کرتے ہیں ؎

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا، رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دِلّی، گُلِ شیراز پر
آہ، تُو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

غالب، درج بالا شعر میں طوافِ کعبہ کے لیے بے چین ساتھیوں سے کہتے ہیں کہ مجھے زمزم ہی پر چھوڑ دو، میرا احرام شراب آلودہ ہے۔ میں اسے زمزم سے دھو کر پاک کر لوں کہ طوافِ کعبہ سے قبل کم از کم لباس کی پاکیزگی تو ہو..... آلودگی کو پاکیزگی میں بدلنے کے لیے زمزم سے دھونے کی آرزو..... کہ زمزم

- انتہائی مصفّٰی ہے۔
- جسمانی اور روحانی عوارضات کے لیے شافی وکافی ہے۔
- دل اور زبان سے ابھرنے والی ہر آرزو کو بابِ قبول تک لے جاتا ہے۔
- ہلکا، نمکین، ٹھنڈا اور خوشبودار ہے۔

- انتہائی زود ہضم ہے۔
- پیاس ہی نہیں، بھوک بھی دُور کرتا ہے۔
- بے چینیوں کو سکون عطا کرتا ہے۔
- صاف برتن میں ہو تو سالہا سال تک نہ اس کا رنگ بدلتا ہے نہ ذائقہ۔
- تاثیر کے اعتبار سے تریاق، اکسیر اور تیر بہدف ہے۔
- سائنسی تحقیق کے مطابق مگنیشیم سلفیٹ، سوڈیم سلفیٹ، سوڈیم کلورائیڈ، کیلشیم کاربونیٹ، پوٹاشیم نائٹریٹ اور ہائیڈروجن سلفائیڈ کا مجموعہ ہے۔ یہ اجزاء بے شمار جسمانی بیماریوں کے لیے وجہِ شفا ہیں۔
- اس میں موت کے سوا ہر بیماری کے لیے شفا موجود ہے۔
- طہارت، لطافت، نظافت اور سعادت کی بہترین کیفیتوں کا حامل ہے۔

اور اسی لیے

جبریلؑ نے نبیٔ اکرم ﷺ کے دل کو مصفّٰی اور مطہّر کرنے کے لیے دنیا سے جو شے لی تھی وہ زمزم ہی تھا۔ یہ واقعہ آپ ﷺ کے دورِ رضاعت سے متعلق ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ

''آپ ﷺ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت جبریلؑ تشریف لائے اور آپ ﷺ کو لٹا کر سینہ چاک کر دیا، پھر آپ ﷺ کا دل نکالا اور اس میں سے ایک لوتھڑا نکال کر فرمایا ''یہ تم سے شیطان کا حصہ ہے'' پھر دل کو سونے کے طشت میں زمزم کے پانی سے دھو کر جوڑ دیا اور اُسی جگہ پلٹا دیا۔ ادھر بچے دوڑ کر آپ ﷺ کی ماں یعنی حلیمہ سعدیہ کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ ''محمد ﷺ قتل کر دیا گیا'' وہ لوگ جھٹ پہنچے تو دیکھا کہ رنگ اترا ہوا تھا۔''

حضرت انسؓ کا یہ بھی بیان ہے کہ ''میں نبی ﷺ کے سینے پر سلائی کا اثر دیکھا کرتا تھا۔''

حدیث پاک ہے کہ ''زمین پر سب سے بہتر پانی آب زمزم ہے۔''

اور

یہ بھی ایک تاریخی صداقت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبیٔ کریم ﷺ کے لیے چاہِ زمزم سے پانی کا ایک ڈول نکالا گیا۔ آپ ﷺ نے نوش فرمایا اور ڈول میں بچ جانے والے پانی میں، اپنی مبارک کلّی ڈال دی اور ارشاد فرمایا کہ اسے چاہِ زمزم میں ڈال دیا جائے، گویا ہم گنہگار خوش

نصیب ہیں کہ نبیٔ پاک ﷺ کا پیا ہُوا پانی، پی رہے ہیں۔ وہ نبیٔ پاک ﷺ جن کے لعابِ دہن کے ساتھ اعجاز آفرین واقعات وابستہ ہیں۔

اور

حضور ﷺ نے آبِ زمزم کو کھڑے ہو کر نوش فرمایا تھا اور اس موقع پر یہ خصوصی دعا مانگی تھی

''اے اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں، علم نافع، رزق واسع اور تمام بیماریوں سے شفا۔ (ترجمہ)''

یاد رہے کہ

رسالت مآب ﷺ کی زبانِ صدق اظہار نے علم کو دلوں کی روشنی اور نگاہوں کا نور قرار دیا ہے۔ علم میں جاننے کے ساتھ ساتھ پہچاننے کا مفہوم بھی ہے۔ اِسی پہچان سے حقیقتوں کا کماحقہٗ ادراک ہوتا ہے اور یہ ادراک انسان کے احساس کو یقین اور یقین کو ایمان تک لے جاتا ہے۔ علم کا درجہ شعور و عرفان سے کہیں وسیع و رفیع ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کو عالم کہتے ہیں، عارف نہیں، ادراک، مقام یقین تک پہنچ جائے تو وہ علم بن جاتا ہے۔ نبی کو علم، وحی کے ذریعے وہ ذاتِ پاک عطا کرتی ہے جو بہر نوع عالم بھی ہے اور علیم بھی۔ جبکہ دوسرے انسان اپنی اُس استعداد سے اسرار و رموز کی تہ تک پہنچنے کی سعی کرتے رہتے ہیں جو پہلے دن اللہ تعالیٰ نے ان کی سرشت میں رکھ دی تھی۔ زمزم سے متعلق دعا میں ایسے ہی علم کی التجا ہے جو روشنی، نور اور اُجالا ہے جو بصارت کو بصیرت بنا دیتا ہے، جو زبان کو سچائی بھی دیتا ہے اور دل کو رعنائی بھی۔ جو بہر آئینہ نافع ہے اور عمل کو انوار کا ہالہ بنا کر انسان کو عرفان حق عطا کرتا ہے۔

جہاں تک رزق کا تعلق ہے، ہر نفع بخش شے رزق کہلاتی ہے۔ خواہ وہ رزق خوراک کی شکل میں انسانی جسم کو نشو و نما دے، خواہ بارش کی صورت میں زمین کی ویرانی کو شادابی عطا کرے۔ خواہ ہوا کے انداز میں حدّت کی شدّت کو فرحت میں بدلے، خواہ لالہ و گل بن کر نگاہوں کو سرور بخشے، سورج کی روشنی ہو یا چاند کی طباشیری کرنیں، شفق کی سرخی ہو یا ستاروں کی چشمک، گفتار کی سچائی ہو یا رفتار کی رعنائی، کردار کا کمال ہو یا اخلاق کا جمال، سب رازق کی عطاؤں ہی کے ہر لمحہ پھلتے، پھولتے اور پھیلتے سلسلے ہیں۔ چونکہ زندگی کا تسلسل، موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے،.....طولِ محشر بھی ہے جزوِ داستانِ زندگی..... دنیاوی زندگی ہو یا اُخروی، ہر مقام پر انسان کو جس رنگ اور آہنگ کے ساتھ سامانِ زندگی ملتا ہے، اُسے بھی رزق ہی سے موسوم کیا جاتا ہے، گویا رزق سے جسم، ذات اور روح سبھی فیضیاب ہوتے ہیں، رزقِ الٰہی کے سرچشمے سب کے لیے کھلے ہیں۔

انسان ہو یا حیوان، پتھر میں بند کیڑا ہو یا فضاؤں میں محوِ پرواز پرندہ، رزق ہر ایک تک پہنچتا ہے .....حق یہ ہے کہ رزق بٹنے اور بانٹنے سے بڑھتا ہے۔ رزق کی یہی وہ وسعت ہے جس کی طلب زمزم پیتے وقت کی جاتی ہے کہ وہ بھی قبولیتِ دعا کا وقت ہوتا ہے۔

دعا میں آخری التجا، شفائے امراض کی ہے۔ عناصر میں ظہورِ ترتیب رہے تو زندگی، یہ ترتیب بگڑ جائے تب بیماری اور بکھر جائے تو موت، مرض جسم کو ضعف و ناتوانی دے کر مضمحل کر دیتا ہے سورج کو گرہن لگ جائے یا اس پر بادل چھا جائیں، تو وہ سورج بھی مریض ہے، وہ زمین بھی مریض ہے جس میں قوتِ روئیدگی کی کمی ہو۔ اسی طرح وہ دل بھی مریض ہیں جن کی بینائی کو شک اور نفاق نے دھندلا رکھا ہو، دل اندھے ہو جائیں تو سینے تاریک ہو جایا کرتے ہیں، قرآن انہی اندھیروں کو اُجالا عطا کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔ شفاء لما فی الصدور.....اور زمزم جملہ جسمانی اور قلبی بیماریوں کے لیے وجہِ شفا ہے۔

اقبالؒ، بیت اللہ کو قومی زندگی کا مرکز قرار دیتے ہوئے، کہتے ہیں کہ بیت اللہ ہمارا راز بھی ہے اور رازدار بھی۔ اس سے ہماری جان میں سوز بھی ہے اور ساز بھی۔ ہم اس سینے میں سانس کے مانند پرورش پاتے ہیں، ہم بدن ہیں اور وہ ہماری جان شیریں.....اور ؎

تازہ رو بستانِ ما از شبنمش
مرزعِ ما آب گیر از زمزمش

راقم الحروف ۱۹۹۸ء میں اہلیہ اور بیٹی کے ہمراہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوا، تب میری اہلیہ بوجوہ علیل تھی۔ معالج نے اس کو ڈیپریشن سے بچاؤ کے لیے ایک نشہ آور دوا کا عادی بنا رکھا تھا اور ہدایت کی تھی کہ ۴۰ دن کی دوا ساتھ ہو اور اُسے باقاعدہ استعمال کیا جائے۔ ایک شاگرد ڈاکٹر نے مجھے مشورہ دیا کہ دوا تو ضرور ساتھ لے جائیں مگر وہاں یاد نہ دلائیں اور آبِ زمزم خوب خوب پلائیں یقین کیجیے کہ آبِ زمزم کے فیض سے، تب سے اب تک، دوا کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی ؎

زمزم کی کیا ہی شان ہے اور کیا ہی بات ہے
سرچشمۂ مراد ہے، آبِ حیات ہے
جس مقصدِ عظیم کی خاطر بھی پیجیے
سمجھو وہ کام ہو ہی گیا، شکر کیجیے

حق یہ ہے کہ اس وقت زندہ معجزے دو ہی ہیں، ایک قرآن پاک اور دوسرا آبِ زمزم کہ نبیٔ پاک ﷺ کی ولادت سے ۲۵۷۲ سال پہلے، حضرت جبریلؑ کے پر کی ٹھوکر سے پھوٹنے اور ابلنے والے اس چشمے نے نہ صرف حضرت اسماعیلؑ کی پیاس بجھائی بلکہ اس وقت سے لے کر اب تک ایک دنیا کو سیرابی عطا کرتا چلا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے، ۱۳ میٹر گہرا چاہِ زمزم، ۴۰۰۰ سال سے، بہر اعتبار محفوظ ہے۔ یہ تب سے اَب تک نباتات کی روئیدگی اور پھپھوندی تک سے پاک ہے۔ بھاری مشینری کے ذریعے، اس سے ۸۰۰۰ لٹر پانی، فی سیکنڈ نکلتا ہے اور ۲۴ گھنٹوں کے بعد، ۱۱ منٹ کے اندر اندر پانی اپنی سطح بحال کر لیتا ہے۔

یاد رہے کہ ۹۰۹ء میں چاہِ زمزم چھلک کر بہہ نکلا تھا اور متعدد حاجی اس میں ڈوب گئے تھے۔

O

☆

ہر کہ آب از زمزمِ ملت نخورد
شعلہ ہائے نغمہ در عودش فسرد

O

یہی میری بندگی ہے، یہی میری سجدہ ریزی
ذرا میں لپٹ کے رولوں، ترے سنگِ آستاں سے

مجھے جب بھی ملتزم سے لپٹنے اور وصیدِ در سے چمٹنے کا موقع ملا تو بے ساختہ یہ شعر سب سے پہلے زبان پر آیا اور بار بار آیا اور اس شعر کی عطا کردہ، کیف افزا فضا میں، اس عاجز نے اپنے لیے اور جملہ متعلقین کے بارے میں رو رو کر التجائیں کیں۔ جو لطف ملتزم سے لپٹ کر، اللہ تعالیٰ کو پکارنے اور اس کی رحمت کو عرش سے فرش پر لانے میں ہے۔ وہ کسی اور مقام پر کم کم نصیب ہوتا ہے۔ ملتزم پر آہ وفغاں کو کبھی نارسائی کا احساس نہیں ہوا ؎

آتے ہیں بامِ عرش پہ سو بار زلزلے
اک آہِ زیرِ لب کا اثر کچھ نہ پوچھیے

میں نے وطنِ عزیز کی بے حالی کو بالخصوص اور امت مسلمہ کی بدحالی کو بالعموم مالک کائنات کے حضور میں پیش کیا کہ مولا کریم، ہماری لغزشوں سے صرف نظر فرما، اور ہم پر رحم فرما کہ ہماری رُتیں بے ثمر اور آہیں بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں ؎

جسے ارماں کا خوں دے کر بنامِ آرزو سینچا
خدا جانے کہاں ہے وہ جہانِ زندگی آرا

اکثر ایسا ہوا کہ آنسو محوِ فریاد رہے اور زبان پر چُپ لگی رہی اور ایسا بھی ہوا کہ زبان محوِ فغاں رہی اور آنسو اس جلتی کو بجھانے کی اپنی سی سعی کرتے رہے۔ آنسو، موتی ہی تو ہیں جنہیں درِ ناز پر نچھاور کرنے ہی کے لیے رکھا تھا۔ یہ دردِ دل کی ترجمانی کا ایک سچا اظہار ہیں اور بیانِ غم کو ایک

سلیقہ عطا کرتے ہیں۔ایک شاعر نے آنسو کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ؎

قاصر زبان ہوتی ہے جب عرضِ حال سے
بنتا ہے ترجمانِ دلِ بے قرار تُو

لفظ بے کیف ہو سکتے ہیں۔وہ ابہام وایہام سے بات کو اُلجھا سکتے ہیں مگر آنسوؤں کا اظہار، ہمیشہ جامعیت کے حسن کا حامل رہا ہے کہ وہ منافقت کے ساتھ پلکوں پر لرز ہی نہیں سکتے۔یہ ایک فطری امر ہے کہ دل میں درد پیدا ہوگا تو وہ درد آنسو بنے گا۔غم کی گھٹا اُمڈے گی نہیں تو برسے گی کیسے؟ آنسو رُک جائے تو انگارا ہے۔بہہ جائے تو دریا ہے ؎

یہ پانی ہے مگر مژگاں کی شاخوں پر سلگتا ہے
یہ موتی ہے مگر دامانِ دریا میں نہیں رہتا

ملتزم پر بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان، سوچتا رہا کہ کتنے ہی باصفا انسانوں کے رخساروں نے دیوار کے اس مختصر سے ٹکڑے کو چُھوا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کائنات کے عظیم الشان انسان اور جملہ انبیاء کے سردار ﷺ اس سے لپٹ کر، ہمارے لیے محو دعا رہے ہیں۔سوچ کا اسلوب اور نظر کا انداز بدل جائے تو منظر تبدیل ہو جایا کرتا ہے۔

ملتزم ہی وہ مقام ہے جہاں دل کا سارا اضطراب نوکِ مژہ پر تُل جاتا ہے اور ملتزم سے الگ ہونے کے بعد انسان خود کو ہلکا ہلکا محسوس کرتا ہے۔جیسے غم کا غبار چھٹ سا گیا ہو اور عمر بھر کی بے قراری کو قرار سا آ گیا ہو، جیسے آنسوؤں کو پذیرائی نصیب ہوگئی ہو اور التجاؤں کو مستجاب ہونے کا مژدہ مل گیا ہو۔ایک پر کیف سرخوشی، ایک طمانیت بخش سکون، جسے کوئی سا لفظی پیرایہ بھی کماحقہٗ بیان نہیں کر سکتا ؎

من عاجزم زگفتن و خلق از شنید نش

روایت ہے کہ امام بخاریؒ کی والدہ نے اللہ کے راستے میں وقف کرنے کے لیے بیٹے کی آرزو کی۔بیٹا ملا مگر نابینا۔ماں اسی ملتزم سے لپٹ کر روئی کہ اللہ! تیرے راستے میں اس نابینا کو کیا وقف کروں۔آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان ماں کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا تھا کہ اے اللہ! پھر کہہ دے کہ تیرے خزانے میں آنکھیں نہیں ہیں؟'' نتیجہ معلوم کہ نہ صرف اس نابینا بچے کو بینائی ملی بلکہ وہ تمام دنیا کو بینائی دے گیا۔

O

ستارے کانپ کر پلکوں سے دامن میں اُتر آئے
چراغاں میں سنی، 'میرے خدا' نے داستاں میری

''ستارے'' پلکوں پر لرزنے اور چمکنے والے آنسوؤں کے لیے ایک خوبصورت استعارہ ہیں۔شعر جو طرازِ عنوان ہے وہ میرے لیے ایک تلمیح کی حیثیت رکھتا ہے کہ ۱۹۹۸ء میں، جب اللہ پاک مجھے حج کے لیے مکہ معظّمہ لے گئے۔ مکہ میں قیام کو دو تین دن گزرے تھے۔ میں باب ملک عبدالعزیز کے اندر واقع قدیم برآمدے میں ایک ستون سے ٹیک لگائے، نگاہوں کی عبادت میں مصروف تھا کہ گوجرانوالا کے ایک دوست جناب سعید کشمیری احرام باندھے تیزی سے گزرتے دکھائی دیئے۔ وہ باب صفا کی طرف سے، غالباً سعی کے بعد آ رہے تھے۔ میں نے انہیں آواز دی، وہ رُکے، مجھے پہچاننے میں انہیں چند لمحے لگے، خوش ہوئے۔ میں نے عرض کی کہ ایک لمحہ میرے پاس بیٹھ جائیں۔ وہ بیٹھ گئے میں نے کہا کہ جہاں ہم دونوں بیٹھے ہیں اس سے بہتر مقام کوئی اور نہیں ہے اور اس سیاہ شمع کے گرد سفید پروانوں کا طواف بھی ایک ایسا منظر ہے کہ ویسا منظر نگاہوں کو کہیں اور میسر نہیں آ سکتا۔ آیئے! اس دُھلی دُھلی اور اُجلی اُجلی فضا میں اپنے دو دوستوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ اُن کے استفسار پر میں نے، آغا شورش کاشمیری اور جناب راز کاشمیری کا نام لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں توفیق بخشی اور ہم دونوں نے اُن دونوں کے لیے آنسوؤں اور ہچکیوں کے ساتھ، دعائے مغفرت کی۔ وہ منظر مجھے بھولتا ہی نہیں۔ دعا کے دوران میں، درج بالا شعر بہ تصرف ادنیٰ خیال کے اُفق پر لَو دیتا رہا۔ اس کے بعد جب بھی حاضری کی توفیق ملی، مجھے یہ شعر اکثر یاد آیا۔ ہر بار اس شعر نے ایک خاص کیف عطا کیا۔

اللہ پاک نے بھی بہت سی دعائیں سکھائی ہیں اور نبیٔ پاک ﷺ نے بھی۔ یہ دعائیں یاد ہونی چاہئیں۔ اپنے مفہوم کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ توفیق دے تو نماز تہجد میں، تشہد کی حالت میں، سلام پھیرنے سے پہلے۔ ان دعاؤں کو شاملِ نماز کر لینا چاہیئے۔ میں اگر شعر کی بات کرتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی، شاعری ہی کرتا رہے۔ بات خود پر ایک خاص کیفیت طاری کرنے کی ہے وہ جو کسی نے کہا کہ دعا وہ ہے جس کے کیف میں بدن کا رُواں رُواں اپنی لے ملا دے۔ کیا کیا جائے، ہماری نماز بھی ایک مشینی عمل ہے اور دعائیں بھی۔ مقصود ذہنی ارتکاز کے ساتھ، زبان، دل اور جسم تینوں کی ہم آہنگی ہے۔ اس آہنگ کے بغیر ہر عمل بے رنگ ہے ؎

وہ نغمہ خام ہے، وہ مغنّی ہے ناتمام
جو سوزِ دل کو سازِ رگِ جاں نہ کر سکے

دعا قبول ہو جائے تو اس احسان کی قدر کرو اور محسن کو شکر و سپاس کے ساتھ یاد کرتے رہو اور یاد رہے کہ دوسروں کے لیے دعا کرنے والے، پہلے خود نوازے جاتے ہیں۔ ایک خطا کار کے لیے لازم ہے کہ وہ دوسرے خطا کاروں کو بھی یاد رکھے۔ دعا میں جمع کا صیغہ ضروری ہے کہ سب کا بھلا ہو، سب میں ذات بھی شامل ہے اور کائنات بھی۔ دل محبت سے لبریز ہو تو انسان خود کو بھول کر، دوسروں کو یاد رکھتا ہے۔ صاحبِ دعا، ہونے کے لیے صاحبِ محبت ہونا ضروری ہے۔ جذبۂ خلوص و محبت کے بغیر دعا، بابِ اثر تک پہنچتی ہی نہیں، پہنچ جائے تو سرخرو لوٹتی نہیں ؎

کس عجز سے پہنچی تھی دعا، بابِ اثر تک
کس شان سے لوٹی ہے دعا، بابِ اثر سے

اللہ تعالیٰ، اپنے بندوں کے لیے، ماں باپ سے بھی کہیں زیادہ مہربان ہیں۔ وہ خود ہی بلاتے ہیں، حاضری کے بعد خود ہی حضوری کے اسلوب سکھاتے ہیں۔ خود ہی دعائیں تعلیم کرتے ہیں۔ خود ہی معاف کرتے ہیں اور خود ہی خوش بھی ہوتے ہیں۔ کسی طور بھی افسردگی کی ضرورت نہیں کہ وہ پژمردگی کا پیش خیمہ ہے۔ یاد رہے کہ دعا کو قبولیت کا اعزاز، ندامت کے آنسوؤں ہی سے ملا کرتا ہے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

O

می تو انی کہ دہی اشکِ مرا حسنِ قبول
اے کہ دُر ساختہ ای، قطرۂ بارانی را

یہ شعر بھی اکثر دہرایا جاتا رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حرمِ کعبہ میں، دل کی گہرائیوں سے اُبھرنے والی ہر صدا، خیال کے اُفق پر لہرانے والا ہر شعر اور پلکوں پر لرزنے والا ہر موتی، قبولیت کا شرف پا کر ہی اظہار کی دنیا میں آیا کرتا ہے۔ ورنہ نہ زبان کو توفیقِ ثنا ملتی ہے اور نہ ہاتھ کو توفیقِ دعا۔ نہیں معلوم کہ یہ شعر کس کا ہے مگر مجھے اس بات کا علم ہے کہ میں نے اسے ''مکتوباتِ مجددؒ'' میں ایک سے زائد مقام پر پڑھا ہے ممکن ہے شیخ سرہندؒ کا اپنا ہی ہو، کیونکہ صوفیائے کرامؒ اور اولیائے عظامؒ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فکر کی پاکیزگی اور عمل کے تقدس کے ساتھ ساتھ، اظہار و بیان کی موزونیت بھی لے کر آتے ہیں اور شعر، کلام موزوں ہی کا دوسرا نام ہے۔ صوفیا میں سے اکثر شعری صلاحیتوں سے بھی متصف رہے ہیں مگر وہ شعر گوئی کو باقاعدہ اختیار نہیں کرتے۔ اللہ والوں کے ملفوظات میں مستعمل اشعار پڑھ کر، شعر کا مفہوم نکھرا نکھرا نظر آتا ہے اور بسا اوقات اُن کے ذوقِ سلیم اور شعر کے حسنِ استعمال پر حیرت سی ہوتی ہے۔ یہ کہنے والے اور لکھنے والے کا اپنا ذوق ہے کہ وہ شعر کے آہنگ کو کون سا رنگ عطا کرتا ہے۔

مسجد حرام میں حاضری، نماز، طواف اور ذکر سے عبارت ہے۔ نماز پریشاں حال لوگوں کا ایک عظیم سہارا ہے اور استعانت و نصرت کا ایک خوبصورت ذریعہ ہے۔ طواف محبت بھرے دل کا وہ والہانہ پن ہے جس پر فرزانگی کی ہزاروں ادائیں قربان کی جاسکتی ہیں۔ گھومنا، جھومنا اور چومنا اس والہانہ پن کی دلکش ادائیں ہی تو ہیں اور ذکر، حمد و ثنا کی جملہ کیفیتوں کو محیط ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ

کے روز و شب اللہ تعالیٰ کے ذکر، اس کی تسبیح، اس کی حمد، استغفار اور شکر و سپاس سے عبارت رہے۔ ہر ساعت ذکر سے معمور رہی۔ آپ ﷺ نے ذکر کی ان کیفیات کو لفظی پیرہن بھی دیا۔ خود بھی استغفار کا اہتمام فرمایا اور اس کی تلقین بھی کی اور احساس کی ہر کیفیت کے لیے جامع دعائیں بھی تجویز فرمائیں کہ آپ افصح العرب اور جوامع الکلم تھے۔

مسنون دعاؤں میں عبدیت کا اعتراف، خلوص کا اعتبار، محبت کا اظہار، شکر کا جذبہ اور توکل کی عظمت، منتہائے کمال پر پہنچ کر جلوہ گر ہے۔ اُن کا کوئی اور بدل ہی نہیں ہے کہ وہ مسلّم بھی ہیں اور مستند بھی۔ مقبول ہیں اور مبرور بھی۔ ان دعاؤں کا ساتھ اگر آنسو دینا شروع کر دیں تو پھر دل کو سکینت کا وہ احساس نصیب ہوتا ہے جو انسان کو مدتوں مسحورِ لذت رکھتا ہے ؎

کہہ جاتے ہیں اک سانس میں برسوں کے فسانے
جب آنکھ کے گوشوں سے ڈھلک جاتے ہیں آنسو

۱۹۹۸ء میں مجھے بیت اللہ اور زیارت مسجدِ مصطفےٰ ﷺ کی توفیق ملی، اسی سال جناب اسد رضا (سابق سیشن جج) پاکستانی وفد کے ساتھ مکہ آئے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی مکہ میں موجودگی کا علم نہ تھا۔ وہ پاکستان سے میری ایک تالیف مخزن نعت، اپنے ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے مکہ سے مجھے ایک خط لکھا کہ ''آپ کی تالیف نے مجھے یہاں حالِ دل کے لیے الفاظ دیئے ہیں۔ میں اسے حرم میں پڑھتا رہتا ہوں اور روتا رہتا ہوں اور آپ کے لیے دعا گو بھی رہتا ہوں۔'' اُن کا مکتوب مجھے گوجرانوالا واپسی پر ملا۔ میں نے مکہ معظّمہ کے پتے پر انہیں جواباً لکھا کہ آپ کو تو ''مخزنِ نعت'' نے الفاظ دے دیئے مگر اس کے مؤلف کو تو وہاں اظہار کے لیے لفظ ملے ہی نہیں۔ آنسو، ترجمانِ دلِ بے قرار ضرور بنتے رہے اور یہ آنسو بھی، حضورِ حق ہی سے عطا ہوتے ہیں۔ ورنہ کتنی ہی آنکھیں ہیں جو سراب ہیں۔ حق یہ ہے کہ آنسو زبانِ بے زبانی سے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں وہ پانی ہیں مگر پلکوں کی شاخوں پر سلگتے ہیں، وہ موتی ہیں مگر دامانِ دریا میں نہیں بلکہ آنکھوں کے صدف میں مقیم و مکنون ہوتے ہیں، انہیں بہنا چاہیے کہ ان کے بہہ جانے سے دل کا غبار چھٹ سا جاتا ہے ؎

مرتب کر رہا ہوں آنسوؤں کو اور آہوں کو
کہ میری زندگی کی داستاں تیار ہو جائے

زیبِ عنوان شعر میں بھی یہی آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ رحمت جو قطرۂ باراں کو موتی بنانے

پر قادر ہے وہ میرے آنسوؤں کو بھی شرف قبول یقیناً بخشے گی اور یہ آنسو، اظہارِ ندامت ہی تو ہیں ۔

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو، جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
اک بار خطا ہو جاتی ہے، سو بار ندامت ہوتی ہے

اِسی لیے اسلام نے دل کی زندگی پر زور دیا ہے۔ آخرت میں بھی انہی لوگوں کی پذیرائی ہوگی جو قلب سلیم لے کر حاضر ہوں گے۔ عقل کی طرفہ کاریاں لے کر حاضر ہونے والوں کا کوئی مذکور نہیں۔ دل کو قیل و قال سے زندگی نہیں ملتی۔ اِس کھیتی کو سرسبز و شاداب کرنے کے لیے آنسوؤں کا پانی درکار ہے اور آنسوؤں کا پانی عقل کے دامن میں نہیں، یہ رِم جھم محبت کی زمین سے اُٹھنے والے بادلوں کے خرام کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آنکھوں سے جب ندامت کے آنسو برستے ہیں تو گناہوں کی گرد دُھل جاتی ہے، دل کی فضاؤں میں نیا حسن اور نیا بانکپن پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ گناہوں سے توبہ کرنے والا یوں پاک ہو جاتا ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ نئی بہار کے آنے کے بعد چمن کی رعنائیاں خزاں کے اثرات زائل کر دیتی ہیں۔ توبہ بھی حیاتِ انسانی کے مرغزاروں میں نئی بہار کی حیثیت رکھتی ہے۔

O

☆

ستم رسیدہ و مظلوم کی دعا کے قریب
ملا وہ مجھ کو دلِ درد آشنا کے قریب

(انجم رومانی)

O

ساقی! نوا و نکہت و نزہت کا وقت ہے
اب تو حریمِ ساغر و مینا کا دَر کھلے

غزل میں مجازاً جس ساقی کا ذکر کیا جاتا ہے وہ کسی کو نوازتا ہے اور کسی کو محروم رکھتا ہے۔ اس کا دورِ جام رقیبوں ہی کے لیے وقف رہتا ہے جبکہ وہ دورِ جام سچے عاشقوں تک زہر کا پیالہ بن کر پہنچتا ہے۔ غالبؔ نے کہا تھا ؎

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

مجازی محبوب کی محفل میں باریابی ہر ایک کا مقدر نہیں ہوتی۔ اس کا سنگ در بھی ہر سر کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی گلی میں بھی ہر کوئی آ جا نہیں سکتا۔ وہ تمناؤں کو قبولیت کا شرف بھی نہیں دیتا۔ وہاں تو یاس و حرماں ہی کی حکمرانی ہوتی ہے اور عاشق کو کہنا پڑتا ہے کہ ؎

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش ''نہیں'' معلوم ہوتی ہے

لفظ ''ساقی'' سے بات غزل کی طرف نکل گئی۔ ورنہ اس نوع کا تقابل انسب نہیں ہے۔ بہر کیف جس ساقیٔ ازل اور جس محبوبِ حقیقی کی بزمِ ناز میں باریابی نصیب ہے وہاں تو یاس، آس کے پیرہن میں مسکراتی ہے۔ وہاں تو وہی دل مایوس ہوتے ہیں جن میں کفر نے اپنا آشیانہ بنا لیا ہو۔ وہاں تو تمناؤں کو قبولیت کا شرف ملتا ہے اس کی محفل سب کے لیے ہے اور یہ دورِ جام کسی کو بھی تشنہ لب نہیں رکھتا۔ اس کے آستاں پر سب جھوم اور گھوم رہے ہیں اور اس کے سنگِ آستاں کو سبھی

چوم رہے ہیں بلکہ لپٹ لپٹ کر دل کی پیاس بجھا رہے ہیں۔اس کی کبریائی کے ترانے گونج رہے ہیں۔ ہر زبان حمد وثنا سے لبریز ہے۔ یہاں بات پر زبان نہیں کٹتی بلکہ ہر دعا سنی جاتی اور قبول ہوتی ہے۔''دعا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں دعا مانگنے والا ہے وہیں منظور کرنے والا بھی ہے۔اگر آپ بآواز بلند دعا مانگیں تو وہ دور سے سنتا ہے اگر آپ دل میں دعا مانگیں تو وہ وہیں موجود ہوتا ہے۔ دعا کا انداز تقرب کے اظہار کا اعلان ہے۔ دعا الفاظ کی محتاج بھی ہے اور الفاظ سے بے نیاز بھی۔ دعا منظور فرمانے والا خود ہی انداز عطا فرماتا ہے۔ ہاتھ اُٹھانا بھی دعا ہے، ملتجی نگاہ کا اُٹھنا بھی دعا ہے۔''(۵)

کرم کی انتہا یہ ہے کہ محبوب حقیقی، خود بلاتے ہیں۔تبھی تو ایک عالم 'لبیک لبیک' کی صداؤں کے ساتھ حاضری کو توشۂ فخر و ناز سمجھتا ہے۔ یہاں آرزوؤں کو بال و پر ملتے ہیں۔ یہاں بے نوا، نوازے جاتے ہیں۔ یہاں نکہتیں مشامِ جاں کو معطر رکھتی ہیں۔ یہاں نکہتوں اور نزہتوں کی فراوانی ہے۔ایسے میں، محبّ، حریمِ ساغر و مینا کا دروازہ کھلنے کی تمنا کر رہا ہے کہ نوا و نکہت و نزہت سے معمور، خانہ کے ساتھ ساتھ، صاحب خانہ کی ایک جھلک بھی نصیب ہو جائے۔ بس ایک جھلک، بس ایک نظر، بس ایک جلوہ، عمر بھر کی سرشاری کے لیے کافی ہے ؎

مہکے مرے چمن میں بھی کوئی خوشی کا پھول
جھونکا ادھر بھی آئے نسیمِ بہار کا

اہلِ دل کے نزدیک کعبہ تو محبوبِ بے نشاں کا ایک نشان ہے۔ درج بالا شعر میں شاعر چاہتا ہے کہ نشان دیکھتے دیکھتے، دیکھنے والا اس قدر سبک ہو جائے کہ بے نشاں کو پالے۔ یوں لطف بھی اپنی انتہا کو چھولے اور التفات بھی اور پھر ؎

تا چشم برکشا دم نور رخ تو دیدم
تا گوش برکشودم، آواز تو شنیدم

''عبادت میں صحیح لطف اُسی وقت آتا ہے جب بندے کو اپنے بندہ اور معبود کے قادر مطلق اور رحیم و کریم ہونے کا صحیح احساس ہو۔اسی لیے عبودیت کبریٰ کے مفہوم و معنی سے آگاہ انسان کامل ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ اپنے رب کی عبادت کرتے وقت یہ احساس بیدار ہونا چاہیے کہ میں اس کی بارگاہ میں کھڑا اُسے دیکھ رہا ہوں۔ یہ سعادت نصیب نہ ہو تو کم از کم یہی خیال ہونا چاہیے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔کثیف اشیا کی رویت کا تعلق حواس ظاہری سے ہوتا ہے لیکن لطیف کو

محسوس کیا جاتا ہے۔ خوشبو بھی لطیف ہے، اُسے بھی ہماری ایک لطیف حس محسوس کرتی ہے۔ جو ذات لطیف ہو، اس کی آمد کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ہماری گرفت میں نہیں آ سکتی، ذات الوہیّت بھی چونکہ لطیف سے بلکہ لطیف تر اسی لیے اس کی آمد کا سراغ بھی احساسات کی دنیا سے لگایا جا سکتا ہے، جب احساسات کی دنیا میں تلاطم بپا ہو۔ آنسوؤں کا نہ منقطع ہونے والا سلسلہ دل کی دنیا کی حشر سامانیوں کا پتا دینے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ محبوب آ گیا کیونکہ جب مدت کے دو بچھڑے ملتے ہیں تو آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ (۶)

O

☆

رُخِ آرزو کی دمک ہے تُو، لبِ ناطقہ کا بیاں ہے تُو
تُو نظر نظر کی ہے روشنی، تو نفس نفس میں دواں ہے تُو

(خلیق قریشی)

O

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام، اے ساقی!

ساقی استعارہ ہوا، معطی کے لیے، ماہ تمام، انوار وتجلیات اور عنایات وفیوضات کے بحرِ بے کراں کے لیے، کہ اُن انوار سے ارض وسماوات روشن ہیں اور کائنات کا ہر ذرہ ان سے بقدر ظرف اکتساب نور کرتا ہے۔ ماہِ تمام کے مقابل، مہتاب، چاندنی کے لیے ایک اشارہ جبکہ رات بہرکیف تاریکیوں سے عبارت ہے۔ میں بیت اللہ میں اس شعر کی تکرار سے اسی بات کا آرزومند رہا کہ اے رب العلمین! میری کائنات تیرہ وتاریک ہے۔ میرا دل نابینا، میری بصارت، بصیرت سے تہی، میرا فکر، روشنی سے محروم، میرے الفاظ، بے تاثیر، میرے سجدے بے ذوق، میرا علم، عمل سے خالی، میرے نالے نارسا اور میری آنکھیں بے بصر ہیں۔ اقبال نے کہا تھا ؎

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

میرے اللہ! تُو سراپا انوار ہے۔ تیرا ہلکا سا التفات، میری پوری کائنات کو نورانی بنا سکتا ہے۔ چاروں اور اندھیروں کی برکھا ہے۔ تاریکیاں منڈلا رہی ہیں۔ بدر کامل کی ایک ہلکی سی جھلک سے یہ تمام اندھیرے نور بداماں ہو سکتے ہیں۔ اے اللہ! تو نے مجھے خود بلایا ہے ورنہ یہ بلاوا، ہر ایک کا مقدر کب ہے۔؟ کتنے ہی کروڑ پتی ہیں کہ وہ اس توفیق سے محروم ہیں اور کتنے ہی نادار ہیں جنہیں تو بلا کر اور اپنے سینے سے لگا کر زردار بنا رہا ہے۔ اس فقیر حقیر کو حاضری کی توفیق تو نے عطا کی ہے۔ اب مجھے اپنے ہر لحظہ پھیلتے انوار کے ہالے میں لے لے کہ میرا تن، من، نور میں نہا جائے۔ سمجھانے والا اپنے انداز سے سمجھا گیا ہے کہ ؎

کس طرح بنتے ہیں ذرے ماہتاب
تابشِ خورشید سے ٹکرا کے دیکھ

اے مالک! تیرا گھر ایک کوہ قامت نورانی مقناطیس ہے اور ہم لوہے کے زنگ آلود ذرے، زہے قسمت! کہ جذب وجنوں اور وجد وکیف میں خود بخود تیری طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں بلکہ تو خود ہی کھینچ کر اپنے در سے چمٹا اور لپٹا رہا اور ہمارے دلوں کی آرزو کو آبرو بخش رہا ہے ؎

ترا در ہو، مرا سر ہو ترا گھر ہو، مرا دل ہو
تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

اور ہمیں یقین کامل ہے کہ تیری کرنیں، تیری روشنیاں اور تیرے انوار ہمیں نورانی بنا جائیں گے اور تیرے لطف وکرم سے ہماری ہر کثافت کو لطافت مل جائے گی اور تیرا لطف ہمیں لطیف بنا کر ہلکا پھلکا کر دے گا کہ بوجھ تو کثافتوں کا ہوا کرتا ہے۔ جب جسم کے ساتھ دل تیری بارگاہ میں جھک جائے گا تو لازماً تیری رحمت دل کو اپنے حبیب ﷺ کی محبت سے بھر دے گی کہ یہی محبت ایمان کا دیباچہ اور نجات کا وثیقہ ہے۔ اس حوالے کے بغیر ہمارے دل کی ہر دھڑکن بے جواز ہے۔ وہی باغ اَزل کا گل تازہ ہیں اور انھی کی محبت سے قلب ونظر کو مہک ملتی ہے۔ اسی لیے تُو نے، ان کے لیے درود وسلام کا ہر اسلوب وقف کر رکھا ہے ؎

سازِ دل سے نغمہ کی صورت اُٹھی موجِ درُود
عظمتِ کردار پر حق کی شہادت دیکھ کر

درج بالا شعر کی تشریح کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اللہ کے پیمانے کو الہام سے اور ماہ تمام کو ''کامل ہدایت'' سے تعبیر کیا ہے، گویا شاعر مشرقؒ اس شعر میں یہ آرزو کرتے ہیں کہ اے اللہ! اپنے فضل وکرم سے میرے سینے کو اپنے الہام کی روشنی سے منور کر دے اور اوہامِ باطلہ کی تاریکی کو دور کر دے کہ تیری ذات منبعِ خیر وبرکت ہے۔

O

اے مخیّر! حد سے بڑھ کر حسن کی خیرات دے
ہم گدا ہیں، پر تری بخشش کے پیمانے بھی ہیں

میں جس بارگاہِ بندہ نواز میں حاضر ہوں، وہاں دینے والے کو کسی نوع کی کوئی محتاجی نہیں، دنیا میں کوئی بھی اس کو ماننے والا نہ رہے وہ پھر بھی الٰہ ہے۔ دنیا میں کوئی بھی مانگنے والا نہ رہے، پھر بھی اس کی ربوبیّت مسلّم ہے۔ وہ فی الواقع بے نیاز ہے۔ مانگنے والا اس کے خزانوں سے کائنات کی سبھی نعمتیں بھی مانگ لے اور اُسے مل بھی جائیں۔ پھر بھی اس کے خزانے میں اتنی کمی بھی نہیں ہوتی جتنی سوئی کو سمندر میں ڈبو کر نکالنے سے سمندر کے پانی میں ہوتی ہے۔ ؎

پیتے ہیں جھوم جھوم کے رندانِ بادہ نوش
رحمت کو دیکھ دیکھ کے ابر بہار میں

اس کے بھرپور و معمور خزانے بٹتے ہی چلے جاتے ہیں، پوری کائنات مقدور بھر سیراب ہو رہی ہے، پھر بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ادھر طلب بڑھتی چلی جاتی ہے اُدھر مسرت۔ میں نے مندرجہ بالا شعر رب العالمین کے حضور میں حاضری کے وقت پڑھا تو ضرور، مگر اب سوچتا ہوں کہ مخیّر کے دروازے سے تجھے خیرات ملی ضرور اور یہ بھی حق ہے کہ تیری حیثیت سے بڑھ کر ملی۔ تیری طلب ناقص تھی، اس نے اُسے خلوص کا جذبہ دیا۔ تیری نگاہ آلودہ تھی اس نے اُس کی بینائی کو پاکیزگی دی۔ تیرا قلم کج رو تھا اس نے اُسے درست جہت عطا کی۔ تیری کائنات، سراب تھی اُس نے اُسے شاداب بنایا۔ اسی نے تیری خزاؤں کو بہاروں کی رعنائی دی۔ اس نے تیرے تصور سے بڑھ کر تجھے عطا کیا اور تو خود کو اس کی خیرات کا پیمانہ کہہ رہا ہے؟ اس سے معافی مانگ، رو رو کر

معافی مانگ، کہ تو نہ اس کی نعمتوں کو ناپ سکتا ہے اور نہ اس کے لطف و کرم کو جانچ سکتا ہے۔ تجھ میں یہ ہمت کہاں سے آ گئی؟ تُو تو اس مخیّر کے گھر کو آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا اور اس کے خزانوں کی پیمائش کا کیسے دعوے دار بن بیٹھا ہے، شاعری کی ترنگ میں، مبالغے کے لہجے میں، خود کو بھول کر .....معافی مانگ اس عظیم الشان بارگاہ میں، ذرہ، ذرہ ہے۔ وہ آفتاب کو کیسے آغوش میں لے سکتا ہے؟ مولا کریم! میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب جب بلایا گیا تو یہ شعر نہیں پڑھوں گا.....اے مولا! تو بن مانگے دینے والا ہے اور ہم لاعلم، یہ بھی نہیں جانتے کہ تجھ سے کیا مانگا جائے ہمارے لیے جو بہتر ہے، وہ بن مانگے دے دے اور جو ہمارے لیے نامناسب ہے، اس کے مانگنے کی توفیق ہی نہ دے۔

اس بارگاہِ بندہ نواز میں ادب ہی پہلا اور آخری قرینہ ہے۔ سورہ نوح کی ایک آیت ہے۔ **مَالَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَاراً** ۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی بڑائی کا یقین نہیں رکھتے، شاعرِ مشرقؒ کس قدر پتے کے بات کہہ گئے ہیں ؎

دیں سراپا سوختن اندر طلب
انتہائش عشق، آغازش ادب

پروفیسر سید ابوبکر غزنویؒ کے الفاظ میں

''بعض لوگ انبیا اور صلحا کا احترام تو ملحوظ رکھتے ہیں اور زبان سے کوئی ایسا لفظ نہیں نکالتے جس سے اُن کی تعظیم میں کوئی فرق آئے یا جس سے ان کی توہین کا کوئی پہلو نکلتا ہو، لیکن اللہ عزّ وجل و تبارک و تعالیٰ کے بارے میں اُن کی زبانیں چھوٹ ہوتی ہیں۔ یہ بھی ایک شیطانی وسوسہ ہے کہ خدا کو جو جی میں آئے کہہ لو، مگر حضور ﷺ کی شان میں گستاخی نہ ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ حضور ﷺ کی شان میں گستاخی موجب حرمان ہے لیکن بارگاہِ الٰہی کے آداب ملحوظ نہ رکھنا بھی صریحاً گمراہی ہے۔''

O

مری فطرت کو ساقی! بے نیازِ دو جہاں کر دے
پیالہ سامنے دھر دے، نظر میں زندگی بھر دے

اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں ہر نوع کی نعمتیں ہیں، انسان لاکھ چاہے اس کی نوازشوں کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔ سورۂ ابراہیم کی آیت ۳۴ کا ترجمہ یوں ہے ''اور جو کچھ تم نے مانگا اس نے تمھیں دیا اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو ہرگز نہ کر سکو گے، بے شک آدمی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔'' اور سورۂ الرحمٰن میں اس حقیقت کو بار بار دہرایا گیا کہ ''پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''

وہ ایک ایسا مہربان ''ساقی'' ہے۔ جس کی بزم میں ہر ایک کو باریابی بھی ہے اور کسی کو محرومی کا کوئی احساس بھی نہیں ہے۔ ہر ایک سرشار، شاداب اور مطمئن ہے۔ وہ دیتا ہے کہ دینا اس کا منصب ہے۔ ہم مانگتے ہیں کہ مانگنا ہی ہمیں زیب دیتا ہے۔ نہ دینے سے اس کے خزانوں میں کوئی کمی آتی ہے نہ لٹانے سے بلکہ وہ خزانے ہمہ وقت معمور ہی رہتے ہیں۔ درج بالا شعر میں مانگنے والا، اس سے بے نیازی کی بھیک مانگ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ! مجھے صرف اپنا در عطا کر کے، ہر در سے بے نیاز کر دے۔ میں تیرے ہی در پر جھکا رہوں اور دوسرے ہر در کو سر پائے استحقار سے ٹھکراتا چلا جاؤں۔ اے مالک دو جہاں! مجھے دین کی سعادتیں اور دنیا کی برکتیں عطا کر دے۔ مجھے قناعت کی دولت دے کر، ماسوا سے بے نیاز کر دے کہ قناعت، بہارِ بے خزاں ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ کا فرمانِ اقدس ہے۔ اَلْقَنَاعَةُ مَالٌ لَّا يَنْفَدُ . (قناعت ایک ایسا مال ہے جو ختم نہیں ہوتا۔)

ظفر علی خاںؔ نے اسی کی ترجمانی کی ؎

گھٹانے سے نہیں گھٹتا قناعت مال ہے ایسا
ہے رونق اس سے گودڑ کی چھپا یہ لال ہے ایسا

روش صدیقی بھی اسی فرمان کو نظم کر رہے ہیں ؎

قناعت ہی وہ دولت ہے جو ہرگز کم نہیں ہوتی
مگر چشمِ ہوس اس راز کی محرم نہیں ہوتی

گویا قناعت ہی وہ نعمت ہے جو انسان کو بے نیازِ دو جہاں بنا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ والضحیٰ میں رسول پاک ﷺ سے مخاطب ہو کر جہاں اپنے انعامات و احسانات کا ذکر کرتے ہیں وہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ

ووجدک عائلاً فاَغنیٰ

کہ آپ کو نادار پا کر، تونگر بنا دیا۔ تونگر کا مطلب یہ ہے کہ ''اپنے سوا آپ کو ہر ایک سے بے نیاز کر دیا، ۔ اس لیے آپ فقر میں بہر نوع صابر اور غنا میں بہر طور شاکر رہیں گے۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تونگری ساز و سامان کی کثرت کا نام نہیں، اصل تونگری دل کی تونگری ہے'..... جب ایک بار اللہ تعالیٰ نے احد پہاڑ کو سونے کا بنا دینے کی پیشکش فرمائی تو نبیٔ کریم ﷺ نے شان استغنا کے ساتھ یہ آرزو کی کہ مجھے ایک دن کھانے کو ملے کہ شکر کروں اور ایک دن فاقہ کہ صبر کر کے آپ کے قریب ہو جاؤں۔ کہتے ہیں کہ یہ زمین دراصل ڈھکنا ہے اور جہنم اس کے نیچے ہے۔ نیچے، پانی بھی ہے اور لاوا بھی۔ وہ جب ایک دوسرے سے ملیں گے تو ہائیڈروجن اور آکسیجن دونوں گیسیں Decompose ہو جائیں گی ایک بھڑکے گی، دوسری بھڑکائے گی اور قرآن کی زبان میں سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے۔ ڈھکنا اُٹھا دیا جائے گا، صابر و شاکر انسانوں کے لیے صبر اور شکر دو پر بن جائیں گے وہ اُڑ کر اعلیٰ علیین (جنت کا بلند درجہ) میں چلے جائیں گے اور صبر و شکر سے محروم، جہنم کے بھڑکتے الاؤ کا شکار ہو جائیں گے کہ وہ پرواز کے لیے بال و پر سے محروم ہیں۔

درج بالا شعر، حرم کی فضاؤں میں قناعت کی لازوال دولت کے حصول ہی کے لیے بار بار پڑھا گیا کہ ''بڑھاپے میں حرص اور اُمید بڑھ جاتی ہے۔'' گویا مسرت گھٹ جاتی ہے اور ہوس بڑھ جاتی ہے۔ نتیجہ معلوم کہ سگِ دنیا نہ اِدھر کا رہتا ہے نہ اُدھر کا ؎

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اور ایسے میں گرنا مقدر ہو جاتا ہے.....اس لیے آرزو یہی رہی کہ اللہ تعالیٰ دل کو غنی بنا کر حرص

وہوس کی لعنتوں سے نجات عطا کر دے۔ مسنون تمنائیں ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ خَیْرَ عُمْرِیْ آخِرَہٗ وَ خَیْرَ عَمَلِیْ خَوَاتِمَہٗ و خَیْرَ اَیَّامِیْ یَوْمَ لِقَائِکَ.

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ عِیْشَۃً نَقِیَّۃً وَ مِیْتَۃً سَوِیَّۃً وَ مَرَدًّا غَیْرَ مَخْذُوْلٍ فَاضِحٍ.

(اے اللہ! میری آخری عمر اور میرے آخری اعمال کو بہتر بنا اور بہترین دن وہ بنا جن میں تیری ملاقات ہو۔ اے اللہ! میں سوال کرتا ہوں صاف ستھری زندگی اور عمدہ موت کا اور لوٹنا ایسا جس میں ذلت و رسوائی نہ ہو۔)

O

☆

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

(اصغر گونڈوی)

O

تشنہ لب چڑیا کے منہ میں گرنمی آ جائے گی
تیرے دریائے کرم میں کیا کمی آ جائے گی

اب تو ذہن میں نہیں ہے کہ باب ملک عبدالعزیز سے گزر کر ترکوں کے بنائے ہوئے برآمدوں میں ایک ستون سے ٹیک لگائے، خانہ کعبہ کو تکتے ہوئے، زبانِ بے زبانی کے ساتھ، اللہ تعالیٰ سے کیا کچھ مانگتا رہتا تھا۔ مرحومین کے لیے مغفرت، دوستوں، شاگردوں اور اپنے بچوں کے لیے فوز وفلاح، قرآن پاک کی تفہیم اور عمل کی توفیق، اپنے لیے دنیا وآخرت کی سرخروئی، اپنی تصانیف کے لیے قبولیت، امت مسلمہ کے لیے سربلندی اور جس جس نے جو جو کہا اور آنسو کہ ''یہ موتی بڑے قیمتی ہیں، انمول ہیں، یہ خزانہ بڑا گرانمایہ ہے۔ یہ تحفہ فطرت کا نادر عطیہ ہے۔ تقربِ الٰہی کے راستوں پر چراغاں کرنے والے موتی، انسان کے آنسو ہیں۔''

بہ فضل الٰہی دیارِ ناز میں آنسو پلکوں پر سلگتا بھی رہا، لرزتا بھی اور چمکتا بھی۔ وہ آنسو کس چیز کا آرزومند ہے، وہ وہی جانتا ہے..... لفظ کیا بتائیں کہ جہاں لفظ دم توڑ دیتے ہیں وہاں آنسو، ترجمانِ دلِ بے قرار بنتا ہے۔ بیت اللہ کو تکتے چلے جانا، آنکھوں کی عبادت ہے اور آنسو، آنکھوں کا وضو ؎

نمازِ نیازِ کسے کہ از سرِ صدق
بہ آبِ دیدہ و خونِ جگر طہارت کرد

اللہ والوں کی نماز نیاز کا کیا کہنا کہ وہ آنکھ کے آنسوؤں اور جگر کے خون سے وضو کیے بغیر ادا

ہی نہیں ہوتی۔

بحمد للہ کہ کعبہ مسلسل پیش نظر تھا۔ بیٹھ بیٹھ کے تھک جاتا تو طواف کے لیے کمر ہمت باندھتا۔ حجر اسود کے پاس آتا تو اُسے چومنے کی آرزو دل میں اُبھرتی، مگر دھینگا مشتی دیکھ کر استلام پر اکتفا کرتا۔ گاہے گاہے اُسے بوسہ دینے کی اپنی سی کوشش بھی کرتا کہ

اُسے چوما ہے سردار دو عالم ﷺ نے محبت سے

میں نے اپنی تالیف ''کعبہ پہ پڑی جب پہلی نظر'' میں حجر اسود کو عذارِ کعبہ کا خالِ دلکش قرار دیا ہے۔ میں حطیم تک تو تیسرا کلمہ پڑھتا۔ حطیم کے گرد رب اغفر وارحم وانت خیر الرّٰحِمِیْنَ کا ورد کرتا۔ حطیم کے آخر سے لے کر رکن یمانی تک، درج بالا شعر ایک عجیب کیف عطا کیا کرتا تھا۔ رکن یمانی سے حجر اسود تک۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِیْ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ.

کہ وہ مسنون بھی ہے اور جامع بھی۔ یہ شعر پڑھتے وقت یہ صداقت ذہن میں ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ سے سب کچھ بھی مانگ لیا جائے اور وہ مل بھی جائے تو اس کے خزانے میں اتنی کمی بھی نہیں آتی جتنی سوئی کے ناکے کو سمندر میں ڈبو کر نکالنے سے، سمندر کے پانی میں آتی ہے۔ سوچتا تھا کہ میں نے مانگا ہی کیا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ کے سامنے میری مطلوب ضروریات وحاجات کی حقیقت وحیثیت ہی کیا ہے؟ محض نمی کی سی، اور یہ نمی نصیب ہو جانے سے اُس بحر کرم میں کوئی سی کمی بھی نہیں آ سکتی جو ازل سے موجیں مار رہا ہے۔ اب سوچتا ہوں کہ وہاں تجلیات کی کوئی کمی نہ تھی، میں نے تو کچھ بھی نہیں سمیٹا۔ بحر کرم جوش میں تھا۔ میں نے محض نمی پر اکتفا کی حالانکہ وہاں کوئی کمی نہ تھی۔ اب پچھتاتا ہوں کہ دین کی دولت مانگ لیتا۔ حبِ رسول ﷺ کی سعادت مانگ لیتا۔ حکمت کی نعمت مانگ لیتا کہ وہ خیر کثیر ہے۔ دولت دنیا کے بجائے دولت کونین کہہ دیتا۔ اب ندامت سی محسوس ہو رہی ہے کہ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

کیا ہے جو یہاں نہیں ہے اور کیا ہے جو یہاں نہیں ملتا۔ مجھے اپنی کوتاہ دستی پر افسوس تو ہے مگر پھر بھی نازاں ہوں کہ بہت کچھ ملا۔ سب سے بڑھ کر بیت اللہ میں بار بار حاضری، اس دربارِ عالی میں خمیدگی، اس سنگِ در سے لپٹ کر رونا، اس آستانِ ناز کا طواف اور پھر پینے کے لیے زمزم،

جس کے بارے میں مستند روایت ہے کہ آخری حج کے موقع پر حضورﷺ کے لیے بیئر زمزم سے ایک ڈول نکالا گیا۔ آپﷺ نے کچھ نوش فرمایا اور باقی ماندہ زمزم میں اپنی مبارک کلی ڈال دی اور اُسے چاہ زمزم میں ڈالنے کا حکم دیا۔ انتہائے کرم ہے کہ قیامت تک مسلمان نبیٔ اکرمﷺ کا پیا ہوا پانی پیتے رہیں گے کہ ؎

بہ خاصاں می دہدشہ، بادۂ نوشیدۂ خود را

پانی تو پھر پانی ہے، اُن کے لعابِ دہن کے ساتھ بہت سے معجزات وابستہ ہیں.....اور پھر میری حاجات کو پورا کرنے والی ذات پاک طلب سے کہیں بڑھ کر عطا کرتی ہے۔ اپنی شانِ عطا کے مطابق عطا کرتی ہے۔ وہ تو دل کی دھڑکنوں کو بھی سمجھتی ہے اور پلکوں پر لرزتے ہوئے ستاروں کی چاہت سے بھی خوب آشنا ہے۔ اس حضورِ ناز میں صرف ہدیۂ نیاز چاہیئے۔ لفظوں کو لب آشنا کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ لفظ، جذبات بن ہی نہیں سکتے ؎

ڈوبا ہوا سکوت میں ہے جوشِ آرزو
اب تو یہی زباں مرے مدعا کی ہے

O

☆

سوچ میں گم ہوں، پسِ حمد، سرلوحِ سحر
رات کا کرب لکھوں، صبح کے نالے لکھوں

(راسخ عرفانی)

O

منگتے کا ہاتھ اُٹھتے ہی داتا کی دین ہے
دوری قبول وعرض میں بس ہاتھ بھر کی ہے

حسنِ ظن انسان کو شگفتہ اور شائستہ رکھتا ہے جبکہ سوءِ ظن، افسردہ اور پژمردہ۔ مسلمان ہر لحظہ پُر اُمید رہتا ہے۔ خود مالک کائنات نے فرمادیا کہ میری رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا کہ مایوس وہی دل ہوتے ہیں جن میں کفر رچ بس گیا ہو، اور یہ بھی سچ ہے کہ اس ذات بلند و برتر سے جو خیال، جو اُمید اور جو توقع وابستہ کر لی جائے وہی خیال تکمیل پاتا، وہی اُمید شاداب ہوتی اور وہی توقع، قبولیت کو پہنچتی ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت پر یقین مطلوب ہے اور یقین وہ قوت ہے جو ناممکنات کو ممکنات میں بدل دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا، کسی سے بھی مانگیں، حیا، اِبا کرتی ہے اور اُس ایک دروازے کو چھوڑ کر، دوسرے دروازوں سے چمٹنے والے خائب وخاسر رہتے ہیں ۔

تجھ سے مل کر زندگی مقصودِ مہر و ماہ تھی
تجھ سے کٹ کر دربدر بے آبرو ہونے لگی

ربِ کائنات سے جتنا مانگیں، اتنا ہی کم ہے، کم مانگیں تو وہ رنجیدہ، زیادہ مانگیں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ الحمدللہ، اس منگتے نے اس داتا کے در سے جو مانگا اُسے کچھ سوا ہی ملا۔ بسا اوقات وہ کچھ ملا جو حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ اس نے اپنے گھر بار بلایا اور یوں بھی ہوا کہ میں نے ارادہ ختم کر دیا مگر اس نے خود ایسے اسباب اور مواقع پیدا کر دیئے کہ آنا ہی پڑا۔ یاد اور طلب کے اس حُسن کا شکر ادا کرنا چاہوں تو یقیناً عمر بھر نہ کر سکوں۔ پھر اس نے اپنے در پر دامن پھیلانے کی توفیق بخشی۔

دعائیں کرنے کا سلیقہ عطا کیا اور عمر بھر غزل پڑھانے والے اس بندے کی التجاؤں کو شعری ادائیں دیں اور اشعار نے کیف ونشاط کے وہ لمحے عطا کیے کہ شاید کسی اور انداز سے وہ سرخوشی نصیب نہ ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دربارِ دُربار میں طمانیت کا ایک لمحہ، عمر بھر کی بے کیف عبادت پر بھاری ہے، درج بالا شعر پڑھتا تو یوں لگتا کہ داتا تو کبھی کا منتظر تھا کہ منگتا، مانگے، ہاتھ پھیلیں اور وہ نوازشوں اور عطاؤں کی بارش کرے اور واقعی عرضِ حال اور قبولِ التماس میں کوئی فاصلہ ہی نہ تھا۔

صرف بالشت بھر کا۔ کس قدر مسرت افزا اور اطمینان بخش امر ہے کہ اس نے خود ہی مانگنے کی تاکید کی، خود ہی مانگنے کا قرینہ عطا کیا، تنگیٔ دامن کو خود ہی وسعت عطا کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دعاؤں کی اجابت کے لیے یہ بھی فرمایا کہ کوئی سفید بالوں والا جب میرے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے تو مجھے اس کے سفید بالوں سے حیا آ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے آرزو ہے کہ وہ اس سفید بالوں والے کو بھی ایمان وحیا کی دولت عطا کر دیں اور جس طرح ان کی شانِ ستاری نے اس دنیا میں آبرو رکھی ہے اسی طرح آنے والے حالات میں بھی وہ سرخرو رکھیں۔ برزخی اور اُخروی مرحلوں کو اپنی رحمت سے شاداب بنا دیں اور پھر ؎

خوشبوؤں کے دائروں کا عکس لے کر
روشنی رنگوں کے ساحل پر کھڑی ہو

O

☆

اُس نے پیکر میں نہ ڈھلنے کی قسم کھائی ہے
اور مجھے شوقِ ملاقات لیے پھرتا ہے

(انور مسعود)

O

ترا آئنہ، عالمِ رنگ و بو ہے
جدھر دیکھتا ہوں، اُدھر تو ہی تو ہے
ہزاروں حجاب اور اس پر یہ عالم
کہ چرچا ترا جابجا، کُو بہ کُو ہے
ثنا خواں ترا دہر کا ذرّہ ذرّہ
سبھی کی زباں پر، تری گفتگو ہے
جمالِ ازل، قدرت مطلقہ کی
شہادت سے معمور، ہر چار سو ہے
ترے فضل ورحمت نے بخشا ہے سب کچھ
بس اب تو مری ایک ہی آرزو ہے
کہ کردے مجھے ایسے بندوں میں شامل
کہ اشکِ سحر گاہ، جن کا وضو ہے
بجاہِ شفیعِ حبیبِ دو عالم ﷺ
کہ جو عالمِ کون کی آبرو ہے
شفیعِ گنہگار و خستہ بھی حاضر
بہ اُمیدِ عفو و کرم، رو برو ہے

اللہ تعالیٰ، معبودِ واحد اور محمد ﷺ اس کے رسول آخریں۔ زبان سے اس حقیقت کا اقرار اور دل سے اس کی تصدیق، انسان کو مسلمان اور مسلمان کو مومن بنا دیتی ہے۔ اقرار باللسان، شریعت ہے اور تصدیق بالقلب طریقت اور دونوں کا امتزاج عقیدے کا حسن۔ علم و عرفان کی ہم آہنگی ہی مقصودِ حقیقی ہے اور علم و عرفان کی رقابت..... غلط بینی ہے منبر کی..... مولانا مفتی محمد شفیعؒ نصیب والے تھے کہ عقیدے کا یہ حسن، اُن کی حیاتِ مستعار کا اعتبار بنا رہا۔ وہ مفسر قرآن (معارف القرآن، ۸ جلدوں میں ہے) بھی تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف بھی۔ مفتیٔ اعظم تھے۔ شرعی نزاکتوں اور فقہی بصیرتوں سے کماحقہٗ آگاہ۔ ذہنی حیثیت عالمانہ اور قلبی کیفیت صوفیانہ تھی۔ مزاج کی موزونیت، فطرتاً عروض و اوزان کی میزان میں تُلی ہوئی تھی، مگر پیشہ ور شاعر نہ تھے جب طبیعت مائل ہوتی تو حمد و نعت کہہ لیتے تھے۔ سورۂ الشعراء کی تنبیہ پیش نظر رہتی تھی۔ اس لیے بفضلہٖ شاعری میں بھی قلم راست رو رہا۔ شاعرانہ صلاحیتیں توارثی طور پر جناب ذکی کیفی میں منتقل ہوئیں اور خوب خوب نکھریں۔

میں اس بار ۱۶ مارچ ۲۰۰۶ء کو ریاض اپنے بیٹے محمد طاہر اقبال کے پاس آیا۔ اس کے ہاں عرب دنیا سے شائع ہونے والے پہلے اردو ہفت روزہ ''اردو میگزین جدہ'' کے کچھ شمارے پڑے ہوئے تھے۔ یونہی ورق گردانی کرتا رہا کہ ۶ جنوری ۲۰۰۶ء کے شمارہ میں مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم و مغفور کے ''جامِ توحید'' کے عنوان سے یہ اشعار ملے۔ میں نے نوٹ کر لیے اور جب مدینہ منورہ حاضری کے بعد عمرہ کے لیے مکہ معظّمہ گیا تو یہ اشعار بھی خانہ کعبہ میں پڑھتا رہا۔ کیا عجب، اس باصفا، برگزیدہ اور متقی انسان کے یہ مقبول اشعار اس عاجز کے لیے توشۂ آخرت بن جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان اشعار کا اچانک مل جانا اور حرم پاک کی فضاؤں میں ساتھ دینا، خود میری خوش نصیبی بھی ہے اور شاعر کی بلندیٔ درجات کے لیے ایک خوبصورت التجا بھی.....۔

مولانا مفتی محمد شفیع کا سالِ ولادت ۱۸۹۷ء ہے، مقامِ ولادت دیوبند ضلع سہارنپور، سالِ وفات ۱۹۷۶ء۔ والدِ گرامی قدر کا نام مولانا محمد یٰسین، ابتدائی تعلیم انھی سے حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند میں اکابر علما سے استفادہ کیا۔ اسی ادارے میں مدرس بھی رہے اور دارالافتاء کے نگران بھی۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے اور اُن کے خلیفۂ مجاز قرار پائے۔ دینی، علمی اور روحانی اعتبار سے حضرت تھانویؒ ہی کے جانشین تھے۔ تحریک پاکستان میں حصہ لیا اور قیامِ پاکستان کے بعد قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ آپ کے فتوے کے مطابق، کانگرس میں

شمولیت کفر کی اعانت ہے۔ آپ نے ۱۹۵۱ء میں ۲۲ نکات پر مشتمل علمائے کرام کی مجوزہ دستوری ترامیم کی تدوین میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آپ علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بعد اسلامی مشاورتی بورڈ کے صدر بھی رہے۔ مولانا رفیع عثمانی اور مولانا تقی عثمانی آپ کے صاحبزادے ہیں۔

آخر میں ''معارف القرآن'' سے ایک خوبصورت اقتباس:

''اس جہانِ رنگ و بو میں جہاں ہزاروں حسین مناظر اور لاکھوں دل کش نظارے اور کروڑوں نفع بخش چیزیں انسان کے دامنِ دل کو ہر وقت اپنی طرف کھینچتی رہتی ہیں اور اپنی تعریف پر مجبور کرتی ہیں۔ اگر ذرا نظر کو گہرا کیا جائے تو ان سب چیزوں کے پردے میں ایک ہی دستِ قدرت کارفرما نظر آتا ہے۔ ''الحمدللہ'' نے کثرتوں کے تلاطم میں پھنسے ہوئے انسان کے سامنے ایک حقیقت کا دروازہ کھول کر یہ دکھلا دیا کہ یہ ساری کثرتیں ایک ہی وحدت سے مربوط ہیں اور ساری تعریفیں درحقیقت اسی ایک قادرِ مطلق کی ہیں، ان کو کسی دوسرے کی تعریف سمجھنا نظر و بصیرت کی کوتاہی ہے ؎

حمد را با تُو نسبتے است درست
بر درِ ہر کہ رفت بر درِ تست''

O

☆

یہ زمیں، یہ سبزہ و گل، یہ فلک، یہ مہر و ماہ
اے مصوّر! سب کی روحِ نقش آرائی ہے تُو

(خورشید رضوی)

O

اے عظیموں کے عظیم ، اے سب عظیموں سے عظیم
تیری قدرت کا نشاں ہیں، یہ زمین و آسماں
فرشِ خاکی اس طرف اور وہ فضائے بیکراں
تیری شانِ کن فکاں کا نقش ہیں کون و مکاں
سرنگوں دربارِ عالی میں ترے سب انس و جاں
کائناتِ دہر کی ہر چیز ہے سجدہ کناں
ہیں تری توصیف سے عاجز مرے لفظ و بیاں
اے عظیموں کے عظیم، اے سب عظیموں سے عظیم
اے کریموں کے کریم، اے سب کریموں سے کریم
ذرہ ذرہ ہے جہاں کا تیرا ممنونِ کرم
ہر کس و ناکس یہاں ہے تیرا مرہونِ کرم
پتے پتے پر رقم ہے تیرا مضمونِ کرم
نظمِ ہستی کا ہے ضامن تیرا قانونِ کرم
ہے عیاں ہر سمت تیرا سرِ مکنونِ کرم
ہے محیطِ سلطنت تختِ ہمایونِ کرم

اے عظیموں کے عظیم، اے سب عظیموں سے عظیم
اے کریموں کے کریم، اے سب کریموں سے کریم
عفو ہے شیوہ ترا، رحمت تری پہچان ہے
تو رحیم و ارحم و رحمٰن عالی شان ہے
ہو تری توفیق تو راہِ ہدیٰ آسان ہے
خوئے تسلیم و رضا ہی بندگی کی جان ہے
ہے صدائے دل کہ بخشش کا یہی سامان ہے
تو نے رحمت کو کیا لازم، مرا ایمان ہے
اے رحیموں کے رحیم، اے سب رحیموں سے رحیم
سب کریموں سے کریم، اے سب عظیموں سے عظیم

بچہ تو فطرتِ صحیحہ اور ذوقِ سلیم لے کر پیدا ہوتا ہے مگر ماحول اُس فطرت کو بگاڑتا بھی ہے اور سنوارتا بھی۔ شاعرانہ صلاحیتیں، وہی ہوتی ہیں مگر ماحول کسی کو نعت گو بنا دیتا ہے..... کسی کو غزل گو اور کسی کو ہزل گو..... خوش نصیب ہیں برادر مکرم حفیظ الرحمٰن احسن کہ اُن کی فطری صلاحیتوں کو سازگار ماحول ملا۔ نتیجہ معلوم کہ اُن کا علم نہ بہکا نہ بھٹکا، بلکہ حقیقتوں اور سعادتوں کا ترجمان بنا رہا اور الحمدللہ یہ ترجمانی رعنائیوں اور سچائیوں کے ساتھ جاری ہے۔ وہ ماہنامہ ''سیارہ لاہور'' کے مدیر ہیں جو شعر و ادب کی صالح قدروں کے جلو میں ایک ہموار تسلسل سے شائع ہو رہا ہے۔ حفیظ الرحمٰن احسن کی یہ نظم مجھے ''اردو میگزین جدہ'' کے ۱۳ جنوری ۲۰۰۶ء کے شمارہ سے ملی۔ ان کی اس مناجات کا عنوان ''اعتراف عجز'' ہے۔ اس بار (مارچ ۲۰۰۶ء) بیت اللہ میں حاضری کے وقت ان کی یہ مناجات بھی ورد زبان رہی۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت سے نوازیں اور دنیا و آخرت کی بہترین سعادتیں ان کے لیے وقف رہیں۔ (آمین)

اس حمد میں عجز وانکسار کا اظہار بھی ہے، اللہ کے کرم کی طلب بھی اور اس کی قدرت وجبروت کا اعتراف بھی۔ ربوبیت، رحیمیت اور مالکیت، یہ تین لفظ حمد کی جان بھی ہیں اور پہچان بھی۔ ان پر جتنا غور کیا جائے، خوف ورجا کی جملہ کیفیتیں، ایمان وایقان کے سانچے میں ڈھلتی، سمٹتی اور نکھرتی محسوس ہوتی ہیں اور یہ تین لفظ، علم وعرفان کے ایوان سجاتے اور ذہن وفکر کی گرہیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔ ربوبیت میں ہر ابتدا کی انتہا جلوہ گر ہے۔ رحیمیت میں لطف ومحبت کی واضح جھلک ہے اور مالکیت میں جزا وسزا کا ہر اختیار پوشیدہ ہے۔ خوف ورجا کے اس حسین امتزاج سے، انسان نہ بے مہار ہوتا ہے اور نہ مایوس۔

اس حمد میں ہر بند کے بعد جو ٹیپ کا شعر آ رہا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے لیے عظیم، کریم اور رحیم کے الفاظ تفضیل کل کے انداز میں دہرائے گئے ہیں۔ عظیم، عظم سے ہے عظم میں اساسی اور بنیادی حیثیت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ عظیم ہیں کہ وہ بہر اعتبار رفعت کے مالک بھی ہیں، عظمت کے حامل بھی، انھی کی بارگاہ سے انسان کو عزّ وشرف ملتا اور حیات انسانی کو اساسی قوتیں عطا ہوتی ہیں۔ کرم کا مفہوم یہ ہے کہ بغیر کسی غرض کے کسی کو فائدہ پہنچانا اور کریم میں بھلائیوں اور فضیلتوں کا کمال پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کرم کی گھٹائیں ریگزاروں پر بھی برستی ہیں اور گلزاروں پر بھی، اور کریم وہی ہے جس سے ہر لحظہ کرم کا ظہور ہوتا رہے۔ اور رحیم وہ ہے جو بلا معاوضہ سامانِ نشو ونما عطا کرتا چلا جائے اور جس نے اس صفت رحمت کو اپنے اوپر واجب کر لیا ہو اور جس کے دامانِ رحمت نے کائنات کی ہر شے کو ڈھانپ رکھا ہو ؎

مکتوم اس کی موجِ کرم ہے صدف صدف
مرقوم اس کا حرفِ وفا ہے اُفق اُفق

O

گلستاں ویران، آنکھیں خشک ہیں مولائے کل!
پھر انہیں سر سبز کر، آنسو بنا، شبنم بنا
میری بربادی پہ اک عالم کی نظریں ہیں لگی
میرے مولا! میری خاکستر سے اک عالم بنا

کبھی وہ دور تھا کہ پورا یورپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ تب ہم مسلمانوں نے ان ظلمتوں کو علم و عمل کی چاندنی عطا کی تھی۔

فروغ آج مغرب کو ہے علم و فن سے
بہاریں ہم آغوش میں اس چمن سے
کبھی وہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا
گریزاں تھا نور اس کے، بیت الحزن سے
منور ہوا اس کا ظلمت کدہ بھی
اسی آفتابِ ہدیٰ کی کرن سے
یہ ہیں کارنامے رسولِ خدا ﷺ کے
یہ ہیں معجزے خاتم الانبیا ﷺ کے

اقبالؒ نے بھی اس امر کا ماتم کیا تھا کہ اگر ہم آج دنیا پر حاکم نہیں تو یہ بات قابلِ تشویش نہیں کیونکہ دن ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور تاج و تخت ہمیشہ ایک ہی قوم کے پاس کبھی نہیں رہا۔ المیہ یہ

ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی علمی وراثت کی بھی حفاظت نہ کر سکے۔ ہمارے اسلاف کی علمی اور تحقیقی تصانیف اہل یورپ اُٹھا کر لے گئے اور اُس سائنسی تحقیق کی بنیادوں کا سہارا لے کر آج وہ چاند تاروں پر کمندیں ڈال رہے ہیں اور ہم محوِ حیرت محض ہاتھ مل رہے ہیں۔ اقبالؔ نے کہا تھا ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

آج امتِ مسلمہ علمی نقطۂ نظر سے مفلس، فکری لحاظ سے پسماندہ، دینی اعتبار سے غیر معتبر اور دنیاوی معیار سے زوال پذیر ہے اور زوال کی وجہ یہی ہے کہ ہم مسلمان نہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ گویا صرف نام کے مسلمان ہیں۔ ''جب مسجدیں بے رونق، مدرسے بے چراغ، اپنے بیگانے، عالم بے عمل اور اولاد بے ادب ہو جائے، جب جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے، ملک کے بجائے مفاد اور ملت کے بجائے مصلحت عزیز ہو، جب موت سے خوف اور زندگی سے محبت ہو جائے تو قوموں کی کشتیوں کو ڈوبتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔''(۹)

ہم اسلام کے بارے میں پڑھتے ہیں، لکھتے ہیں، بولتے ہیں مگر اسلام پر عمل نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم اپنے کردار و عمل کا ویسا نقشہ نمایاں کر رہے ہیں کہ اسلام تو خیر ایک بلند دستور زندگی ہے اگر اس کے خال و خط عام انسانیت کے سامنے بھی پیش کیے جائیں تو انسانیت شرم کے مارے گردن جھکا لے، بالخصوص وطن عزیز پر رات آج جس قدر بھاری ہے پہلے کبھی نہ تھی۔ ہم ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوئے تھے مگر آزادی ہمیں ابھی تک نہیں ملی۔ ہم پنجۂ ہنود و یہود میں بدستور تڑپ رہے ہیں۔ میری معصوم آنکھوں نے پاکستان بنتے دیکھا تھا، یکا یک انسانیت کی مانگ اجڑ گئی تھی۔ درندگی سکون پر چھا گئی تھی، بڑھاپے کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا، جوانی لڑکھڑا کر گر پڑی اور بچپن نے بلک بلک کر دم توڑ دیا تھا۔ وہ جن کے دامنِ شرافت کی قسم فرشتے کھاتے تھے وہ بے آبروئی کے سمندر میں موجِ متلاطم کے رحم و کرم پر تھے۔ وہ سرزمین جو سونا اُگلتی تھی، خون کے فوارے اُگلنے لگی۔ ؎

لہو برسا، بہے آنسو، لٹے رہرو، کٹے رشتے
ابھی تک نامکمل ہے مگر تعمیرِ آزادی

قدرت نے ہمیں ایک حسین وطن دیا تھا مگر ہم اُسے سنبھال نہ سکے اور ۱۹۷۱ء میں میری گنہگار آنکھوں نے اس وطن کو ٹوٹتے دیکھا۔ اب میں اُسے بکھرتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ ہمارا گلستاں

ویران ہے، آنکھیں خشک ہیں اور دعائیں بے اثر۔ اگر آج ہماری انفرادی، اجتماعی اور ملّی زندگی، ویرانیوں اور پریشانیوں کی زد میں ہے۔ اگر آج ہمارے بازارِ حیات میں محبت کا قحط ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اُن اسباب کو بھول گئے ہیں جن سے اتفاق و محبت کو بال و پر ملتے ہیں۔ جو مسافر راستہ بھول جاتے ہیں انہیں منزل نہیں ملا کرتی اور ہم نہ رہ نشیں ہیں، نہ راہی۔

راستہ ایک ہی ہے جس کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے کہ ''تم ایمان میں پکے اور اعمال میں سچے بن جاؤ، لوگوں کے دلوں میں تمہارے لیے محبت پیدا میں کر دوں گا۔'' (سورۂ مریم۔۹۶) اس آیت کی وضاحت، حدیث پاک میں بھی ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ کسی (نیک) بندے کو اپنا محبوب بنالیتا ہے تو اللہ جبرائیل علیہ السلام کو کہتا ہے، میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں، تو بھی اس سے محبت کر، پس جبرائیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنا شروع کر دیتے ہیں، پھر جبرائیل علیہ السلام آسمان میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں آدمی سے محبت کرتا ہے پس آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر زمین میں اس کے لیے قبولیت اور پذیرائی رکھ دی جاتی ہے۔''

حق یہ ہے کہ نہ ہمارا ایمان راسخ ہے اور نہ ہمارے اعمال قابل قدر۔ نتیجہ معلوم کہ ہم انفرادی، اجتماعی اور ملّی اعتبار سے غیر معتبر ہو گئے ہیں، ہماری انفرادی زندگی بھی لہولہو ہے اور قومی زندگی بھی پارہ پارہ اور بحیثیت مجموعی ہم تاریخ کے چوراہے میں نقشِ عبرت بنے ہوئے ہیں۔ قرآن نے یہ حقیقت بھی بیان کی تھی کہ ''تمھی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن بن جاؤ۔'' ایمان کے بغیر انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اقبالؔ نے کہا تھا ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ایمان، صداقت کو ایک ایسی قوت میں بدل دیتا ہے جس کے سامنے مادی تبختر پرِ کاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھا کرتا۔ فرعون کے جادوگروں کو ایک لمحے کا سچا ایمان نصیب ہو گیا تھا کہ انہوں نے وقت کی سپر پاور کے قاہرانہ جاہ وجلال کو سر پائے استحقار سے ٹھکرا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ ''ایمان والو، ایمان لاؤ۔''

کیسا ایمان؟ جیسا صحابہ کرامؓ لائے تھے۔ ایمان جاننے کا نام نہیں، ماننے کا نام ہے۔ ایمان سنانے کی نہیں، سکھانے کی چیز ہے۔ مکی زندگی میں ۱۳ سال ایمان سیکھا گیا اور مدنی زندگی میں ۱۰ سال اس پر عمل کر کے دکھایا گیا۔ یہود، نبیٔ پاک ﷺ کو جانتے اور پہچانتے تھے جیسے وہ اپنے بیٹوں کو

جانتے اور پہچانتے تھے مگر مانتے نہیں تھے.....اور آج ہم ماننے والے جب تک ماننے کا حق ادا نہیں کریں گے اس وقت تک ہماری زندگی، شرمندگی ہی بنی رہے گی۔ اسلام، سرِتسلیم خم، کرنے کا دوسرا نام ہے۔ لازم ہے کہ ہماری جملہ عبادات بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہوں اور ہماری زندگی اور موت بھی اس کے لیے.....اور جان، مال اور اولاد سے زیادہ محمد عربی ﷺ عزیز۔ ''عربی زبان میں بنیادی طور پر ''مسلم'' کا لفظ اس اونٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کی ناک میں نکیل پڑی ہوئی ہو اور اس کا سرا کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو یعنی اس اونٹ کو ''مسلم'' کہا جاتا ہے جو اپنی مرضی سے نہ چل سکتا ہے، نہ اُٹھ سکتا ہے، نہ بیٹھ سکتا ہے، نہ حرکت کر سکتا ہے، نہ سکون پذیر ہو سکتا ہے بلکہ وہ اونٹ تبھی حرکت میں آتا ہے جبکہ نکیل تھامنے والا اُسے حرکت میں لاتا ہے۔ اسی وقت بیٹھتا ہے جب مہار تھامنے والا اُسے بیٹھنے کو کہتا ہے۔ اُسی وقت اُٹھتا ہے جب اُٹھانے والا اُس کو اُٹھاتا ہے۔ اس لفظ کو اس شخص کے لیے استعمال کیا گیا جس نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے لائے گئے نظامِ حیات کو تسلیم کر لیا، اُسے ''مسلم'' کہا گیا۔ معنی یہ ہے کہ اس شخص نے اپنے آپ کو ایسے نظام کے تابع کر دیا ہے جس کی باگ ڈور، جس کی نکیل اور مہار اس کے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ اس نظام کے بھیجنے والے رب العالمین کے ہاتھ میں ہے یا اس نظام کے لانے والے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ہے۔''

الغرض ایک مسلمان کے لیے دو ہی چیزیں ہیں۔ رب کا قرآن اور محمد ﷺ کا فرمان۔

اللہ تعالیٰ کے گھر میں، درج بالا دو شعر حاشیۂ خیال پر اُبھرتے رہے کہ اے ارحم الرّحمین! ہمیں آنسو عطا کر دے، ہمارے دل میں احساسِ زیاں پیدا کر دے، ہمیں رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرنے کی توفیق بخش دے کہ ہم ایک بار پھر سوئے گردوں نالۂ شبگیر کے سفیر بھیجیں، تا کہ تیری رحمت ایک بار پھر ہمارے لیے وقف ہو جائے۔ ہم ایک بار پھر تیری نگہِ کرم کے مرکز بن جائیں اور تیرے کرم سے ہماری تخریب کو تعمیر، علم کو عمل، فکر کو نظر اور پژمردگی کو شگفتگی عطا ہو کہ تیری رحمت کے بغیر زندگی کا ہر خاکہ بے رنگ، ہر ارادہ خام اور ہر دعا، بے تاثیر ہے۔

O

چار طرف اندھی برکھا　　کالی گُھپ، گھنگھور گھٹا
درد سمندر، دُکھ دریا　　تپتی لُو، جلتا صحرا
تو جگ داتا، جگ راکھا
خالقِ ارض و ربِّ سما

انت الھادی، انت الحق　　فاحفظنا من کلِّ بلا

اوگھٹ منزل، دور بڑی　　آگے گھاٹی سخت کھڑی
کالے کوس اور دُھوپ کڑی　　کون ہمارا تیرے سوا
ہم ہیں بندے، تو آقا
خالقِ ارض و ربِّ سما

انت الھادی، انت الحق　　فاحفظنا من کلِّ بلا

ذوقِ سفر کو منزل دے　　کشتِ نظر کو حاصل دے
طوفانوں کو ساحل دے　　ٹوٹی کشتی پار لگا
تیری قدرت میں کیا کیا
خالقِ ارض و ربِّ سما

انت الہادی، انت الحق فاحفظنا من کلِّ بلا
غافل ہم، ناکارے ہم نیندوں کے بنجارے ہم
بے مایہ، بیچارے ہم وقت کی بازی ہارے ہم
نام محمد، صلِّ علیٰ
پالنہار، مدد فرما
انت الہادی، انت الحق فاحفظنا من کلِّ بلا

O

یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی پاکستانی، دیارِ پاک میں حاضری سے مشرف ہو اور اُسے پاکستان یاد نہ آئے اور امتِ مسلمہ کا زخم زخم چہرہ اور لہولہو جسم پیش نظر نہ ہو کہ ہر بلا جو آسمان سے نازل ہوتی اور زمین سے اُبھرتی ہے وہ ہمارے ہی گھر کا پتا پوچھتی ہے ؎

جب کوندتی ہے بجلی تب جانبِ گلستاں
رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاکِ آشیاں سے

پوری مسلم امّہ پر سکوتِ مرگ طاری ہے اور مٹنے والی قوموں کی سبھی نشانیاں ہم نے قبول کر لی ہیں۔ اور یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری، اسلام نے ہمیں زندگی گزارنے کے اصول بھی بتائے ہیں اور مرنے کے انداز بھی سکھائے ہیں مگر ؎

کیا جانیے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو
مرنے کی ادا یاد، نہ جینے کی ادا یاد

ہمیں صرف حصولِ مال وزر کے فارمولے یاد ہیں اور ہم مرنے کا فارمولا بھول گئے ہیں اس لیے بغیر فارمولے کے مارے جا رہے ہیں۔ افسوس! کہ ہم وہ موت بھول گئے ہیں جس پر زندگی رشک کرتی ہے......ہم نے موت والی زندگی کو قبول کر رکھا ہے اور زندگی والی موت کو بھول گئے ہیں......ہم نے یہود و نصاریٰ کے اندازِ زندگی کو اپنی شناخت بنا لیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ انھی کی غلامی ہمارے لیے وجہ فخر بنتی چلی جا رہی ہے۔ ہم بھول گئے ہیں کہ ہمارے آقا اور مولا ﷺ نے خبردار کیا

تھا کہ ''جس قوم کے تم طور طریقے اپنا لو گے، وہی تم پر مسلط ہو جائے گی۔'' ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق نہیں بلکہ کفار کے حکم کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں اور ہمیں احساس ہی نہیں کہ عمل اور دعا کا وقت نزولِ بلا سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد تو رضا کا مقام ہے اور مسلمان مرتضٰی ہونے سے تو رہا وہ تو مرتضٰی کا نام بھی فراموش کر چکا ہے اور اس نام سے اس کی عقیدت کا اُنس بھی ختم ہو چکا ہے۔ ہم پر پیہم تازیانے برس رہے ہیں اور ہم نہیں سمجھ رہے کہ ایک تازیانے کے بعد جب کوئی قوم نہیں سنبھلتی تو دوسرا تازیانہ اس کا مقدر ہوا کرتا ہے۔ یہ قانونِ فطرت ہے اور فطرت کے قانون بدلا نہیں کرتے۔ ہم اسی لیے بجلیوں، زلزلوں اور تازیانوں کی زد میں ہیں کہ ہم سنبھلنے اور سنورنے کے بجائے روز بروز بگڑتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ پاکستان.....اسلام کا یہ قلعہ، بہر سمت کفار کی زد میں ہے۔ دنیاوی طور پر کفار اور مشرکین کی ثقافت ہمارا طرۂ امتیاز اور غازۂ رخسار ہے۔ دینی اعتبار سے ہم پارہ پارہ ہو چکے ہیں۔ ہمارا اسلام، فرقوں میں بٹ کر اپنی حقیقی عظمت کھو چکا ہے۔ ہم قرآن پاک کا فیصلہ بھول گئے ہیں۔ ''تم سب اس کی طرف رجوع ہو کر رہو اور تم سب اس سے ڈرو اور نماز پڑھو اور مشرکوں میں نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنا دین ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ ہو گئے، ہر فرقہ جو اس کے پاس ہے اس میں مگن ہے۔'' (سورۂ روم، ۳۱، ۳۲)

اخلاقی اعتبار سے ہم ''دیوث'' بن گئے ہیں، ہماری نگاہیں خائن اور دل شرابی ہیں۔ نہ کوئی چادر محفوظ ہے نہ کوئی چار دیواری، جبکہ ہم نے ہزاروں عصمتیں دے کر، اس ایک عصمت کی بنیاد رکھی تھی جس کا نام ''پاکستان'' ہے۔ ہم کو اس سے اور اس کو ہم سے بے شمار نسبتیں ہیں۔

خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
خدا کرے کہ مرے اک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو

بیت اللہ میں مسلم اُمّہ کا حال زبوں بھی یاد آیا اور پاکستان کا بننا، ٹوٹنا اور بکھرنا بھی۔ تب ضمیر جعفری مرحوم کی درج بالا منظوم دعا بھی بے ساختہ لبوں پر آئی کہ خود اس نظم میں بھی ایک نوع

کا بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ مولا کریم پاکستان پر رحم فرمائیں اور اسے اپنے حفظ و امان میں رکھیں کہ ؎

جس طرح کی ہیں یہ دیواریں یہ در جیسا بھی ہے
سر چھپانے کو میسر تو ہے گھر جیسا بھی ہے

O

☆

بے سہاروں، بے کسوں کو آسرا دیتا ہے تُو
غم کشوں کو زندگی کا حوصلہ دیتا ہے تُو

(اقبال صلاح الدین)

O

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو! ہٹ جاؤ دے دو، راہ جانے کے لیے
اے دعا! ہاں عرض کر عرشِ الٰہی تھام کے
اے خدا! اب پھیر دے رُخ گردشِ ایام کے
خلق کے راندے ہوئے، عالم کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
رحم کر، اپنے نہ آئینِ کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
خوار ہیں، بدکار ہیں، ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب ﷺ کی اُمّت میں ہیں
حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دیں گے بُت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

O

روایت ہے کہ محمود غزنوی اپنے وقت کے ایک اللہ والے، حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دعا کے لیے کہا انہوں نے وقتِ رخصت محمود کو اپنا کرتہ بطور تحفہ عطا کیا۔ محمود نے

جب سومنات پر حملہ کیا تو ہندوؤں نے یوں جم کر مقابلہ کیا کہ ایک بار محمود کی فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے، عین اس وقت محمود نے اس فقیر کا کرتہ پہن کر اللہ تعالیٰ سے فتح سومنات کی دعا کی۔ دعا قبول ہوئی اور سومنات پاش پاش ہو گیا۔ رات حضرت خرقانیؒ محمود کو خواب میں ملے اور فرمایا ''محمود! میرے کرتے کا حوالہ دے کر، اللہ پاک سے بہت کم مانگا۔ صرف ایک مندر کی فتح، اگر تو چاہتا تو پورا ہندوستان مشرف بہ اسلام ہو سکتا تھا۔'' یہ نیک انسان پہلے محنت و ریاضت سے اللہ والے بنتے ہیں پھر اللہ ان کا ہو جاتا ہے، وہ زندہ رہتے ہیں تو آیتِ الٰہی بن کر رہتے ہیں۔ مرتے ہیں تو ان کی قبریں جاگ اُٹھتی ہیں۔ اقبالؔ نے ٹھیک کہا تھا ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

محمود غزنوی نے تب جو دعا مانگی تھی وہ کچھ ایسی ہی تھی جس کی ایک جھلک آغا حشرؔ کاشمیری کے درج بالا اشعار میں جلوہ گر ہے۔ دعا وہ ہوتی ہے جس میں روح کی تڑپ شامل ہو اور بدن کا رُوَاں رُوَاں اس میں اپنی لَے ملا دے۔ دل ایک شیشہ ہے اس کے ٹوٹنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اُسے آہ کہتے ہیں چونکہ آہ لطیف ہوتی ہے اس لیے وہ آسمان کی طرف جاتی ہے اور نظامِ عالمِ بالا کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ آنسو گو موتی ہے، مگر وہ کثیف ہے، نیچے گرتا اور مٹی میں مل جاتا ہے ؎

کسی ٹوٹے ہوئے دل کی سرافرازی کا کیا کہنا
نہایت محترم ہو گا وہ شہ پاروں کی بستی میں

اہلِ سومنات کی چیرہ دستیوں سے مسلم اُمہّ آج زخم زخم ہے، آج ہمارے دنوں پر رات کی تاریکیاں پہرے دار ہیں اور آج ہم ایک کڑے دور سے گزر رہے ہیں ؎

آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

آج ہم تاریخ کے چوراہے میں تماشا بنے ہوئے ہیں اور دنیا تماشائی ہے۔ آج ساری دنیا ہماری حالت پر ہنس رہی ہے اور ہمیں اپنی حالت پر رونا نہیں آتا۔ آج شیشۂ ہائے خاطر کرچی

کر چی ہیں مگر آہیں بے تاثیر ہیں۔ خانہ کعبہ میں آغا حشر کے یہ اشعار کئی بار لبوں پر آئے اور اللہ تعالیٰ سے ملتجی رہے کہ اے اللہ! ہماری التجاؤں کو قبول فرمالے۔ تیرا شیوہ رحم کرنا ہے اور ہم رحم کے مستحق ہیں۔ ہم ٹھوکریں کھاتے ہوئے، تیرے در پر آ گئے ہیں کہ سکون و عافیت کی نعمتیں اسی در سے وابستہ ہیں۔ یہی وہ سایۂ دیوار ہے جہاں آبلہ پا سستا سکتے اور اپنے زخموں کو سہلا سکتے ہیں۔ یہی وہ دیوار ہے جس سے بقول مولانا ابوالکلام ، ہر دکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے۔ اے مالک! ہم جیسے بھی ہیں تیرے محبوب ﷺ کے اُمتی ہیں۔ ہمارے دامن میں یہی ایک نسبت ہے کہ ہم ان کے نام لیوا ہیں۔ ان کی محبت کے دعویدار ہیں اور ان کی اطاعت کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اے اللہ! تیرا فرمان ہے کہ اُن کی اطاعت ہی سے تیری محبت نصیب ہوتی ہے، ہم اطاعتِ رسول ﷺ کے معیار پر پورا اُترتے ہیں یا نہیں۔ یہ ایک الگ بات ہے مگر ہم اس اطاعت کے لیے دل کی گہرائیوں سے آرزومند ضرور ہیں۔ ہمارے دل کی انھی دھڑکنوں کو قبول فرمالے۔ ہماری بھول چوک کو معاف فرمادے۔ ہمیں اپنی رحمت سے نواز دے اور یہود و ہنود کے اس دلخراش طعنے سے بچالے کہ ''مسلم کا خدا کوئی نہیں۔''

جنگ بدر میں، اے اللہ! تو نے ہزاروں ملائکہ مدد کے لیے اُتار دیئے تھے۔ اے اللہ! ہمیں توفیق دے کہ ہم فضائے بدر پیدا کر سکیں۔

فضائے بدر اور ہم؟؟ پوری امتِ مسلمہ آزمایشوں کی زد میں ہے۔ ہم مسلمانوں کے گھر پیدا ہو گئے ہیں اس لیے مسلمان ہیں۔ ہم نے کب سوچا کہ ہر کام کا انجام، اس کے آغاز سے وابستہ ہوتا ہے۔ آغاز کی حیثیت بنیاد کی سی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ''اُن مومنین کے لیے، جن کی جانوں اور مالوں کا سودا اللہ نے کر لیا ہے۔ یہ بات روح افزا بھی ہے اور عظیم کامیابی بھی۔ اور وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، سفر کرنے والے، رکوع و سجود کرنے والے، اچھائی کے داعی اور برائی کو روکنے والے اور اللہ کی حدود کا خیال رکھنے والے ہیں۔'' (۱۱۲۔۹)

قرآن پاک نے توبہ کو جملہ عبادات و معاملات کی بنیاد بنایا ہے جبکہ مقصودِ زندگی، رضائے خداوندی ہے۔ گویا گناہوں سے تائب ہونا آغاز ہے اُس انتہا کا جس کا نام اللہ تعالیٰ کا راضی ہو جانا ہے اپنے بندے سے۔ توبہ، بنیاد ہے اور باقی تدریجی اور تکمیلی مراحل ہیں۔ افسوس کہ ہم بنیاد کے بغیر عمارت استوار کرنے کی بیکار سعی کر رہے ہیں۔ لازم ہے کہ سب سے پہلے توبہ کی جائے اور

وہ بھی سچے دل سے۔ زنگ آلود لوہے سے جب تک زنگ کھرچا نہیں جائے گا، اس وقت تک نہ اس پر کوئی رنگ چڑھے گا اور نہ اس پر چمک آ سکے گی۔ ہمیں اپنی نگاہ کو عصمت، دل کو طہارت اور زبان کو صداقت عطا کرنے کی امکانی سعی کرنی چاہیے۔ سچی طلب کے ساتھ سعیٔ پیہم، ہماری طرف سے ہونی چاہیے اور پھر رحمتِ خداوندی از خود شریک حال ہو کر، سعی و عمل کو رنگ و آہنگ عطا کر دے گی..... اللہ تعالیٰ ہمیں گناہ چھوڑنے اور توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے، عبادات کو رعنائی اور معاملات کو زیبائی بخش دے، تاکہ بنیاد بھی مضبوط ہو اور اس پر استوار ہونے والی عمارت بھی نظر افروز اور دل آویز۔ سچی بات یہ ہے کہ نگاہ کی خیانتیں ہی، دل کو خباثتیں دیا کرتی ہیں۔ ضروری ہے کہ ہم ان خیانتوں اور خباثتوں سے یوں توبہ کریں کہ اُن کی یاد بھی باقی نہ رہے تاکہ ہوس، چھپ چھپ کر دل میں کوئی تصویر نہ بنا سکے۔ تب فضائے بدر بھی پیدا ہوگی اور ہماری اعانت کے لیے ملائکہ بھی گردوں سے قطار اندر قطار اُتریں گے۔

O

☆

ذرّہ ذرّہ تر زباں ہے صدق سے، تسبیح میں
عقل و دانش گُم ہیں تری ذات کی توضیح میں

(وقار صدیقی اجمیری)

O

الٰہی! عاقبت محمود گرداں
بلائے بود را نا بود گرداں

دعائیہ نوعیت کا یہ شعر بھی اکثر وردِ زباں رہا کہ اے مالک حقیقی! دنیاوی مصائب ہوں یا اُخروی سختیاں، سب بلاؤں کو دور فرما کر اور عاقبت کو محمود بنا کر، انوار سے معمور کر دے۔ اللہ تعالیٰ جب اپنے فضل وکرم سے کسی انسان کی عاقبت کو حسن عطا کرنا چاہیں گے تو اس کی دنیاوی حیات کے مستعار لمحوں کو بھی لازماً رنگ ونور کی قوس قزح عطا فرمائیں گے کیونکہ اس حیات مستعار کے حسن ہی پر، اُخروی زندگی کی سرخروئی لَو دے گی، اسی لیے اللہ پاک نے ہم کو رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ .....کی شکل میں ایک جامع دعا سکھائی ہے اس میں دنیاوی زندگی کے حسن کی آرزو پہلے ہے کہ وہ بنیاد ہے آخرت کے حسین ہونے کی۔ انسانی زندگی مادیت اور روحانیت دونوں سے عبارت ہے۔ حسنِ توازن دونوں میں ہو تو بات بنتی ہے۔ کامیاب وہی ہے جس کے پاس اس دنیا کی نعمتیں بھی ہوں اور اُس دنیا کی سعادتیں بھی۔ اس عاجز کے نزدیک انسان کو اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرنے کی مقدور بھر کوشش کرنی چاہیے کہ یہ تمام امور فرائض میں شامل ہیں۔ ان میں کوتاہی نہ ہو اور انسان بہر حال اس بارگاہِ بندہ نواز میں جھکا رہے اور اس کے ساتھ ہی یہ سمجھے کہ پوری کائنات اس کے لیے ایک عبادت گاہ ہے۔ اس لیے حقوق العباد کی طرف قدم قدم توجہ مبذول رہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو سجدوں، اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ کو محبتوں اور خلق خدا کو شفقتوں سے خوش رکھے کہ یہی آئینِ فطرت ہے۔ یہی رمزِ مسلمانی، اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

ایک مسنون دعا کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ''اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ میں راہِ ہدایت سے بھٹک جاؤں، یا کوئی مجھے گمراہ کر دے یا میں راہِ حق سے پھسل جاؤں یا کوئی مجھے

پھسلا دے یا میں کسی پر زیادتی کروں یا کوئی مجھ پر ظلم و زیادتی کرے یا مجھ سے کوئی نادانی اور جہالت کا کام سرزد ہو یا کوئی مجھ پر جہالت مسلط کرے۔''

ایک اللہ والے سے کسی نے جنت کے حصول کا آسان نسخہ پوچھا تھا۔اس نے کہا کہ فرائض کو ادا کرنے کے بعد صرف تین اُمور کا خیال رکھو، دو باتوں کا تعلق تمہاری سوچ سے ہے، ایک کا تمہارے عمل سے۔ پہلی بات یہ کہ اگر کوئی تم پر زیادتی کرتا ہے، تمہیں تکلیف پہنچاتا ہے تو اُسے موردالزام نہ ٹھہراؤ، نہ اس کو برا بھلا کہو، بلکہ یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے ایسا کرنے کی توفیق دی اور یہ اس کی مشیت تھی۔ دوسری بات اگر تم سے کوئی لغزش ہو جائے تو فوراً اللہ تعالیٰ کے حضور میں جھک جاؤ اور اپنی خطا کا کھلے بندوں اعتراف کرلو۔ تیسری بات اگر تم سے کسی کی دل آزاری ہو جائے یا اُسے کوئی تکلیف پہنچے تو فوراً اس سے معذرت کرلو، کیونکہ کچھ علم نہیں کہ ایک سانس کے بعد دوسرا سانس آتا ہے یا نہیں، اور کیا علم کہ کب ؎

آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

سادہ سی بات یہ ہے کہ دل ایک آبگینہ ہے، شیشے سے بھی زیادہ نازک اور یہ کائنات دکانِ شیشہ گر، قدم قدم احتیاط لازم ہے۔ عام شیشہ ٹوٹ جائے تو اس کی کرچیاں، غیر محتاط انسان کو لہو لہو کر دیتی ہے مگر جب دل کا شیشہ ٹوٹتا ہے تو اس کے ٹوٹے ٹکروں کا کرب انگاروں سے زیادہ تیز اور تلواروں سے زیادہ بے باک ہوتا ہے۔ ؎

جانے، دلِ تپاں نے ستاروں سے کیا کہا
افلاک جل رہے ہیں ستاروں کی آگ سے

گویا فرائض کی امکان بھر ادائی کے بعد، کسی کا دل نہ دکھانا ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ اسی سے اُخروی فوز و فلاح کے دروازے کھلتے ہیں۔ روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ سے بہترین اور افضل ترین عمل کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''افضل ترین عمل کسی غمزدہ دل کو خوش کرنا ہے۔''

ہمیں اپنے حال کو سنبھالنا چاہیے، مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ''حال کے عمل سے ماضی کا عمل بدل سکتا ہے۔ ماضی کفر ہو تو حال کلمہ پڑھ کر مومن ہو سکتا ہے اور حال مومن ہو جائے تو ماضی بھی مومن۔''

O

جن کے دامن میں دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں
ان غریبوں کی دعاؤں میں اثر بھی چاہیے

دعا، ہماری حیاتِ مستعار کا ایک بہترین سہارا بھی ہے اور سرمایہ بھی.....دعا کا انداز تقرب کے اظہار کا اعلان ہے۔ دعا الفاظ کی محتاج بھی ہے اور الفاظ سے بے نیاز بھی۔ دعا منظور فرمانے والا خود ہی انداز عطا فرماتا ہے، ہاتھ اُٹھانا بھی دعا ہے، ملتجی نگاہ کا اُٹھنا بھی دعا ہے.....دعا پر اعتماد ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے۔ یہ بڑے نصیب کی بات ہے کہ انسان دعا کا سہارا ہاتھ سے نہ جانے دے۔ جب کسی قوم یا فرد کا دعا سے اعتماد اُٹھ جائے تو آنے والا وقت مصیبت کا زمانہ ہوتا ہے۔ گناہ اور ظلم انسان سے دعا کا حق چھین لیتے ہیں۔ دعا کا یہی مقام ہے کہ انسان تقربِ الٰہی کی خواہش کو کمزور نہ ہونے دے۔ دعا یہ ہے کہ اللہ ہمیں اپنی رحمت سے مایوس نہ ہونے دے۔ دعا یہ ہے کہ ہمارا دل نورِ ایمان سے روشن ہو۔ دعا یہ ہے کہ اللہ ہمیں منظور ہونے والی دعاؤں کی آگہی عطا فرمائے اور وہ دعائیں جن پر بابِ قبول بند ہو، ان کی توفیق عطا نہ فرمائے۔'' (۷)

حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی لغزش معاف کرنے کے لیے، خود معاف کرنے والے نے ایک جامع دعا تعلیم فرمائی۔ گویا ہماری زندگی کی ابتدا دعا ہی کے سائے میں ہوئی اور انتہا بھی دعا ہی کے دامن میں ہوتی ہے۔ دعا، یاس کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ایک روشن چراغ ہے۔ دعا وہ ہے جس میں دل کی جملہ دھڑکنیں اور روح کی جملہ لرزشیں، ایک فریاد، ایک آہ اور ایک آنسو میں ڈھل کر رحمت خداوندی کو عرش سے فرش پر لے آئیں۔'' بہر حال جب تک زندگی ہے دعا رہے گی۔ سر نیاز کا بے نیاز کے سامنے جھک جانا بھی دعا ہے۔ کسی بے بس کی نگاہ کا خاموشی سے سوئے فلک

اُٹھنا بھی دعا ہے بلکہ مضطرب دل کی دھڑکن بھی دعا ہے۔ کسی دور رہنے والے کو محبت سے یاد کرنا بھی دعا ہے۔ روح کی مخلصانہ آرزو بھی دعا ہے۔ دعا دینے والے کے در پر کبھی ہم سائل بن کر جاتے ہیں اور کبھی دعا دینے والا خود ہمارے در پر دستک دیتا ہے۔ ہم کسی کی دعا کی تاثیر ہیں، ہماری دعائیں کسی اور زمانے کو اثر دیں گی۔ منظور ہو یا نامنظور، دعا بدستور جاری رہنی چاہیے۔''(۸)

چونکہ وہ ذات حکیم و بصیر ہے۔ وہ خوب جانتی ہے کہ کون سی دعا قبول کرنا ہے اور کون سی نہیں، کون سی نتائج کے اعتبار سے ہمارے لیے مفید ہے اور کون سی مضر۔ بچہ تو انگارا پکڑنے کے لیے بے چین رہتا ہے، والدین اُسے اس سے بچاتے ہیں۔ اس رحیم و کریم ذات نے ہمارے لیے رحمت کا ایک خوبصورت پہلو یہ بھی رکھا ہے کہ ہماری جو دعا قبول نہیں ہوتی وہ اُسے ہمارے لیے اُخروی سرمایہ بنا دیتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آخرت میں بندہ اپنی غیر مقبول دعاؤں کو بیش بہا سرمائے کی شکل میں پائے گا۔ تو آرزو کرے گا کہ کاش! اس کی سبھی دعائیں غیر مقبول رہتیں..... بہرکیف دعا ایک عظیم نعمت ہے بندے کو خدا سے ہمکلام رکھتی ہے۔ پریشانیوں میں دل کو طمانیت بخشی اور راحتوں میں غفلت سے دور رکھتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ ہم یکسوئی کے ساتھ خالق کائنات سے مخاطب ہوں اور اس کے برابر کسی کو نہ سمجھیں۔

اللہ تعالیٰ کے بلاوے پر، جب ایک بندہ ''لبیک لبیک'' کہتے ہوئے اس کے دروازے پر حاضر ہوتا ہے تو اس کے دامن میں ماضی کی پشیمانیوں کے ساتھ ساتھ حال اور مستقبل سے متعلق بہت سی آرزوئیں بھی ہوتی ہیں۔ وہ تمناؤں کے بہت سے خاکے لے کر آتا ہے۔ طغیانِ آرزو۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی تمام خواہشیں پوری ہو جائیں، تکمیلِ آرزو کی خاطر، اس کی بے چینیاں بسا اوقات نوکِ مژہ پر تل جاتی ہیں۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر اور تڑپ تڑپ کر، تمناؤں کی باریابی چاہتا ہے، اپنی تمناؤں کے ساتھ ساتھ عزیزوں اور دوستوں کی بہت سی آرزوئیں بھی وہ بطور امانت لے کر آتا ہے۔ وہ اُن کے لیے تڑپتا ہے اور غائبانہ التجاؤں کو قبولیت نصیب ہوتی ہے کیونکہ وہ خلوص کے گرد گھومتی ہیں۔ انسان اگر خود کو بھول کر دوسروں ہی کے لیے سراپا دعا رہے تو کہیں بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ادا سے خوش ہو کر اس کی اپنی حاجات خود ہی پوری کر دیا کرتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ یہاں آتے ہی وہ لوگ بھی کسی نہ کسی طور یاد آ جاتے ہیں جو انسان کی فہرستِ دعا میں شامل نہیں ہوتے، بعض خوابوں میں ملتے ہیں اور بعض خیالوں میں آتے ہیں۔

یوں انسان سب کے لیے سراپا دعا بنا رہتا ہے اور اپنی ذات کے ساتھ کائنات لے کر چلتا اور

بہرلمحہ اپنے نالوں کو رسا دیکھنے کا آرزومند رہتا ہے۔ فانیؔ کہاں یاد آ گیا۔

آخر کوئی اُمیدِ اثر بھی دعا کے بعد
کچھ آپ بھی کہیں گے، مری التجا کے بعد

آخر میں چند ملفوظات

O عمل صالح کے بغیر دعا کرنا، کمان کا چلہ چڑھائے بغیر تیر چلانے کے مترادف ہے۔
(حضرت علیؓ)

O اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری دعا قبول ہو تو صرف لقمۂ حلال کھاؤ۔
(امام غزالیؒ)

O دعا کو غنیمت سمجھو، یہ مصائب کے تیروں کے سامنے ڈھال کا کام دیتی ہے۔
(سعدیؒ)

O دعا کے لیے ہاتھ اُٹھانے میں کوتاہی نہ کر، یہ نہ سوچ کہ وہ قبول ہوتی ہے یا نہیں۔
(رومیؒ)

O

☆

آتے نہیں انداز مجھے حُسنِ طلب کے
اے رحمتِ یزداں! یہ مرا دستِ دعا ہے
(پاکیزہ بیگ)

O

دم لے کے ایک لمحہ چلے جائیں گے فقیر
سن کر تمہارے حسن کی تعریف آ گئے

اللہ تعالیٰ حسن ہیں، مرکزِ حسن، حسن آفریں اور

حسن خود حسن ہوا اُن کے حسیں ہونے سے

یہ کائنات، یہ سماوات اُسی ایک حسن کے مختلف مظاہر ہیں۔ ہم کسی حسن کی تعریف کریں، بات حسن آفریں تک جاتی ہے ؎

ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو دیارِ حسن میں آئے، درِ حسن پر پہنچے اور بارگاہِ حسن میں باریاب ہوئے۔ وہ یوں بھی خوش نصیب ہیں کہ آئے نہیں لائے گئے ہیں۔ انہیں طلب فرمایا گیا ہے۔ کسے بلانا ہے، کسے نہیں، محبوبِ حقیقی ہی بہتر جانتے ہیں کہ کسے فیضیاب کرنا ہے، کسے انتظار میں رکھنا ہے، کسے فراق میں تڑپانا ہے اور کسے وصل میں بہلانا ؎

سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا، سبھی راحتیں، سبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں، کبھی فرقتیں، کبھی دُوریاں، کبھی قربتیں

یہ محبوب ہی کی مختلف ادائیں ہیں اور حسن کی ہر ادا، دل آویز بھی ہوتی ہے اور دل نواز بھی۔ وجہِ نشاطِ روح بھی ہوتی ہے اور باعثِ نور نگاہ بھی۔ حاضر ہونے والا، ایک عمر حسن کی تعریفیں سنتا رہتا ہے۔ اس بارگاہ میں حاضری کے لیے تڑپتا رہتا ہے اور جب بلایا جاتا ہے تو قربت کے لمحے گریزپا ہوتے ہیں، مہینے، گھڑیوں کی صورت اُڑتے چلے جاتے ہیں ؎

جب تک نہ ملے تھے تو جدائی تھی قیامت
اب مل کے بچھڑ جانے کا غم یاد رہے گا

وصل کے بعد فراق کا تصور، روح فرسا ہوتا ہے اور یہ امر حقیقت لگتا ہے کہ اصل زندگی تو یہیں رہ جانے اور یہیں مر جانے کا نام ہے، اور حقیقی مسرت تو کوئے محبوب میں پیوند زمیں ہو جانا ہے ؎

جینے کا سہارا ہے تو کوچہ ہے انھی کا
مرنے کا ٹھکانا ہے تو اک اُن کی گلی ہے

اقبالؔ نے بانگ درا میں ایک نظم ''شفاخانۂ حجاز'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس زمانے میں یہ خبر عام ہوئی کہ انگریز جدّہ میں ایک شفاخانہ کھول رہے ہیں۔ لوگوں نے اس کے لیے ہندوستان میں چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ مگر بزرگانِ ملت اس امر کو حجاز میں انگریزی اثر و رسوخ کی بنیاد سمجھتے تھے اور انہیں یہ قبول نہ تھا۔ اسی موقع پر اقبالؔ نے اپنے انداز میں یہ نظم لکھی۔ بعد میں یہ تجویز ختم ہوگئی اور اس کے خاتمے میں اس نظم کا بھی بہت اثر ہوا۔ اقبالؔ نے اس نظم میں چندہ طلب کرنے والوں سے کہا کہ آپ اس شفاخانے کے ذریعے بیماروں کو زندگی کا پیغام سنا رہے ہیں۔ میں بیمار اُلفت ہوں، میں تو سرزمینِ حجاز میں موت کا تمنائی ہوں۔ عاشق کو جو لذت موت کا جام پینے میں ملتی ہے خضر کو وہ عمر دراز میں بھی نصیب نہیں۔ اہلِ درد، مسیحا سے بے نیاز ہوا کرتے ہیں ؎

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت، ڈھونڈتا ہوں دیارِ حجاز میں

چونکہ دیارِ خدا و رسول ﷺ میں وقت مختصر ہوتا ہے اور گزارشات طولانی..... فقیر، دم بھر کے قیام میں قلب و نظر کی وہ سرشاری چاہتا ہے جو اس کے لیے زندگی بھر کا ایک قیمتی سرمایہ بن جائے اور یہی سرمایہ اس کی برزخی اور اُخروی زندگی کو بھی شاداب بنا جائے۔ یہاں تو انوار ہی انوار ہیں۔ افسوس کہ ہم یہاں حاضر ہو کر نور کی یہ ارزانی کم مانگتے اور ضروریات دنیاوی کی فراوانی زیادہ طلب کرتے ہیں۔ حسن طلب یہی ہے کہ دنیاوی زندگی اور اُخروی زندگی دونوں کی سرخروئی کے لیے التجا کی جائے کہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

کتنی جامع دعا ہے جسے رکن یمانی سے حجر اسود تک، دورانِ طواف میں، مانگنا رسول اکرم ﷺ کی سنت ہے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ.

آخر میں چند شعر ؎

خدایا! پیکرِ ظلمت کو حسنِ زندگی دے دے
مجھے اپنا پسندیدہ طریقِ بندگی دے دے
شکوہِ خسروی ہرگز نہ مشتِ خاک کی مانگوں
مرے مولا! متاعِ خیر کی تابندگی دے دے
کثافت پیکرِ خاکی کی سب کافور ہو جائے
مری سانسوں کو ذکر و فکر کی وہ نغمگی دے دے
ہو ظاہر شکل سے، برسے لبوں سے، روح میں گونجے
ادائے شکر کو اتنی حسیں وارفتگی دے دے

O

☆

تیری دُوری سے مرے دل نے یہ محسوس کیا
درد شعلہ بھی ہے، نغمہ بھی ہے، آواز بھی ہے

(حافظ لدھیانوی)

O

تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم
ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے، ہمارا کیا ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس اولین گھر کی محفل کو جس انداز سے آراستہ کر رکھا ہے وہ انداز، نظر افروز ہی نہیں، دلکشا بھی ہے۔ ہر دل ایک نئے کیف سے سرشار ہوتا ہے، ہر سوچ، ایک نیا زاویہ لیتی ہے اور ہر لمحہ ایک نئے حسن سے نکھار پاتا ہے۔ ہم ظاہر بین تو محض چشمِ سر سے دیکھتے ہیں کہ سیاہ غلاف میں ملبوس ایک چوکور سی چار دیواری ہے اور لوگ والہانہ انداز میں اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ رکن یمانی کو چھونے، حجر اسود کو چومنے، ملتزم سے لپٹنے کا التزام ہے۔ اکثریت دو سادہ سی سفید چادروں میں لپٹی ہوئی ہے مگر اللہ نے جن کو بصیرت عطا کر رکھی ہے وہ حسن خانہ کے ساتھ ساتھ صاحب خانہ کے جلووں کو بھی دیکھتے ہیں۔ اُن کے سامنے ہر لحظہ نیا طور ہوتا ہے اور ہر لمحہ نئی برقِ تجلی..... ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی .....سب سے بڑی سعادت اور رحمت بصارت کو بصیرت کا عطا ہو جانا ہے۔ پھر ؎

وہ تمام ایک جلوہ، میں تمام ایک سجدہ
مری بندگی میں حائل، نہ جبیں نہ آستانہ

خواجہ معصوم سرہندیؒ نے طواف قدوم کے درمیان کیا دیکھا۔

''اس وقت ہم نے دیکھا کہ نہایت حسین وجمیل مردوں اور عورتوں کی ایک جماعت طواف میں ہمارے ساتھ شریک ہے اور اس جماعت کا طواف نہایت اشتیاق و اتصال کے ساتھ ہے۔ اُن کا طواف اس دنیا کے لوگوں کے مانند نہیں۔ وہ ہر ساعت

بیت عتیق کو بوسہ دیتے ہیں اور ہر لحظہ کعبہ معظّمہ سے معانقہ کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اس جماعت کے قدم زمین سے اونچے ہیں یعنی زمین پر ٹکے ہوئے نہیں ہیں اور اُن کے سر آسمان تک پہنچے ہوئے ہیں اور مشاہدہ ہوا کہ کعبۂ حسنیٰ بھی اس جماعت کے ساتھ آسمان تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہوا کہ مذکورہ مرد فرشتے ہیں اور مذکورہ عورتیں جنت کی حوریں ہیں۔''

شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں۔

''میں نے خدا کے اس قدیم گھر اور اس عالی منزلت عمارت یعنی خانہ کعبہ کو دیکھا کہ ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل کی ہمتیں اس کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کے ساتھ یہ اس طرح متعلق ہیں جیسے بدن میں روح کا تعلق ہوتا ہے۔ نیز میں نے خانہ کعبہ کو ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل کی ہمتوں اور ان کی روحوں میں اس طرح گھرا پایا جیسے گلاب کے پھول کے اندر عرق اور روئی کے اندر ہوا سرایت کی ہوئی ہے اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس مقدس گھر کی طرف لوگوں کے دلوں میں جو توجہ اور التفات پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ہمتوں کا تعلق اس بارگاہ سے ہوتا ہے جو مشتمل ہے ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل پر۔ اور چونکہ خانہ کعبہ میں ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل کی ہمتیں اور ان کی ارواح بھری ہوئی ہیں اسی لیے لوگوں کے دلوں میں خانہ کعبہ کے لیے محبت جوش مارتی ہے۔''

اور اس گئے گزرے دور میں، پروفیسر سید محمد ابوالخیر کشفیؔ لکھتے ہیں۔

''ہم لوگوں نے جب خانہ کعبہ میں قدم رکھا تو آدھی رات کا ہنگام تھا اور میں نے دیکھا کہ غلاف کعبہ میں حرکت سی تھی۔ غلاف، کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ یہ تو رات تھی جس نے غلاف کو اپنا پردہ بنا لیا تھا۔ انسانی آوازوں کے درمیان خاموشی کا ایک جزیرہ تھا اور رات اس خاموشی کے جزیرے میں انفاس ہوا سے پیامِ دوست سن رہی تھی۔ یہ شب جمعہ تھی، جب میں اپنے آپ میں آیا تو خود کو طواف کعبہ کرتے ہوئے پایا۔''

ایسے میں دل سے یہ آواز نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس گھر کی ظاہری رونق کو اسی طرح آباد رکھے اور اس کی باطنی کیفیات کو اسی طرح بڑھاتا چلا جائے تاکہ ظاہر بین آنکھیں بھی ایسے منظر سمیٹتی رہیں جو ان کی حیاتِ مستعار کی متاعِ عزیز بنے رہیں اور وہ لوگ جن کے دل کی آنکھیں بھی کھلی ہوئی ہیں وہ بیت اللہ کے جلووں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے انوار سے بھی فیضیاب ہوتے رہیں جو ہر روز ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوتا اور رہتا ہے ؎

اس کے حریمِ ناز میں عقل وخرد کو دخل کیا
جس کی گلی کی خاک کا ذرّہ جہانِ راز ہے

رہ گئی بات ہم زائرین کی، ان کا قیام تو غیر مستقل ہے، لحاتی اور عارضی ہے۔ آرزو یہی ہے کہ بیت اللہ کی فضا اسی طور ضیاؤں، نواؤں اور دعاؤں سے معمور رہے۔ اس گھر کے مالک کی ذات بھی لم یزل ہے اور اس کی صفات بھی مستقل۔

میں نے جب بھی بوقتِ رخصت خانہ کعبہ کو نگاہوں میں سمیٹتے ہوئے، لَوٹتے قدموں کے ساتھ، فیضؔ کے درج بالا شعر کو دہرایا تو آنسوؤں نے نگاہوں کے سامنے ایک چادر سی تان دی کہ ؎

اب دل کے فسانے کو بیاں کرتے ہیں آنسو
اب ہم سے ترے غم کی حفاظت نہیں ہوتی

O

☆

اشکوں کا ایک سیلِ رواں لے گیا تھا میں
اشکوں کا ایک سیلِ رواں لے کے آ گیا

(عبدالکریم ثمر)

O

جو ذہن کے ساحل سے گزرتا ہے گماں ہے
جو دل کے سمندر سے اُبھرتا ہے یقیں ہے

برادرِ مکرم محمد متین خالد نے 'بارگاہِ رسالت ﷺ میں' کے نام سے مسجد نبوی اور مواجہہ شریف کے بارے میں زائرین کے تاثرات کو یکجا کیا۔ انھوں نے مجھے یہ تالیف بھیجی تو معاً میرے دل میں یہ خیال آیا کہ خانہ کعبہ کے بارے میں زائرین کے اوّلین تاثرات کو بھی یکجا ہونا چاہیے۔ مشیتِ ایزدی نے ارادۂ انسانی کی تائید فرمائی، چنانچہ جناب ضیاء اللہ کھوکھر اور جناب شبیر احمد خاں میواتی کی اعانت سے کم وبیش ۳۳۵ سفرنامہ ہائے حج میرے پاس جمع ہوگئے اور میں نے ''کعبہ پہ پڑی جب پہلی نظر'' کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی۔ حسین اتفاق یہ ہے کہ اس کتاب کے صفحات بھی ۳۳۵ ہی ہیں۔ بیت اللہ کے بارے میں زائرین کے یہ ایمان افروز تاثرات زمانی ترتیب سے ہیں اور ۱۰۵۰ء سے لے کر ۲۰۰۵ء کو محیط ہیں۔ یہ کتاب ''خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں'' کی ایک روداد دلنواز ہے، خانہ کعبہ پر پڑنے والی پہلی نظر کی کیف سامانیاں ہیں۔ اس میں تجلیات کی فراوانی اور نگاہوں کی تنگ دامانی کی داستانیں ہیں۔ پلکوں پر لرزنے والے آنسوؤں کی اپنی اپنی چمک اور دل کی دھڑکنوں کا اپنا اپنا انداز ہے۔ ذوق وشوق کی سرمستیاں، آداب وحدود کی نزاکتوں سے ہم آہنگ ہیں۔ جبینِ نیاز میں مچلتے آنسوؤں کی داستانِ شوق ہے۔ بابِ اثر سے لوٹتی ہوئی دعاؤں کی قوسِ قزح ہے اور واردات قلب ونظر ہیں، جلال وجمال سے جلیل وجمیل تک اور سوز وگدازِ سجود سے دلوں کی کشود تک۔ میں اُدھر سے اِدھر آنے والے رہروانِ شوق کو دعا کے لیے کہا کرتا تھا کہ خانہ کعبہ میں دعا کریں کہ

اس کتاب کو طباعت کا بانکپن بھی نصیب ہو۔ اللہ کے فضل سے ۲۰۰۶ء میں حج کے موقع پر میرے تینوں بیٹے، مع اہل وعیال حرم پاک میں یکجا تھے۔ اُن کو بھی دعا کے لیے کہہ رکھا تھا۔ جملہ احباب کی دعاؤں کو شرف قبول ملا اور جناب محمد متین خالدؔ کے مشورے پر ادارہ علم وعرفان لاہور نے اُسے چھاپا۔ ۱۵ مارچ ۲۰۰۶ء کو مجھے جناب محمد متین خالدؔ نے اطلاع دی کہ الحمدللہ کتاب جلد بندی کے مراحل میں ہے۔ کتاب مجھے نہ مل سکی کیونکہ مجھے مع اہلیہ وزٹ ویزا کے ذریعے ۱۶ مارچ ۲۰۰۶ء کو ریاض اپنے بیٹے طاہرؔ اقبال کے پاس جانا تھا اور پھر وہاں کا ارادہ تھا جہاں..... سجدوں سے اور بڑھتی ہے رفعت جبین کی..... جہاں دل بولنے لگتا ہے زباں سے پہلے..... جہاں آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق اور جہاں وسعتِ دامن بھی دیتے ہیں عطا کرتے ہوئے۔ محمد متینؔ خالد صاحب نے کتاب ڈاک کے ذریعہ ریاض بھیجی جو مجھے دیارِ خدا و رسول ﷺ سے واپسی پر موصول ہوئی۔ کتاب دیکھ کر دل میں یہ حسرت اُبھری کہ کاش، وہاں جانے سے پہلے مل جاتی تو اسے بھی بیت اللہ کی زیارت کرا دی جاتی..... ویزے کی مدت ۱۵ مئی کو ختم ہونا تھی۔ میں اور اہلیہ عمرے پر اکیلے گئے تھے۔ جناب پروفیسر عطاء الرحمٰن عتیقؔ کی ہدایت تھی کہ پہلے مدینہ پاک جائیں پھر مکہ۔ انہوں نے Through proper chanell کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ چنانچہ ہم ریاض سے مدینہ ہوائی جہاز کے ذریعے گئے اور مکہ سے ریاض بذریعہ بس آئے۔ واپسی پر بیٹے نے مع اہل وعیال ہمارے ساتھ عمرہ کے لیے بذریعہ بس جانے کا پروگرام بنایا۔ بس کی ٹکٹیں بھی لے لیں۔ صرف عمرے کا ارادہ تھا۔ کچھ ملازمت کی مجبوریاں، کچھ بچوں کی تعلیم کا تسلسل، دل میں تھا کہ کاش، مدینہ منورہ بھی حاضری ہو جاتی کہ میری بہو عزیزہ طیبہ لبلبے کی سوزش کی وجہ سے شدید علیل ہو گئی۔ اُسے ہسپتال داخل کرانا پڑا۔ طبیعت اللہ تعالیٰ کے فضل سے سنبھل گئی۔ مگر ڈاکٹر نے اُسے سفر سے روک دیا اور بیٹا، اس کی علالت کی بنا پر گومگو میں تھا۔ بہو نے کہہ دیا کہ آپ جائیں، میں اب نسبتاً ٹھیک ہوں۔ آئرلینڈ سے بڑے بیٹے کا فون آیا، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہاں ڈاکٹر ہے۔ اس نے کہا کہ علالت کی نوعیت کے پیش نظر نہ اس کا جانا درست ہے اور نہ ریاض تنہا رہنا، چنانچہ میرے کہنے پر بس کی ٹکٹیں واپس کر دی گئیں۔ دو ایک دن بعد بیٹا، ہم دونوں کے لیے ہوائی جہاز کی ٹکٹیں لے آیا کہ ہم بذریعہ جدہ، مکہ جائیں، وہاں سے مدینہ اور پھر بذریعہ ہوائی جہاز، ریاض آ جائیں۔ یوں ۳ مئی ۲۰۰۶ء کو ہم جدے سے مکہ پہنچے۔ جب پہلے گئے تھے تب عمرے نہیں کھلے تھے اس لیے حرم میں رش نہ تھا۔ اب کے رش خاصا تھا۔ سورج بھی خوب چمک رہا تھا کہ مجھے، اہلیہ اور کتاب (کعبہ پہ پڑی

جب پہلی نظر) تینوں کو عمرہ ادا کرنے کی توفیق ملی اور نہیں معلوم کیسے؟ رش کے باوجود کتاب ملتزم سے پہلے لپٹی اور میں کتاب کے بعد۔ البتہ سعی کے بعد حلق میں نے اکیلے ہی کرایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے عظیم وقدیم گھر سے متعلق یہ واحد کتاب ہے جسے طواف وسعی کی توفیق عطا ہوئی۔ میں نے کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا کہ ''آخر میں آرزو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حرم کعبہ سے متعلق اس ''قلمی عجز ونیاز'' کو شرف قبول بخشیں۔

می توانی کہ دہی اشکِ مرا حسنِ قبول
اے کہ دُر ساختہ ای، قطرۂ بارانی را

صد شکر کہ اس آرزو کو حسنِ قبول ملا اور اللہ تعالیٰ کے بلاوے پر، میں اس کتاب کو بیت اللہ میں لے کر نہیں آیا بلکہ خود یہ کتاب مجھے لے کر آئی اور یہ محض خیال نہیں، بلکہ یقین ہے کہ اس تالیف کے توسط سے اللہ تعالیٰ کی رحمتیں میرے اور جملہ متعلقین کے شریکِ حال رہیں گی۔

جو ذہن کے ساحل سے گزرتا ہے گماں ہے
جو دل کے سمندر سے اُبھرتا ہے یقیں ہے

O

☆

تجھے تسکینِ دل پایا، تجھے آرامِ جاں پایا
نہاں بھی ہے تو کیا، تجھ کو جہاں ڈھونڈا، وہاں پایا
(محمد علی جوہرؒ)

O

مناجات

حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس اللہ سرہٗ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمُ.

اِلٰھِیْ اَنْتَ رَبِّیْ وَ قَوِّیْ اَنَا عَاجِزٌ اِلٰھِیْ اَنْتَ مَالِکِیْ وَ اَنَا مَمْلُوْکٌ

الٰہی! عاجز ترین عاجزانم، الٰہی جاہل ترین جاہلانم، الٰہی دانم تاچہ گونہ رضائے تو جویم، الٰہی نمی دانم تاچہ گویم، الٰہی عجز و درماندگیٔ من تو می بینی، الٰہی حاجتِ من تو می دانی، الٰہی من بے چارہ و عاجز، ہیچ حیلہ وقوت و وسیلہ نہ دارم وآنچہ جز تست ازان بیزارم، الٰہی من ضعیف و درماندہ راومنِ نحیفِ درہائے راندہ راومنِ مدہوش سیاہ کار گناہ گار راومن بدکردار راومن انقیادِ فرمانِ شیطان راومن استادِ مکتبِ عاصیاں راومن مدہوش سرگشتہ راومن عاجز در بدر گشتہ راومن گنہ گار بدافعال راومن خاکسارِ بداعمال راومن ثابت ناتمام راومنِ عہد شکنِ خودکام راومنِ گندم نمائے جوفروش راومنِ زنّار دار خرقہ پوش راومن سیاہ رونامہ سیاہ راومنِ منافقِ تبہ کار را بفضل عمیم ولطفِ قدیم خود از بندِ نفسِ امارہ خلاصی دہ وتوبۂ نصوحا عطا کن کہ طاقتِ حضرت عدل تو ندارم۔ الٰہی مرا توفیق دہ کہ ترا بہ پرستم کہ بے توفیق تو ترا نتواں پرست۔ الٰہی مرا تعریف دہ کہ ترا بشناسم کہ بے تعریف تو ترا نتواں شناخت۔ الٰہی ضائع کردم عمرِ خویش بران چیز کہ رضائے تو نبود۔ ومن نہ دانستم ازان توبہ کردم دیبزار گشتم، اے دستگیر ہر شکستہ واے دلیل ہر درماندہ واے فریادرسِ دشوار ہائے واے چارہ ساز بے چارگان واے قبول کنندۂ توبۂ عاصیان واے پذیرندۂ گریختگان واے حلیمے کہ حلمِ تو مارا گستاخ کرد واے رحیمے کہ رحمِ تو مرا بے باک گردانید، این گستاخی و بے باکی از ما عفو کن وخلعت معرفت

ہمہ اعضائے مارا بپوشان۔ الٰہی بحق طفیل و تسبیح و تحمید و تمجید جملہ روحانیان و کرّوبیان۔ الٰہی بحرمت عابدان و زاہدان، الٰہی بحرمت خواصگانِ درگاہ تو، الٰہی بحرمتِ لواحقان حضرتِ تو، الٰہی بحرمتِ غریبانِ شہادت جوانان، الٰہی بحرمت آبِ دیدۂ عاصیان، الٰہی بحرمتِ عفو توبۂ عاصیانِ درگاہِ تو۔ الٰہی بحرمت عز و جلال تو، الٰہی بحرمت عظمت و کمال تو کہ حاجاتِ من و جملہ مسلمانان روا کنی، و ایمان مارا در دنیا و آخرت برما ارزانی داری۔ الٰہی چون دران حجرۂ تنگ و تاریک، بے شمع مارا مبتلا کنی ایمانِ مارا چراغ لحد گردانی۔ بحق لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

ترجمۂ مناجات

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمُ.

اے اللہ! تو ہی میرا رب ہے، تو قوی ہے اور میں عاجز ہوں۔ اے اللہ تو ہی میرا مالک ہے اور میں تیرا مملوک۔ اے اللہ میں عاجزوں میں سب سے زیادہ عاجز ہوں۔ اے اللہ میں جاہلوں میں سب سے زیادہ جاہل ہوں۔ اے اللہ میں نہیں جانتا تھا کہ کس طرح تیری رضا حاصل کروں، اے اللہ میں نہیں جانتا کہ کیا عرض کروں، الٰہی میرے عجز و بیچارگی کو تو دیکھتا ہے۔ الٰہی میری حاجتوں سے تو واقف ہے۔ اے اللہ! میں بے چارہ و عاجز ہوں اور کوئی حیلہ، قوت اور وسیلہ نہیں رکھتا ہوں مگر تیرے سوا جو کچھ بھی ہے اس سے بیزار ہوں۔

الٰہی! مجھ ضعیف و درماندہ کو، مجھ کمزور اور دربدر ٹھکرائے ہوئے کو، مجھ سیاہ کار گناہگار و مدہوش کو، مجھ بدکردار کو، مجھ کو جو شیطان کے حکم کا مطیع و فرمانبردار ہے مجھ کو جو گناہگاروں کے مکتب کا استاد ہے مجھ کو جو مدہوش و سرگشتہ ہے، مجھ عاجز کو جو در در کا ٹھکرایا ہوا ہے اور مجھ گناہگار بدافعال کو، مجھ خاکسار، بداعمال کو مجھ ثابت ناتمام کو، مجھ عہد شکن مطلب پرست کو، مجھ گندم نما جو فروش کو، مجھ زنّار دار خرقہ پوش کو، مجھ سیاہ رو سیاہ کار کو، مجھ منافق تباہ کار کو اپنے فضل عمیم اور لطف قدیم سے نفس امارہ کی قید سے نجات دے اور توبۂ نصوح عطا کر۔ اس لیے کہ میں تیرے دربار عدل کی قوت نہیں رکھتا۔ اے اللہ! مجھے توفیق عطا کر کہ میں تیری پرستش کروں، اس لیے کہ تیری توفیق کے بغیر تری

پرستش ممکن نہیں۔ اے اللہ! مجھے معرفت عطا کرتا کہ تجھے پہچانوں، اس لیے کہ بغیر معرفت حاصل کیے تجھے نہیں پہچانا جاسکتا۔ اے اللہ! میں نے اپنی تمام عمر اس چیز کے حصول میں ضائع کردی جس میں تیری رضا نہ تھی اور اسے میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے اس سے توبہ کی اور بیزار ہوا۔

اے دستگیر ہر شکستہ، اے دلیل ہر درماندہ، اے مشکلات میں فریاد سننے والے، اے بیچاروں کے چارہ ساز، اے گناہگاروں کی توبہ قبول کرنے والے، اے منکروں کو قبول کرنے والے، اے حلیم کہ تیرے حلم نے مجھے گستاخ بنادیا، اے رحیم کے تیرے رحم نے مجھے بے باک کردیا، ہماری اس گستاخی اور بے باکی کو معاف کردے اور معرفت کی خلعت ہمارے تمام اعضاء کو پہنادے۔ اے اللہ! تمام روحانیوں اور فرشتوں کی تمجید وتحمید وتسبیح اور تہلیل کے صدقے میں، اے اللہ! تمام عابدوں اور زاہدوں کی حرمت کے صدقے میں، اے اللہ! اپنی درگاہ کے خواص کے طفیل میں، اے اللہ! اپنے لواحقینِ دربار کے واسطے سے، اے اللہ! جوان شہیدوں کی شہادت کے واسطے، اے اللہ! گناہگار بندوں کے آنسوؤں کی حرمت کے طفیل، اے اللہ! ان گناہگاروں کے طفیل جنہوں نے تیری بارگاہ میں توبہ کی، اے اللہ! اپنی عزت وجلال کی حرمت کے واسطے سے، اے اللہ! اپنی عظمت وکمال کے صدقے میں، میری اور تمام مسلمانوں کی حاجتوں کو پورا کر۔ ہمارے ایمان کو دنیا وآخرت میں ہم پر زیادہ کردے، اے اللہ! جب تو اُس حجرۂ تنگ وتاریک میں بے شمع ہمیں مبتلا کرے تو اُس وقت ہمارے ایمان کو چراغِ لحد بنادے۔

نہیں ہے کوئی الٰہ مگر اللہ، نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ نہیں ہے کوئی محبوب مگر اللہ، نہیں ہے کوئی مطلوب مگر اللہ، نہیں ہے کوئی مقصود مگر اللہ، نہیں ہے کوئی موجود مگر اللہ، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، اے ارحم الرّٰحمین، اپنی رحمتِ کاملہ سے رحمتیں نازل فرما۔ ان پر جو بہترین مخلوق ہیں یعنی ہمارے سردار حضرت محمد ﷺ پر اور اُن کی آلِ پاک پر اور ان کے تمام اصحاب پر۔

مترجم: سید محمد نعیم ندوی

بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں

قدمین شریفین کی جانب واقع

سفید ستون کے نام

تاریخ، محمد ﷺ کا نشانِ کفِ پا ہے
یہ بات غلط ہے کہ قدم کچھ نہیں لکھتے

O

دو جہاں کی نعمتیں مانگوں، تو رکھوں گا کہاں
آپؐ اپنا ہاتھ رکھ دیں میرے خالی ہاتھ پر

☆

سلام پہنچے.....آمنہ کے اس لال کو جس نے ہمیں اپنی رحمۃً للعالمینی کے دامن میں پناہ دی۔ ہمارے بازوؤں کو کشور کشائی کی طاقت بخشی۔ ہمارے دلوں کو اپنی خندہ جبینی سے آفتاب و مہتاب کی طرح جگمگایا۔ ہمیں ایمان کی لافانی دولت سے مالا مال کیا۔ جس پر قرآن حکیم ایسی لازوال کتاب نازل ہوئی۔ جو مسکرایا۔ تو چمنستانِ کونین کے پھولوں نے ہنسنا سیکھا..... جو اُٹھا..... تو پہاڑوں نے سربلندی پائی۔ جس کے خرامِ ناز سے صبا نے ٹہلنا سیکھا۔ جس نے کائنات کو نورانی کیا..... جو نور میں سب سے پہلے .....اور.....ظہور میں سب سے آخر تھا.....جس کی توانائیوں نے ہمیں کائنات کی تسخیر پر قادر کیا۔ جس نے عرب کے بدوؤں اور حجاز کے ساربانوں کو شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنا سکھایا۔ جس نے عرب وعجم کی تمیز مٹا ڈالی۔ جس نے انسانوں پر انسانوں کی فوقیت کو ختم کیا اور تقویٰ، دیانت، فراست کو انسانی شرف ومجد کی دلیل ٹھہرایا.....!

سلام پہنچے.....اس محسنِ کائنات کو جس کی امت کہلانے کی اللہ تعالیٰ نے ہمیں توفیق ارزانی کی۔ جس نے ہمیں سکھایا کہ عبادت کے لائق ایک رب ہی کی ذات ہے جس کی بدولت ہماری تمام عبادتیں، تمام سجدے اور تمام طاعتیں اللہ کے لیے ہیں..... جو ہمیں سیدھی راہ دکھاتا اور اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے.....وہ نعمتیں جو ہمارے چاروں طرف بکھری پڑی ہیں.....اور

سلام پہنچے.....اللہ کے اس جلیل القدر پیغمبر ﷺ کو..... جو کائنات کی تخلیق کا باعث ہے جس کا عشق ہمارا قبلۂ مراد اور کعبۂ ذوق ہے..... جو تمام نبیوں میں آخری نبی ہے..... جس کی ختم المرسلینی پر ساڑھے تیرہ سو برس میں کئی رہزنوں نے دست درازی کرنا چاہی لیکن وقت کی غیرت نے انہیں نقشِ آب کی طرح محو کر دیا۔ جن کی قبروں کے نشان فطرت کی دستبرد سے غبارِ معصیت ہو کر اُڑ گئے۔

سلام پہنچے.....اس تاجدارِ انسانیت کبریٰ کو، جو ہم سب کا ملجا وماویٰ ہے جس پر ہم اپنے ماں باپ قربان کرتے اور مال واولاد نچھاور کرتے ہیں..... جو بظاہر گنبدِ خضرا میں سو رہا ہے لیکن جس کی چشمِ نگراں ارض وسما کی وسعتوں اور پہنائیوں سے باخبر ہے.....ہم حقیروں میں اتنی ہمت کہاں کہ حضور ﷺ کی ثنا کر سکیں۔ یہاں قلم عاجز اور زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گُم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

بہ قول سید مہر علی شاہ علیہ الرحمۃ:۔

سبحان اللّٰہ ما اجملک ما احسنک ما اکملک

کتھے مہر علی، کتھے تیری ثنا، گستاخ اکھّیں کتھے جا اڑیاں

ترجمہ: سبحان اللہ! آپ ﷺ کتنے جمیل، کتنے مکمل اور کتنے احسن ہیں۔ کہاں مہر علی، کہاں آپ ﷺ کی ثنا (اللہ اللہ) گستاخ آنکھیں کہاں جا اڑی ہیں۔

(شورش کاشمیریؒ)

☆

اے تیرے رُخ سے حُسن کے اسرار آشکار
تیری جبیں، جمالِ الٰہی سے تابدار

(نظیر لودھیانوی)

O

السّلام اے تازہ تر گلبرگِ صحرائے وجود
السّلام اے قیمتی تر گوہرِ دریائے جُود

نبیٔ کریم ﷺ کے ہم عاصیوں پر اس قدر احسانات ہیں کہ ہم اُن احسانات کا حق کسی طور پر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ ہم سے تو کماحقہٗ اعتراف بھی نہیں ہو پاتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسانِ خاص ہے کہ انہوں نے ایک آسان سا عمل بتا دیا کہ اس ذاتِ گرامی قدر کے احسانات کے لیے سراپا سپاس ہونے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اپنے لبوں پر درود وسلام کے نذرانے سجا لو کہ یہ ایک ایسی تشکر آمیز اور روح افزا دُعا ہے کہ یقینی طور پر قبول بھی ہے اور مقبول بھی۔ اللہ تعالیٰ کے جملہ احکامات پر غور کر لیں سوائے درود پاک کے کوئی حکم ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو کہ یہ کام میں بھی کرتا ہوں اور فرشتے بھی اور تمھیں بھی یہی حکم ہے۔ اس سے نبیٔ پاک ﷺ کی فضیلت واضح ہوتی ہے ۔

درودِ پاک کے نغمے زمیں سے آسماں تک ہیں
مرے اشکِ محبت سے، مکان ولا مکاں تک ہیں

خود حضور ﷺ نے ایک صحابیؓ کو ان کے استفسار پر فرمایا کہ چلو، درود ہی پڑھتے رہو کہ یہ تمام دعاؤں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مجھ پر کسی کتاب میں درود لکھے تو اس وقت تک اس کو ثواب ملتا رہے گا جب تک میرا نام اس کتاب میں رہے گا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم نبیٔ کریم ﷺ کا اسم پاک آتے ہی درود پڑھیں اور لکھیں صرف ''ؐ'' لکھ دینا توہین رسالت ہے۔ نہیں معلوم اختصار کی یہ بخیلی، درود پاک ہی میں کیوں در آئی ہے۔ انگریز کی غلامی میں لفظ ''محمدؐ'' ﷺ بھی اسی بخیلی کی زد میں رہا۔ تب مسلمان اپنا نام تو پورا لکھتے تھے مگر 'محمدؐ' کے لاحقے یا سابقے کو مختصراً Mohd تک محدود رکھتے تھے۔ بہرکیف اس اسمِ پاک کے ساتھ پورا درود لکھنا' حکم الٰہی بھی ہے، ہمارا فرض بھی ہے اور اخلاق کا تقاضا بھی۔

''درود فطری طور پر ہر اس مسلمان کے دل سے نکلے گا جسے احساس ہو کہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے بعد ہمارے سب سے بڑے محسن ہیں۔ اسلام اور ایمان کی جتنی قدر انسان کے دل میں

ہوگی، اتنی ہی زیادہ قدر اس کے دل میں نبیٔ کریم ﷺ کے احسانات کی بھی ہوگی اور جتنا زیادہ آدمی ان احسانات کا قدر شناس ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ حضور اکرم ﷺ پر درود بھیجے گا، پس درحقیقت درود ایک پیمانہ ہے جو ناپ کر بتا دیتا ہے کہ دینِ محمد ﷺ سے ایک آدمی کو کتنا گہرا تعلق ہے اور نعمت ایمان کی کتنی قدر اس کے دل میں ہے۔'' (۱۰)

سوچتا ہوں کہ میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ سلام، درود ابراہیمی کی شکل میں بھی مواجہہ شریف پر پیش کر رہا ہوں اور خوبصورت نعتیہ اشعار کی صورت میں بھی (کہ نعت درُود وسلام ہی کی ایک شعری شکل ہے) اس یقین کے ساتھ کہ میرا سلام، میرے آقا اور مولا (ﷺ) براہِ راست سماعت بھی فرما رہے ہیں اور مجھے جواب سے بھی سرفراز فرما رہے ہیں۔

بحمد للہ! میں اللہ تعالیٰ، ملائکہ اور بے شمار خوش نصیبوں کا ہم زبان ہوں جو اس روضۂ پاک پر ہر لمحہ درود وسلام کے پھول برسا رہے ہیں اور اس کائنات کے گوشے گوشے سے نیاز و ناز کے یہ نذرانے یہاں پیہم پہنچائے جا رہے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے درود وسلام کو فرض قرار دے کر اسے ہم خطا کاروں کی بخشش کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ ورنہ حضور پاک ﷺ اور ہم گناہگاروں کی دعا کے محتاج؟ محتاج فی الواقع ہم ہیں کہ ہم التجا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس ذاتِ اقدس ﷺ پر زیادہ سے زیادہ رحمت نازل فرما کہ وہ رحمت عالم ہیں۔ جتنی زیادہ رحمت وہاں نازل ہوگی اتنی ہی زیادہ ہم پر تقسیم ہوتی چلی جائے گی، درج بالا مولانا جامیؒ کا شعر ہے کہ نبیٔ پاک ﷺ ایک تازہ اور شگفتہ پھول ہیں جو اس زندگی کے صحرا میں خوشبو بکھیرتا جا رہا ہے اور آپ ﷺ جود وسخا کے سمندر کے ایک قیمتی موتی ہیں..... حق یہ ہے کہ درود وجہِ نزولِ رحمت باری ہے ؎

محوِ ثنا ہوں، گنبدِ خضریٰ نظر میں ہے
ہر لحظہ ذوق وشوق کی دنیا نظر میں ہے

ثنا وسلام دراصل تحسین ہے۔ مصورِ حقیقی کے سب سے بڑے شاہکار کی، مصورِ حقیقی کی آرزو ہے کہ اس کے نقش بہترین کی بہترین تعریف ہو، تعریف کرنے والا اگر صاحب نظر ہے تو اس کی قدر شناسی، مصور کے نزدیک لعل و جواہر سے بھی گراں سمجھی جائے گی، تحسین، نظر، ظرف اور توفیق کے مطابق مختلف ہوا کرتی ہے۔ بعض صرف زبان سے اعتراف کرتے ہیں، بعض تخلیق کو دیکھ کر وجد میں آ جاتے ہیں، بعض مصور کی عظمتوں کے حضور میں جھک جھک جاتے ہیں اور بعض کا شوقِ دید، آنسوؤں میں ڈوب جاتا ہے۔ آنسوؤں کی زبان سے ادا ہونے والی ستائش خود مصور کے دل

میں سرخوشی بن کر سما جاتی ہے، نقش دیکھتے دیکھتے اگر نقاش بھی مل جائے تو یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔ حضور اکرم ﷺ نقاشِ ازل کا نقش بہترین ہیں۔ جو دیکھنے والا اُن کے حسن کی تحسین کرتا ہے وہ دراصل نقاش حقیقی کے جذبۂ رحمت اور لطفِ بے نہایت کو جوش میں لاتا ہے۔ یوں فطرت کی نوازشاتِ بے پایاں اس کا احاطہ کر لیتی ہیں۔

O

☆

تیرا شہود، باعثِ تکوینِ کائنات
تیرا وجود، جوہرِ ارضِ تجلّیات

(حکیم احمد شجاع ساحر)

O

سلام اے آمنہ کے لال، اے محبوبِ سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات، فخرِ نوعِ انسانی
سلام اے آتشیں زنجیرِ باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے
ترا در ہو، مرا سر ہو، ترا گھر ہو، مرا دل ہو
تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

عرصہ ہوتا ہے کہ ایک دوست نے عمرے سے واپسی پر بتایا کہ وہ مواجہہ شریف پر حاضری کے وقت سلام کے بعد موزوں لفظوں کی تلاش میں تھے کہ اچانک زبان پر یہ شعر جاری ہوگیا ؎

سلام اے آمنہ کے لال، اے محبوبِ سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات، فخرِ نوع انسانی

نہیں معلوم لاشعور میں سالوں پہلے کی بتائی ہوئی یہ بات محفوظ تھی کہ مجھے جب بھی حاضری کی توفیق ملی تو اس شعر نے حاضری کو حضوری میں بدلنے کی اپنی سی سعی کی، یوں یہ شعر پریشاں خاطری کے لیے طمانیت کا باعث بنا اور پلکوں پر ستارے سے لرزتے رہے کہ ؎

آنسو قبول ہوں درِ خیر الانام پر
نالے طوافِ روضۂ خیر البشر کریں

اللہ تعالیٰ حفیظ جالندھریؔ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیں کہ ان کے قلم کو ''شاہنامۂ اسلام'' لکھنے کی ایک عظیم سعادت نصیب ہوئی اور فی الحقیقت یہی ان کا توشۂ آخرت ہے۔ شاہنامۂ اسلام میں جس طرح تاریخ کی عظیم سچائیاں شاعرانہ رعنائی کے دامن میں لو دے رہی ہیں وہ فی الواقع اللہ تعالیٰ کی عطا اور گنبد خضریٰ کی رضا کا نتیجہ ہے۔ درج بالا شعر میں حفیظ جالندھریؔ نے حضور ﷺ کو فخرِ موجودات اور فخرِ نوع انسانی کہہ کر سلام پیش کیا۔ آمنہ کا لال کہہ کر حضور ﷺ کو اُن

کی والدہ ماجدہ کی یاد دلائی کہ آپ ﷺ جب ابواء کے مقام پر اُن کی قبر پر تشریف لے گئے تو بہت روئے تھے اور وہ آنسو جن کا ہر قطرہ فضیلت میں کائنات سے افضل ہے جناب آمنہ کے مرقد پر موتیوں کی طرح برستے رہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آمنہ کی گود کو کائنات کی افضل، اجمل، اکمل اور احسن شخصیت سے نوازا۔ ؎

بغایت شانِ زیبائی، بصد اندازِ رعنائی
امیں بن کر، امانت، آمنہ کی گود میں آئی

حضرت آمنہؓ نے آپ ﷺ کا نام 'احمد' رکھا تھا اور دادا نے 'محمد' لفظ محمد کا مطلب ہے تعریف کیا گیا اور احمد کا مطلب ہے، تعریف کرنے والا، گویا آپ ﷺ، وہ عظیم الشان انسان ہیں جن سے زیادہ کسی کی تعریف نہیں کی گئی اور جن سے زیادہ کسی نے اپنے خالق کی تعریف نہیں کی۔

میں اس شعر کے ساتھ درج بالا دو شعر بھی ملا لیا کرتا تھا کہ اس فخر موجودات اور فخر نوع انسانی کی پیغمبرانہ کاوشوں نے باطل کی دَھجیاں فضائے عالم میں بکھیر دیں اور مسلمانوں کے دلوں کو محبت اور اخوت کی لازوال دولت دے کر، ایک کر دیا.....اور انھی کے در کی جاروب کشی، ہماری پلکوں کا اعزاز اور انھی کا آستانہ ہمارے دلوں کی محبتوں کا مرکز اور ہماری نگاہوں کی تمناؤں کا محور ہے۔ یہ آستانہ عرش سے بھی نازک ہے، ایک ایسی ادب گاہ کہ اہلِ دل اور اہلِ نظر اس مقام پر سانس بھی ہولے سے لیتے ہیں، حافظ لدھیانویؔ نے کہا تھا ؎

اے زائرِ درگاہِ نبی ﷺ جائے ادب ہے
آئے نہ ترے دل کے دھڑکنے کی صدا بھی

نبیٔ پاک ﷺ کا وجودِ اطہر، زمین کے جس حصے میں آرام فرما ہے، وہ حصہ بہر نوع افضل ترین ہے۔ اگر دونوں جہانوں کی عظمتوں اور فضیلتوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور دوسرے پلڑے میں نبیٔ اکرم ﷺ کا مبارک جسم تو دوسرا پلڑا وزنی اور بھاری رہے گا۔ مکین کی اس عظمت نے اس مکان کو بھی شرف بخش دیا ہے کہ بقول اقبالؔ، زمین اس وجود اطہر کے فیض سے ارجمند ہے اور آسمان اسی عتبۂ عالی کو بوسہ دے کر بلند و رفیع ہو گیا ہے۔ حافظ ابن قیمؒ سے کسی نے استفسار کیا تھا کہ کیا کعبہ، روضۂ اطہر سے افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا تھا کہ ''نہیں، خدا کی قسم روضۂ اطہر، کعبے سے افضل ہے، عرش اور حاملینِ عرش سے بھی افضل، جنتِ عدن سے بھی افضل

اور آسمانوں سے بھی افضل ہے۔''

اسی وجودِ ناز کا فیض ہے کہ پورا مدینہ ادب گاہ ہے اور مدینے سے تعلق رکھنے والی ہر چیز قابل ستائش، مدینے کے ذرے بھی قابل صد احترام ہیں، مدینے کی فضا درود وسلام کی نواؤں سے ہر لحظہ معمور ہے، مدینے کی ہوا میں انفاسِ رسالت ﷺ کی مہک رچی ہوئی ہے اور مدینہ فی الواقع برکتوں، سعادتوں، فضیلتوں اور رحمتوں کا مرکز ہے ؎

در تیرا ہر اک راہ کا محور نظر آیا
جس رُخ سے چلے لوگ یہی در نظر آیا
آنکھوں کو ترے شہر سے وہ ربط ہوا ہے
ہم لوٹ بھی آئے تو برابر نظر آیا

O

☆

دل مدینہ کو چلا، آنکھیں چلیں سوئے حرم
ہر مسافر جا رہا ہے، اپنی منزل کی طرف
(رعنا اکبر آبادی)

O

سلام اس پر کہ جس نے فضل کے موتی بکھیرے ہیں
سلام اس پر بُروں کو جس نے فرمایا 'یہ میرے ہیں'

درُود وسلام ایک سکون آفرین وظیفہ بھی ہے اور ایک مقبول ومبرور دعا بھی۔ ایک بار درُود بھیجنے سے، بھیجنے والے پر دس رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اس کے دس درجے بلند ہوتے ہیں، دس گناہ معاف ہوتے ہیں اور دس نیکیوں کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ سورۂ احزاب کی آیت ۷ میں ہمیں درود بھیجنے کا حکم دیا گیا۔ شروع میں واضح کیا گیا کہ میں اور میرے تمام فرشتے (جن کی تعداد کا اللہ ہی کو علم ہے) پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں، مومنو! تم بھی اس وظیفہ میں میری اور میرے فرشتوں کی اقتدا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا مسلسل درود بھیجنا، پیہم نزول رحمت ہے، فرشتوں کا اور ہمارا درود بھیجنا، التماسِ نزولِ رحمت بھی ہے اور اظہارِ تعظیم بھی۔ انتہائے عظمت یہ ہے کہ ہم گناہگار، اپنے نبی ﷺ پر درُود بھیجتے ہیں اور اس درُود کا جواب، درُود ہی کی شکل میں ہمیں بارگاہِ الوہیت سے عطا ہوتا ہے اور یہ شرف ہم سے پہلے نہ کسی امت کو ملا اور نہ حضرت محمد ﷺ سے پہلے کسی نبی کو۔ اللہ تعالیٰ نے درُود کو ہماری دعاؤں کی قبولیت کا ایک ذریعہ بنایا، ظاہر ہے کہ درود، قبول ہی قبول ہے اور درُود کے ہالے میں پیش کی جانے والی دعا بھی لازماً قبول ہے۔ ہر دعا یا تو قبول ہوگی یا رد، جبکہ درُود، اللہ تعالیٰ کا اپنا پسندیدہ عمل ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا محبوب عمل ہم پر فرض کر کے ہم پر خاص احسان فرمایا اور یہی عمل، عیارِ محبت بھی ہے اور معیارِ محبت بھی اور یہی محبت، دلیل ایمان ہے جبکہ مواجہہ شریف کے سامنے درود وسلام، شفاعت کی بین دلیل۔ اور خوش نصیبی کی انتہا کہ وہاں سے براہِ راست جواب بھی عطا ہوتا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ فرشتے، درود بھیجنے والے کا نام، اس کے باپ کے نام کے ساتھ، بطور ہدیۂ نیاز، بحضور ناز پیش کیا کرتے ہیں۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ کے الفاظ میں ''درود شریف کے پڑھنے، سننے اور پھیلانے میں دونوں جہانوں کی خیر وصلاح مضمر ہے اور قرب الٰہی یقینی ہے۔ یہ سیاہ کار ہمیشہ اپنے دوستوں سے عرض کرتا رہتا ہے کہ دل سے موت کو ہمیشہ یاد رکھو اور زبان سے جتنا ہو سکے درُود شریف پڑھتے رہو۔''

گویا درود و سلام دنیا کی ہر پریشانی کے لیے شافی اور آخرت کی ہر آزمایش کے لیے کافی ہے۔ ایک صحابیؓ نے نبیٔ کریم ﷺ سے عرض کیا ''یارسول اللہ ﷺ اگر میں سارے (دعاؤں کے) وقت کو آپ ﷺ پر درود کے لیے وقف کر دوں تو کیسا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ، تیرے دنیا و آخرت کے سارے تفکرات کی کفایت فرمائے گا۔''

سلام سے متعلق ماہر القادریؒ کے درج بالا شعر کا تعلق بھی مسجد نبوی ہی سے ہے کہ میں اسے وہاں پڑھتا رہا۔ آپ ﷺ نے فضل و کرم کے موتی بکھیرے، اپنے دامانِ رحمت کو امتِ عاصی کے لیے دنیا سے آخرت تک پھیلا دیا۔ طائف میں پتھر کھائے اور جواباً دعاؤں کے پھول برسائے۔ طائف میں صورتِ حال یوں تھی کہ مسلسل پتھراؤ سے آپ ﷺ کی ایڑی اور پاؤں زخمی ہو گئے تھے اور مبارک جوتے خون سے تر بتر۔ اس عالم میں آپ ﷺ نے جو رقت انگیز دعا مانگی وہ تاریخ میں ''دعائے مستضعفین'' کے نام سے موسوم ہے۔

مجھے یہ شعر دہرانا اس لیے بھی پسند خاطر تھا کہ اس کے دوسرے مصرع میں ایک حدیث پاک کی طرف اشارہ ہے۔ ''اطّالح لی'' بُرے میرے ہیں۔ گویا حضور ﷺ ہم بُروں کے لیے اِس دنیا میں باعثِ رحمت اور اُس دنیا میں وجہِ شفاعت ہیں ؎

ہم سیہ کاروں کا تیرے ما سوا کوئی نہیں
یا شفیع المذنبیں، یا رحمۃ للعالمیں

اور ظاہر ہے کہ رحمت و شفاعت خطا کاروں ہی کو نوازا کرتی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک بار شفیع المذنبین ﷺ! ساری رات ایک ہی آیت پڑھتے رہے۔'' حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ وہ آیت یہ تھی۔

اِنْ تُعَزِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَ اِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ. (مائدہ۔۱۱۸)

''اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخش دے تو تو ہی غالب اور حکمت والا ہے۔''

الغرض درود و سلام ہمارے لیے وجہِ رحمت ہے۔ زندگی کی ظلمتوں میں نور اور تمازتِ محشر میں عرش کا سایہ ہے۔ یہ قرب کا ایک دل آویز ذریعہ ہے۔ ایک پاکیزہ محرک ہے کہ یاد کا جواب یاد سے ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے بھی، فرشتوں کی جانب سے بھی اور خود ممدوحِ عظیم و جلیل کی طرف سے بھی۔ یاد کے تسلسل ہی سے تعلق کی بنیاد استوار رہتی ہے، یہی وہ تذکرہ ہے جس سے

اعمال کا حسن نکھرتا، لحد عنبریں رہتی اور مغفرت کے ایوان کھلتے ہیں۔ قبولیت دعا کے لیے درود اُچک لے جانے والی بجلی سے بھی زیادہ تیز رفتار ہے، یہ دعاؤں کا محافظ، رضائے الٰہی کا حاصل اور سعادتوں کا سرچشمہ ہے۔ جبکہ سلام، نعت گوئی کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی اور نعت ثنا و تعظیم اور رحمت و عطوفت کو غم جاں اور غم دوراں سے ہم آہنگ کر کے اس انداز سے پیش کرتی ہے کہ اس کی لَے، کہیں ذات میں گم ہو جاتی ہے، کہیں صفات سے انوار سمیٹتی ہے، گاہے اشکوں کو صوت و صدا بناتی ہے، کبھی روح کی لرزشوں کو نغمگی عطا کرتی ہے۔ کہیں دل کی بے چینیوں کا اظہار ہو جاتی ہے اور کہیں زمانے کی کلفتوں کا تذکرہ، گویا سلام سے بال و پر لینے والی نعت، ذاتی ہوتے ہوئے بھی کائناتی وسعتوں کی آئینہ دار ہے۔ یہ امت کی ایک ایسی فریاد ہے جو اس ذاتِ اقدس کے حضور میں پیش کی جاتی ہے جو فی الواقع ثنا و تعظیم کے قابل ہے جس کی رحمت بیکراں ہے اور جس کی عطوفت، ضرب المثل ہے۔

اب بھی مجھے سرکار کی رحمت پہ یقیں ہے
کل بھی مجھے سرکار کی رحمت پہ یقیں تھا

O

☆

ہوتا ہے جدھر چشمِ توجہ کا اشارہ
رُخ اپنا بدلتی ہے زمیں آپ، زماں آپ
(آغا صادق)

O

مدینہ کعبہ صفت محترم زعالم شد
ز افتخارِ قیامِ تو یارسول اللہ ﷺ

دیارِ خدا اور رسول ﷺ میں حاضری کے بعد، لوٹنے والوں سے عموماً یہ استفسار کیا جاتا ہے کہ مکہ اور مدینہ میں کیا فرق محسوس کیا؟ میرے نزدیک اس نوع کا استفسار بھی غلط ہے اور تقابل بھی نامناسب۔ تقابل تو زبانِ نبوت نے فرما دیا کہ وہاں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر اور یہاں پچاس ہزار نمازوں کے برابر۔ اس کے بعد تقابل غیر انسب ہے۔ علامہ اقبالؒ، درج بالا شعر میں لفظ ''صفت'' کے استعمال سے بات کو پر معنی بنا گئے ہیں۔ مقابلہ تو دو ہم سروں میں ہوتا ہے جب تشبیہاً بات کی جاتی ہے تو برابر نہیں ٹھہرایا جاتا بلکہ خوبی کے اعتبار سے مشبہ بہ، مشبہ سے بڑھ کر بھی ہوتا ہے اور بہر نوع مکمل بھی۔ اگر ہم کہتے ہیں کہ ''وہ چاند صفت خوبصورت ہے'' تو صاف ظاہر ہے کہ وہ بہت حسین ہے مگر چاند نہیں ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ علم بیان کو اپنی درسیات میں اس حقیقت کا اضافہ کر لینا چاہیے کہ اس کائنات میں محمد ﷺ ہی ایک ایسی شخصیت ہیں جن کے مقابل ہر مشبہ بہ، وجہ تشبیہ کے اعتبار سے مشبہ سے کم تر ہے۔)

اقبالؒ، درج بالا شعر میں یہی کہتے ہیں کہ کعبہ بھی محترم ہے، مدینہ بھی، مکہ کو احترام ملا کرتا تھا کعبے کی بنا پر اور آج بھی ملتا ہے۔ مگر خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ البلد میں فرمایا

''میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں اور آپ اس شہر میں مقیم ہیں۔'' (۲،۱)

گویا اللہ تعالیٰ نے حقائق کو سمجھانے کے لیے آپ ﷺ کے مولد و مسکن کی قسم کھائی کہ تب رسول اکرم ﷺ کا قیام مکہ میں تھا، جب اس سورت کا نزول ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں مکہ محترم ٹھہرا۔ آپ ﷺ کے مولد و مسکن ہونے کی بنا پر..... دوسری طرف مدینہ مسکن بھی رہا اور مدفن بھی..... اور تا قیامت نبیٔ کریم ﷺ وہیں جلوہ فرما بھی۔ زبانِ عقیدت کا سلام سن بھی رہے ہیں اور جواب بھی

عطا فرما رہے ہیں۔ گویا آپ ﷺ کے اس قیام و دوام نے مدینہ کو محترم بنا دیا، تمام دنیا میں اور تمام دنیا کے لیے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے الفاظ میں:۔

''مکہ نہیں، بلکہ مکہ کا وہ عظیم الشان فرزند ﷺ اگر نہ ہوتا، جس نے تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ زندگی کے دھارے کو موڑ دیا اور دنیا کو ایک نیا رستہ دکھایا تو دنیا کا یہ نقشہ نہ ہوتا۔''

گویا مدینہ نبیٔ کریم ﷺ کے مسکن و مدفن ہونے کی بنا پر اس قدر محترم ہے کہ ہم اپنے دل کی جملہ عقیدتوں کو اپنی پلکوں میں سمیٹ کر اس کے ذروں کو چومتے ہیں کہ ان ذروں نے اُن مبارک قدموں کو چوما ہوا ہے جن کے خرامِ ناز سے ہزاروں طور اُبھرتے اور ہزاروں جلوے بکھرتے تھے۔

یہ دنیا کی جنت، مدینے کی بستی
جہاں ذرہ ذرہ، زر افشاں زر افشاں
یہاں خار و خس کے جلو میں ملی ہیں
ہزاروں بہاریں، خراماں خراماں
یہاں بے بصر بھی عیاں دیکھتے ہیں
نقوشِ محبت، فروزاں فروزاں
یہیں سے ملا تھا، یہیں مل سکے گا
سکونِ دل و جاں، سکونِ دل و جاں
کرشمے ہیں ان کی نگاہِ کرم کے
خیاباں خیاباں، بہاراں بہاراں

انوار سے معمور اور جلووں سے بھرپور اس دیارِ ناز میں
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

ادب کا وہی قرینہ جو پندرہ صدیوں پہلے یہاں پیش کیا گیا وہ آج بھی ہر زائر کے لیے نشانِ راہ ہی نہیں، نشانِ منزل بھی ہے۔ ہمارے اسلاف لفظ لفظ اور قدم قدم مؤدب تھے۔ آپ ﷺ کی محفل میں صحابہ کرامؓ یوں ساکت و صامت انداز میں بیٹھتے تھے جیسے اُن کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہوں۔ آپ ﷺ کا لعابِ دہن زمین پر نہیں صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں پر گرتا تھا، وضو کا مستعمل پانی وہ اپنے بدن پر مل لیتے تھے۔ آپ ﷺ کا ہر موئے مبارک تبرکاً حاصل کرنے کے لیے

لپکتے تھے۔ آپ ﷺ کی محفل میں اپنی آوازوں کو پست رکھتے تھے۔ بعد میں امام مالکؒ، نبیٔ کریم ﷺ کا اسم مبارک سنتے ہی انتہائی مؤدب ہو جاتے تھے، ایک دن استفسار پر انہوں نے فرمایا'' اگر حضور ﷺ کی وہ شان اور عظمت تم دیکھتے جو میں دیکھ رہا ہوں تو تمہیں میری اس غایت درجہ تعظیم وتکریم پر حیرت نہ ہوتی۔'' درسِ حدیث کے دوران میں انھیں ایک بچھو نے کئی بار کاٹا۔ اُن کا چہرہ زرد اور متغیر ہوتا رہا مگر وہ صبر وضبط کا مجسمہ بنے رہے کہ ان کے پیشِ نظر حدیثِ پاک کا احترام تھا۔ وہ مدینہ میں گھوڑے پر سوار نہیں ہوتے تھے کہ وہ سرزمین گھوڑے کے سُم پامال نہ کریں جسے رسالت مآب ﷺ کے قدوم میمنت لزوم نواز چکے ہیں، حضرت امام احمد بن حنبلؒ مدینے کی حدود میں ننگے پاؤں چلا کرتے تھے۔ حق یہ ہے کہ یہ نبیٔ پاک ﷺ کے نقوش پا ہی کا فیض ہے کہ دل والوں کے نزدیک مدینہ ایک تجلی گاہ ہے اور وہ نگاہ اُٹھاتے ہیں تو سینکڑوں جلوے اُن کی نگاہوں سے لپٹ لپٹ جاتے ہیں ؎

بس اک فروغِ نقشِ کفِ پا کے فیض سے
ہر ذرّہ آفتاب تری رہگزر میں ہے

O

☆

اے رہروانِ شوق یہاں سر کے بل چلو
طیبہ کے راستے کا تو کانٹا بھی پھول ہے
(کوثر نیازی)

O

پیمبرﷺ کا ''یہاں'' پر آستاں ہے
زمیں کا اِتنا ٹکڑا آسماں ہے

ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ تھی۔ ہجرت کا گیارھواں سال اور دوشنبہ کا دن، جب آپﷺ، رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ تب عمر مبارک ۶۳ سال تھی۔ صحابہ کرامؓ رو رہے تھے کہ کوئی دن اس سے تابناک اور بہتر نہ تھا، جس دن رسول اللہﷺ مدینہ تشریف لائے تھے اور کوئی دن اس سے زیادہ تاریک نہ تھا۔ جس دن آپﷺ کا وصال ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ

''منگل کے روز رسول اللہﷺ کو کپڑے اُتارے بغیر غسل دیا گیا، آپﷺ کو پانی اور بیر کی پتی سے تین بار غسل دیا گیا۔ پانی ''غرس'' نامی قباء میں واقع حضرت سعد بن خیثمہؓ کے کنوئیں کا تھا۔ آپﷺ پینے کے لیے بھی اس کنوئیں کا پانی استعمال فرمایا کرتے تھے۔ پھر آپﷺ کو تین سفید سوتی یمنی چادروں میں کفنایا گیا۔ ان میں کُرتہ اور پگڑی نہ تھی۔ بس آپﷺ کو چادروں میں لپیٹ دیا گیا۔ ابوطلحہؓ نے اُسی جگہ آپﷺ کی قبر بنائی جہاں آپﷺ نے وفات پائی تھی۔ قبر لحد والی کھودی گئی۔ پھر آپﷺ کی چارپائی قبر کے کنارے رکھ دی گئی۔ دس دس صحابہؓ اندر داخل ہوتے اور فرداً فرداً نماز پڑھتے۔ کوئی امام نہ ہوتا۔ سب سے پہلے آپﷺ کے خانوادے نے نماز پڑھی، پھر مہاجرین نے، پھر انصار نے، پھر عورتوں نے، پھر بچوں نے..... نماز جنازہ پڑھنے میں منگل کا پورا دن اور بدھ کی بیشتر رات گزر گئی۔ اس کے بعد رات کے اواخر میں آپﷺ کا جسدِ پاک سپردِ خاک کیا گیا۔'' (مہر نبوت، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، صفحہ ۲۷۱، ۲۷۲)

آستانِ پیمبرﷺ ..... ہمارا عقیدہ ہے کہ زمین کا یہ مبارک ٹکڑا جو نبیٔ کریمﷺ کے جسدِ پاک سے مس کر رہا ہے وہ آسمان تو آسمان، عرش سے بھی رفیع ہے۔ آسمان تو محض اس لیے

بلند و بالا ہے کہ بقول اقبالؒ، اس نے اسی آستانِ پاک کو بوسہ دے رکھا ہے۔ اقبال کا شعر ہے ؎

اے زمیں از بارگاہت ارجمند
آسماں از بوسۂ بامت بلند

ساغر صدیقی کہاں یاد آ گئے، کہتے ہیں ؎

طلوعِ مہر ترے آستاں پہ ہوتا ہے
کرن کرن تری دہلیز پر اُترتی ہے

راقم الحروف کو جب بھی مواجہہ شریف کے روبرو حاضر ہونے کا موقع ملا۔ تو یہ شعر اکثر یاد آیا۔ ریاض الجنۃ میں بھی۔ شعر کا انداز انتہائی سادہ اور مضمون انتہائی بامعنی، میں نے یہ شعر بہ تصرف ادنیٰ پڑھا، جیسا کہ اُوپر درج ہے کہ پاکستان میں بیٹھ کر اسے پڑھنا اور رنگ رکھتا ہے اور آستانِ ناز، نگاہوں کے سامنے ہو تو جہاں کو یہاں اور اُتنا کو اِتنا پڑھنا ہی پڑتا ہے۔

میرے مرحوم دوست حافظ لدھیانوی فرمایا کرتے تھے کہ یہ ایک شعر شاعر کی مغفرت کے لیے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ شاعر کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور اُسے مغفرت سے نوازے اور ان کو بھی برکتیں عطا کرے جنھیں یہ شعر لطف و لطافت عطا کرتا رہا ہے۔

اصل شعر یوں ہے ؎

پیمبرﷺ کا جہاں پر آستاں ہے
زمیں کا اُتنا ٹکڑا آسماں ہے

درج بالا شعر استاد امام دین گجراتی کا ہے۔ وہ یونہی سے شاعر تھے۔ تماش بین لوگوں نے انہیں یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ شاعر مشرق علامہ اقبال کے ہمسر ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بانگِ درا کے مقابلے میں بانگ دہل لکھی۔ ان کے اکثر اشعار تمسخر کو ہوا اور ظرافت کو غذا دیتے رہے۔ نہیں معلوم ان کی کون سی ادا مبدءِ فیض کو پسند آ گئی کہ اُن کے قلم سے یہ شعر نکلا ؎

پیمبرﷺ کا جہاں پر آستاں ہے
زمیں کا اُتنا ٹکڑا آسماں ہے

نوٹ: بعض مقامات پر پہلا مصرع یوں ہے: ''نبیﷺ کا جس جگہ پر آستاں ہے''

O

اے کہ صد طور است پیدا از نشانِ پائے تو
خاکِ یثرب را تجلّی گاہِ عرفاں کردہ ای

حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھی جانے والی، اقبال کی ایک غیر مدوّن نعت کا یہ شعر بھی یاد آتا رہا، بہتر ہوتا کہ میں لفظ ''یثرب'' کو ''طیبہ'' سے بدل دیتا کیونکہ نبیٔ کریم ﷺ نے مدینہ کے لیے اس لفظ کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ قدیم نعتوں میں شاعر یہ لفظ استعمال کرتے رہے ہیں، دورِ حاضر میں احتیاط کی جارہی ہے۔ بہرکیف اقبالؔ کی وہ پوری نعت درج ذیل ہے اس میں ختم نبوت کے سلسلے میں اقبالؔ کا ایک خوبصورت اور قطعی نوعیت کا شعر بھی موجود ہے ؎

اے کہ بر دل ہا رموزِ عشق آساں کردہ ای
سینہ ہارا از تجلی یوسفستاں کردہ ای
اے کہ صد طور است پیدا از نشانِ پائے تو
خاکِ یثرب را تجلی گاہِ عرفاں کردہ ای
اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردہ ای
اے کہ ہم نام خدا، بابِ دیارِ علم تو
اُمّیے بودی و حکمت را نمایاں کردہ ای
فیض تو دشتِ عرب را مطمحِ انظار ساخت
خاک ایں ویرانہ را گلشن بداماں کردہ ای

دل نہ نالد در فراق ماسوائے نور تو
خشک چو بے راز ہجرِ خویش گریاں کردہ ای
ہاں دعا کن بہرما اے مایۂ ایمان ما
پرشود از گوہر حکمت سر دامان ما

نبیٔ پاک ﷺ مدینے میں چلتے پھرتے رہے۔ آپ ﷺ کے نقوشِ پا کی عظمتوں سے مدینے کے ذروں میں طور کی جلوہ سامانی آ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ خاکِ طیبہ اہل نظر کے لیے تجلی گاہ اور اہل دل کے لیے بوسہ گاہ ہے۔ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ ہمارے نبیٔ پاک ﷺ جس راستے سے گزر جاتے تھے بعد میں آنے والوں کو خوشبو بتا دیا کرتی تھی کہ روحِ بہاراں اِدھر سے گزرے ہیں، میں نے روح بہاراں کی ترکیب غزل کے اس شعر سے لے لی ہے ؎

اے روحِ بہاراں! ترا اعجازِ نظر ہے
غنچوں کا تبسم ہو کہ پھولوں کی جوانی

عرصہ ہوتا ہے کسی مضمون میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ نبیٔ پاک ﷺ ایک صحابیؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ راستے کو مہکانے والی خوشبو کے بارے میں پہلے قلم سے غالبؔ کا یہ شعر نکلا ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

پھر سوچا کہ یہ شعر تو سبھی کو معلوم ہے کوئی اور شعر ہونا چاہیے۔ حق یہ ہے کہ غزل کا شعر موقع کے مطابق دل کی ہر دھڑکن اور روح کی ہر لرزش کی ترجمانی پر قادر ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ شاعر نے اُسے کس تناظر میں کہا تھا۔ میرے والدِ مرحوم نے ایک بار مجھے بتایا کہ انہوں نے علامہ اقبالؔ سے بذریعہ خط، ان کے کسی شعر کے بارے میں استفسار کیا۔ علامہ نے جواب دیا کہ ''خود مجھے معلوم نہیں کہ میں نے کس کیفیت کے تحت یہ شعر کہا تھا۔ آپ اپنے حالات اور اپنی کیفیات کے مطابق اس سے مطلب نکال لیں۔'' بہرحال راستے میں بکھرنے والی اُس فطری خوشبو کے بارے میں، میں نے یہ شعر لکھا ؎

خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ راستے میں ہیں
موجِ صبا کے ہاتھ میں اُن کا سراغ ہے

اور صحابیؓ کے گھر میں اس ''روحِ بہاراں'' کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے غزل کا یہ شعر بھی قلم کی

نوک پر آ گیا ؎

وہ آئے ہیں تو پھر ان کی رفاقت کے لیے
موسمِ گل مرے آنگن میں ٹھہر جائے گا

پروفیسر سید محمد ابوالخیر کشفی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ٹیلی ویژن پر ایک گفتگو کے دوران میں انہوں نے کہا کہ بعض خوبصورت اور قادرالکلام شاعروں کو نعت کہنے کی توفیق نہیں ملتی اور گفتگو کے سیاق وسباق سے اشارہ فیض احمد فیض کی طرف تھا۔ کچھ عرصہ بعد فیض کسی مجلس میں ملے تو وہ کچھ کھچے کھچے سے تھے۔ ذرا کھلے تو کہنے لگے کہ میری غزل کا یہ شعر نعت ہی کا تو ہے ؎

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

تاریخ شاہد ہے کہ دل والے مدینہ پاک کی گلیوں میں بچ بچ کے اور سنبھل سنبھل کے چلتے رہے ہیں۔ صدیاں گزر گئیں مگر مشامِ جاں آج بھی مدینے میں مہک سی محسوس کرتے ہیں۔ نگاہیں آج بھی مواجہہ پر، جھک جھک کے اُٹھنے کی کوشش کرتی ہیں مگر اُٹھ نہیں سکتیں۔ سماعت کی پاکیزگی آج بھی بابِ بقیع سے بقیع تک اُن مبارک قدموں کی آہٹ سی سنتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کے درج بالا شعر کے ساتھ جگن ناتھ آزاد کا یہ شعر بھی یاد آتا رہا ؎

میں نے ہر ذرے میں دیکھی ہے ستاروں کی چمک
جس سے وہ گزرے ہیں یہ اس رہگزر کی بات ہے

اور عبدالکریم ثمر کا یہ شعر بھی نشاطِ روح بن کر کیف برساتا رہا ؎

ہر گام کو دیکھا ہے محبت کی نظر سے
شاید کہ وہ گزرے ہوں اسی راہ گزر سے

خوشبو اور موسمِ گل سے متعلق درج بالا دونوں شعر پروین شاکر کے ہیں۔ مجموعۂ کلام کا نام بھی ''خوشبو'' ہے۔

O

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھایئے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھایئے

غالباً امام مالکؒ، مدینہ منورہ میں گلیوں کے درمیان میں نہیں بلکہ مکانوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ عین ممکن ہے کہ ان راستوں میں نبیٔ کریم ﷺ کے نقوش پا ہوں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر پاؤں آ جائیں۔

اچھا ہی کیا سعودی اربابِ اختیار نے، کہ ہولے ہولے حضور ﷺ کے دور کے کم وبیش پورے مدینے کو مسجدِ نبوی ﷺ ہی میں سمیٹ لیا کہ اب کوئی جوتی پہن کر مدینے میں نہیں پھر سکتا کہ پورا مدینہ مسجد ہے، جائے عبادت بھی اور جائے ادب بھی۔ گویا یہ آپ ﷺ ہی کے نقوشِ پا ہیں جہاں سر بھی جھک رہے ہیں اور دل بھی۔ اصغر گونڈوی نے کبھی کہا تھا ؎

چلوں میں جانِ حزیں کو نثار کر ڈالوں
نہ دیں جو اہلِ شریعت جبیں کو اذنِ سجود

اور اب چونکہ پورا مدینہ سجدہ گاہ بن گیا ہے اس لیے جبیں کو کسی ''اذنِ سجود'' کے حصول کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اب تو ''حکمِ سجود'' ہے۔ محبت کرنے والوں کے لیے محبوب کے نقوشِ پا کی کیا اہمیت ہے۔ اردو غزل کے بہترین اشعار بطور سند پیش کیے جا سکتے ہیں کہ یہ غزل ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ وقت کی گردشوں سے لے کر دل کی دھڑکنوں تک، بے قراریوں کا ساتھ دیتی ہے اور انسان کی تنہائی عموماً غزل ہی کے شعر سے بہلتی بھی ہے اور تڑپتی بھی..... نقشِ پائے ناز..... چند شعر ؎

تیرے نقشِ پا نظر آئے تو یہ عقدہ کھلا
اس قدر مایوس کیوں ہے رہگزر سے روشنی

وہاں چاندنی کے قدم ڈولتے ہیں
جہاں تیرے نقشِ قدم سو رہے ہیں
کھلے ہوئے ہیں جہاں پھول سے نقوشِ قدم
وہیں سے قافلہ گزرا ہے میرے پیاروں کا
سجدے کا احترام ہماری نظر میں ہے
ہر نقشِ پائے ناز کو پہچانتے ہیں ہم
یہ آج کون خراماں ادھر سے گزرا ہے
جبینِ شوق ہے بے تاب نقشِ پا کے لیے
شاید یہیں کہیں ہو ترا نقشِ پائے ناز
ہم نے گرا دیئے ہیں سر رہگزار، پھول

نہیں معلوم کہ مسجد نبوی کی توسیع کے وقت اربابِ اختیار کے پیشِ نظر ادب اور محبت کا یہ قرینہ تھا یا اُنھوں نے محض زائرین کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر اس مبارک مسجد کو وسعت دی۔ بہر کیف اہل دل کی تمنائیں تکمیل کو پہنچیں۔ ملک عبدالعزیز کے زمانے میں کچھ زائرین روضۂ اقدس کے روبرو زمیں بوس ہو گئے تھے۔ حکم ہوا تھا کہ ایسے سجدہ گزار زائرین سے سختی کے ساتھ نپٹا جائے۔ علامہ اقبال کو خبر ہوئی تو وہ بے ساختہ کہہ اُٹھے ؎

سجودے نیست اے عبدالعزیز! ایں
بروبم از مژہ خاکِ درِ دوست

سجدہ اور چیز ہے اور محبوب کے دروازے کی خاک کو پلکوں سے صاف کرنا اور بات ہے۔ اب چونکہ پورا مدینہ، مسجد میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس لیے اب کم و بیش پورا مدینہ مسجد نبوی کی شکل میں جلوہ گاہ بھی ہے اور سجدہ گاہ بھی۔ سوچنے والے، تصور میں ڈوب ڈوب کر سوچتے ہیں کہ یہی وہ ارضِ پاک ہے جہاں آپ ﷺ کا خرامِ ناز گل کترتا اور خوشبو بکھیرتا رہا ہے۔ فانی کہاں یاد آ گئے۔ کہتے ہیں ؎

دل سراپا نظر، وہ حُسنِ تمام
بند کر آنکھ، دیکھتا کیا ہے

O

ذرّہ ذرّہ ہے حریفِ آفتاب و کہکشاں
یوں تجلّی ریز ہے فانوسِ ایوانِ رسول ﷺ
پتی پتی کی جبیں میں مسکراتے ہیں چمن
ہے بہار افروز اب تک حُسنِ بُستانِ رسول ﷺ

رسول پاک ﷺ کی شخصیت بھی جامع کمالات ہے اور آپ ﷺ کی رسالت بھی۔ کردار کا یہ عالم کہ آپ ﷺ کے طرزِ عمل کو اللہ تعالیٰ نے اُسوۂ حسنہ قرار دیا۔ ایک عمدہ نمونہ۔ آپ ﷺ کے تمام اقوال، اعمال اور احوال میں جملہ انسانیت کے لیے ایک قابلِ تحسین اور قابلِ تقلید نمونۂ عمل موجود ہے۔ آپ ﷺ کی ہدایات ایک روشن چراغ ہیں اور آپ ﷺ کی زندگی، زندگی کے ہر شعبہ میں واجب الاتباع ہے۔ خواہ وہ شعبہ، عبادات سے متعلق ہو یا معاملات سے، امن سے اس کا واسطہ ہو یا جنگ سے، فکر سے اس کا تعلق ہو یا نظر سے۔ معاشرت سے اس کا علاقہ ہو یا سیاست سے۔ ضروری ہے کہ **وما آتکم الرسول فخذوہ**۔ (الحشر، ۷) اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کے اتباع کو اپنے قرب کی دلیل قرار دیتے ہیں اور یہ اتباع جتنا بڑھے گا، محبت کا سلسلہ اتنا ہی دلنواز ہوتا چلا جائے گا۔ محبت ایک آسمانی تحفہ ہے جو اس زمین پر صرف انسان کو عطا ہوا ہے۔ محبت، انسان کی نگاہوں کو حسن کی ایک دنیا عطا کر دیتی ہے۔ نتیجہ معلوم کہ پوری کائنات حسین ہو جاتی ہے ؎

یہ کس کو دیکھ کے دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شے ہے خدائی میں حسیں معلوم ہوتی ہے

''محبت زندگی کو نثر سے نکال کر شعر میں داخل کر دیتی ہے۔ محبت وحدت سے کثرت اور کثرت سے وحدت کا سفر طے کراتی ہے۔ محبت قطرے کو قلزم آشنا کرتی ہے۔ محبت زمین پر پاؤں رکھے تو آسمان سے آہٹ سنائی دیتی ہے۔'' ؎

اک لفظ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے

الغرض اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کو اپنے حبیب ﷺ کی اطاعت سے وابستہ کر رکھا ہے۔ حبیبِ پاک ﷺ شاہد بھی ہیں، مبشر بھی اور نذیر بھی۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ یقینی علم کی بنیاد پر گزشتہ انبیاء کے بارے میں شہادت دیں گے کہ انہوں نے رشد و ہدایت کی ذمہ داری کماحقہٗ ادا کر دی اور خود آپ ﷺ نے بشارت و نذارت کا حق ادا کر دیا اور اسی حق کی ادائی کے ساتھ ہی دینِ اسلام کو مکمل کر دیا گیا اور تکمیل کے بعد اب نہ کسی اضافے کی ضرورت ہے نہ ترمیم کی ؎

آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی سب جہانوں کے لیے
اِک نمونہ ہے کرم کا، عدل کا، احسان کا

آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ''روشن چراغ'' کہہ کر آپ ﷺ کی رسالت کی تابندگی کو پائندگی عطا کر دی کہ جس طرح چراغ سے اندھیرے کافور ہوتے ہیں اسی طرح آپ ﷺ نے کفر کی ظلمت کو ایمان کے نور سے، شرک کی بے یقینی کو یقین کی پختگی سے اور بدعت کی ضلالت کو ہدایت کی نعمت سے بدل دیا اور اب آپ ﷺ کی سنت کے اس چراغ کو آپ ﷺ کی اُمت نے روشن رکھنا ہے، ہر حال میں، قیامت تک، خود بھی اس سے کسبِ ضیا کرنا ہے اور اُسے وہاں وہاں تک لے جانا ہے جہاں جہاں تاریکی ہے ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یاز نورِ مصطفیٰ (ﷺ) اورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ (ﷺ) است

یاد رہے کہ تاریکی نام ہی روشنی کے نہ ہونے کا ہے اور جس طرح روشنی کے آ جانے سے تاریکی کافور ہو جاتی ہے اسی طرح حق کے آ جانے سے باطل ''ففرو'' ہو جاتا ہے۔ الغرض حسنِ بُستانِ رسول ﷺ بہار افروز تھا، ہے اور رہے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

O

دربارِ رسالت ﷺ میں کچھ نذرِ وفا لے چل
اَشکوں کی نمی لے چل، زخموں کی ضیا لے چل

جب بھی حرمین شریفین میں حاضری کی توفیق ملی تو میں نے ہر بار اپنے گریبان میں جھانکا، اپنے دل کو ٹٹولا اور اپنی نگاہوں کا جائزہ لیا کہ صبا متھراوی نے تو ہدایت کی تھی کہ وہاں جانا ہے تو کچھ ''نذر وفا لے چل'' وفا، محبت کی وہ ابتدائی شکل ہے جہاں بات ابھی وعدوں ہی کے گرد گھوم رہی ہوتی ہے۔ گویا عہد و پیمان کا خلوص ہی وفا ہے، وفا پختہ تر ہو کر، محبت، محبت پختہ تر ہو کر عشق اور عشق منتہائے کمال کو چھو کر جنوں ہو جاتا ہے، تب دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا اور محبّ، محبوب کی محبت میں از خود رفتہ ہو کر بیابانوں کے کانٹوں کو اپنے پاؤں کے آبلوں کا پانی پلاتا اور تپتے رہگزاروں میں باغبانی کی بنیاد رکھتا ہے ؎

تو پوچھ جا کے سرخیِ ہر نوکِ خار سے
ہم کتنی دور تیرے سہارے چلے گئے

محبت کی یہی وہ معراج ہے جب ثبوتِ وفا کے لیے سر ایک ادنیٰ نذرانہ بن جاتا ہے ؎

سجدہ اس سر کا ہے جو تن سے جدا ہوتا ہے
یوں کہیں سجدۂ شکرانہ ادا ہوتا ہے

میں نے جب بھی اپنے دل کا جائزہ لیا کہ وہ محبوب کا خلوت خانہ بننے کے لیے خالی بھی ہے یا نہیں۔ تو میں نے اُسے ''مہماں سرائے کثرت موہوم'' پایا، دنیائے فانی کی محبت، مجازی چاہتوں کی بھرمار اور حسرتوں کے لاشے یہاں تک کہ تیمور کے گھر میں حمیت نام کی کوئی چیز بھی دکھائی نہ دی۔ ذات کے آشوب کے بعد کائنات کی طرف دیکھا تو یوں لگا کہ پوری مسلم امّہ اپنے گریبانوں

کے تار بیج رہی ہے۔ یہاں تک کہ ناموسِ رسالت ﷺ کے تحفظ کے سلسلے میں بھی مصلحت اور بزدلی کا شاہکار بنی ہوئی ہے۔ نعتِ رسول پاک ﷺ کو لہک لہک کر گا لینے سے تو حبِ رسول ﷺ کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارے پاس صرف لفظوں کی خوشنمائی ہے جبکہ اعمال کی سیہ دلی ہمارا ماتم کر رہی ہے۔ آج ہم کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود ''وہن'' کی بیماری میں مبتلا ہیں اور ہماری کم نصیبی اس دور کو ہم تک لے آئی ہے جس کی طرف زبانِ رسالت مآب ﷺ نے صدیوں پہلے اشارہ فرمایا تھا۔ آج ہم دنیا کی محبت میں گم اور موت سے ترساں ہیں اور نہیں سمجھتے کہ موت آ کے رہے گی اور دنیا جا کے رہے گی۔ ''بے مصرف زندگی کی سزا موت کا خوف ہے۔ بامقصد حیات موت سے بے نیاز، موت کے خوف سے آزاد، اپنے مقصد کے حصول میں مصروف رہتی ہے۔ عظیم انسان بھی مرتے ہیں، لیکن ان کی موت ان کی عظمت میں اضافہ کرتی ہے۔ موت انسان سے اس کی بلند نگاہی اور بلند ہمتی چھین نہیں سکتی۔ وہ لوگ موت کے سائے میں زندگی کے ترانے گاتے ہیں۔ زندگی کا نغمہ الاپتے ہیں۔ زندگی کے اس مختصر عرصے میں جواں ہمت آسمانوں کو چھو آئے، عالی مرتبت عرش کی بلندیاں سر کر آئے اور کم حوصلہ اپنے اندیشوں کے خول سے باہر نہ نکلے، موت فانی زندگی کو دائمی حیات میں بدل دیتی ہے۔ فنا سے بقا کا سفر موت کے گھوڑے کی پشت پر ہوتا ہے۔''(۱۱) افسوس کہ ہم زندہ رہنے کے فارمولے بناتے رہتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ اسلام نے ہمیں مرنے کا فارمولا بھی بتایا ہے۔ بہتر مقصد کے لیے جان دینا شہادت ہے اور ناموسِ رسالت ﷺ کے تحفظ سے بہتر اور کون سا مقصد ہو سکتا ہے ؎

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

بات ''نذر وفا'' کی ہو رہی تھی کہ جا تو رہا ہوں، مگر خجالت سے پورا وجود آب آب ہے۔ اقبالؔ نے اپنی نظم حضورِ رسالت مآب ﷺ میں کہا تھا ؎

حضور ﷺ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اقبالؒ کے ان اشعار اور صبا متھراوی کے دوسرے مصرعے نے ندامت میں ڈوبے ہوئے سکوت کو کچھ حوصلہ سا دیا کہ اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود، پلکوں پر آنسوؤں کے ستارے سجا کر، کم از کم یہ تو عرض کر دے کہ تب تو ایک طرابلس تھا۔ آج تو مسلمانوں کا قریہ قریہ طرابلس ہے۔ پوری مسلم امہ لہولہو ہے اور یہ لہو اس لیے بہایا جا رہا ہے کہ ہماری نسبت آپ ﷺ کی ذات گرامی قدر سے ہے۔ آقا! اس لہو کی سرخی کب گلزار بنے گی اور خزاں کب بہار میں بدلے گی؟ صورت حال کی اَبتری لفظوں میں ڈھل نہیں رہی کہ ؎

بے حسی، راہ نما ٹھہری ہے
زندگی، خوفِ قضا ٹھہری ہے
چھن گئیں مجھ سے مری روشنیاں
تیرگی گھر کا دیا ٹھہری ہے
اپنے ہی خوں میں نہا کر نکلوں
چادرِ زخم، قبا ٹھہری ہے
کس کی زنجیر ہلاؤں جا کر
اب تو فریاد، خطا ٹھہری ہے
بھول بیٹھا ہوں خدا کو شاید
آ کے ہونٹوں پہ دعا ٹھہری ہے

ہم مسلمان صدیوں تاریخ کے لیے وجہِ فخر و ناز رہے۔ تب قدم قدم، نظر نظر اور لفظ لفظ قرآن پاک ہمارا راہنما اور اُسوۂ رسولِ پاک ﷺ چراغِ حیات تھا۔ نتیجہ معلوم کہ ہم بنیانِ مرصوص تھے۔ جونہی ہم نے رہنمائی کے لیے اس سراجِ منیر کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر جھانکنا شروع کر دیا۔ تاریکیوں میں بھٹک کر رہ گئے۔ آج وہی امت جو خیر الامم تھی، تاریخ کے چوراہے میں تماشا ہو کر رہ گئی ہے اور ''شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے گریبانوں کے تار بیچ رہے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی رحمتوں سے نوازے۔ ہمیں نبیٔ پاک ﷺ کی حقیقی محبت نصیب ہو، اطاعتِ رسول اکرم ﷺ سے ہمارے روز و شب مستنیر ہوں کہ یہی محبت اور یہی اطاعت دونوں دنیاؤں میں کامرانی کی واحد دلیل ہے۔

رُخِ خیرالبشرﷺ تو پھر رخِ خیرالبشرﷺ ٹھہرا
ان آنکھوں سے درِ خیرالبشرﷺ دیکھا نہیں جاتا
کھڑا ہوں کب سے محرابِ نبیﷺ کے سامنے دانش
نظر رہ رہ کے اُٹھتی ہے مگر دیکھا نہیں جاتا

رُخِ خیرالبشرﷺ.....حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپﷺ:
''پاکیزہ رو، کشادہ چہرہ، پسندیدہ خو، نہ تو ندنکلی ہوئی نہ چندیا کے بال گرے ہوئے، زیبا، صاحبِ جمال، آنکھیں سیاہ وفراخ، بال لمبے اور گھنے، آواز میں بھاری پن، بلند گردن، روشن مردمک، سرگیں چشم، باریک و پیوستہ ابرو، سیاہ گھنگھریالے بال، خاموش، وقار کے ساتھ گویا دل بستگی لیے ہوئے، دور سے دیکھنے میں زیبندہ ودل فریب، قریب سے نہایت شیریں کلام، واضح الفاظ، کلام کمی وبیشی الفاظ سے معرا، تمام گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی، میانہ قد کہ کوتاہی سے حقیر نظر نہیں آتے، نہ طویل کہ آنکھ اس سے نفرت کرتی۔ زیبندہ نہال کی تازہ شاخ، زیبندہ منظر، والاقدر، رفیق ایسے کہ ہر وقت اس کے گرد وپیش رہتے ہیں۔ جب وہ کچھ کہتا ہے تو چپ چاپ سنتے ہیں، حکم دیتا ہے تو تعمیل کے لیے جھپٹتے ہیں، مخدوم، مطاع، نہ کوتاہ سخن، نہ ترش رو، نہ فضول گو.....''

رخِ خیرالبشرﷺ ہی کے طفیل، درِ خیرالبشرﷺ تجلیات کا مرکز ہے کہ مکان، مکین ہی کی نسبت سے نظر افروز اور دل آویز ٹھہرتا ہے۔ ورنہ

''عقیدت مند آنکھ خاکِ عرب کو جب محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہیں تو طیبہ وبطحا کا ذرہ ذرہ آفتابِ جہانتاب بن کر چمکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے نبی ﷺ کے مولد و مدفن پر نور کے روشن طبق لے کر اُترتے ہیں اور مکہ و مدینہ کی گلیاں ضیا پاشیوں سے بقعۂ نور بن گئی ہیں۔ عرب جو روحانیوں کی نگاہ میں ہزار حسن اور لاکھ جلووں کی جنت گاہ ہے۔ چشم دنیا دار اس کے نظارۂ ظاہر سے گھبرا اُٹھتی ہے۔ (۱۲)

مواجہہ شریف اور حضرات شیخین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی آرام گاہیں، نگاہوں کی جنت ہیں۔ وہاں جس انداز سے سکوت بولتا اور جس طرح آنسو، دردِ دل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ منظر وقت کی آنکھوں نے کائنات میں کہیں اور نہیں دیکھا ؎

جو حسن میرے پیش نظر ہے اگر اُسے
جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں

احترام اور خوف کا ایک پر کیف امتزاج ہے، دل حکایات سے لبریز مگر لب، بستہ، کہ کہیں لبوں کی ہلکی سی جنبش بھی حسنِ اعمال کو غارت نہ کر دے کہ بظاہر پتا ہی نہ چلے۔ بابِ جبریل سے داخل ہو کر قدمین شریفین کی جانب درود وسلام کی ایک اپنی کیفیت ہے۔ پھر محرابِ نبی ﷺ کے سامنے عین نبیٔ پاک ﷺ کے قدموں پر سر سجدے میں ہو تو کیا کہنے کہ مدتوں سے آرزو تھی کہ ؎

ساری صدیوں پہ جو بھاری ہے وہ لمحہ ملتا
کاش سرکارِ دو عالم ﷺ کا زمانہ ملتا
آپ کے قدموں کے پیچھے مجھے سجدہ ملتا
آپ کا نقشِ قدم، آپ کا رستہ ملتا

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس آرزو کو بھی آبرو ملی، پھر ریاض الجنۃ کہ جو بیٹھ جائے، اُٹھتا ہی نہیں کہ جو ایک بار جنت میں داخل ہو گیا وہ پھر کیوں نکلنے لگا۔ پھر ''صفّہ'' کہ لغت میں سایہ دار جگہ کو کہتے ہیں۔ تحویل قبلہ کے بعد مسجد نبوی میں قبلۂ اول کی طرف واقع دیوار اور اس سے متصل جگہ ان اصحاب کے لیے چھوڑ دی گئی تھی جنہوں نے اپنی زندگی صرف عبادت اور آپ ﷺ کی محبت کے لیے وقف کر دی تھی اور جن کا کوئی گھر بار اور ٹھکانا نہ تھا وہاں ان کی علمی اور عملی تربیت ہوتی تھی۔ وہ فی الواقع ہماری اولین یونیورسٹی تھی۔

پھر اُس دور کا پورا مدینہ پاک، مسجد نبوی ﷺ کی شکل میں روبرو، جلوہ گر، نظر نظر احترام اور قدم قدم احتیاط۔ عزت بخاری کا خوبصورت شعر ہے ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

سورۃ الحجرات کی دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے کہ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں اپنی آوازوں کو پست رکھو، نبیٔ پاک ﷺ کی آواز سے اپنی آواز اونچی نہ کرو۔ ویسے زور زور سے باتیں نہ کرو جیسے تم آپس میں کرتے ہو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال یوں اکارت ہو جائیں کہ تمہیں خبر بھی نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے محرومی بے ادب کا مقدر ہوتی ہے۔ مقصد یہ بھی ہے کہ قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اُسوۂ رسول ﷺ بہر آئینہ کامل اور جامع۔ اپنی آواز۔ صوتِ نبی ﷺ سے بلند نہ کرنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ پر بلا چون و چرا عمل کیا جائے اور جس عمل کا ثبوت سنتِ رسول ﷺ میں نہیں ملتا۔ اس سے اجتناب کیا جائے اور یہ بھی مقصود ہے کہ آج بھی مواجہہ شریف کے روبرو اور مسجد نبوی ﷺ میں اپنی آواز کو پست رکھا جائے۔ کہ یہی آیت مواجہہ شریف پر مرقوم بھی ہے کہ بلند آہنگ سے سامعۂ پیغمبر ﷺ کو تب بھی تکلیف ہوتی تھی۔ اب بھی ؎

یہ سماں ہے صبح طیبہ کا سماں، آہستہ بول
اے وفورِ شوق، اے جذب رواں! آہستہ بول
اُن کے، میرے درمیاں، حرفِ سخن کچھ اور ہے
اے زمانے! میرے ان کے درمیاں آہستہ بول

جیسا کہ تخلص سے ظاہر ہے، زیب عنوان شعر احسان دانش مرحوم کے ہیں۔ اُن کی ایک تحریر میرے پاس محفوظ ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ انھیں دو بار رسول پاک ﷺ کی زیارت کا شرف مل چکا ہے اور اس شرف کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی ایک نعت میں کبھی یہ آرزو کی تھی کہ ؎

آنکھوں کو اپنی چومتا رکھ رکھ کے آئینہ
ہوتی اگر نصیب زیارت حضور ﷺ کی

کسی سہانی گھڑی میں لکھا ہوا یہ شعر قبولیت پا گیا۔ چنانچہ اُن کی وفات کے بعد اُن کا مجموعۂ نعت ''ابرِ نیساں'' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا تو اس میں احسان نے اِس شعر کو یوں بدل دیا ہے ؎

چوما ہے اپنی آنکھوں کو رکھ رکھ کے آئینہ
جب بھی ہوئی ہے مجھ کو زیارت حضور ﷺ کی

احسان دانش، کاندھلہ ضلع مظفر نگر (بھارت) کے رہنے والے تھے والد ماجد کا نام قاضی دانش علی تھا۔ قاضی محمد ذکی، ذکی کے شاگرد تھے۔ سن ولادت ۱۹۱۴ء اور تاریخِ وفات ۱۲ مارچ ۱۹۸۲ء ہے۔ بیس کے لگ بھگ شعری اور تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں۔ لاہور میں مدفون ہیں۔

میں درج بالا دونوں شعر خانہ کعبہ میں بھی دہرایا کرتا تھا کہ کم از کم سر کی آنکھوں سے درِ خیر البشر ﷺ دیکھنے کی توفیق تو ارزانی ہو جائے..... دل کی آنکھوں کو طہارت مل جائے تو زہے نصیب۔

O

☆

فرشِ گل و لالہ سے کواکب کے جہاں تک
تخلیقِ دو عالم ہے، تقاضائے محمد (ﷺ)

(احسان دانش)

O

خوشبو کے ساتھ مجھ کو بکھر جانے دیجیے
رحمت کی وادیوں میں اُتر جانے دیجیے
حبِ رسولِ ارض و سماواتﷺ کے طفیل
شاخِ گلابِ جاں کو نکھر جانے دیجیے
نعتِ رسولِ پاکﷺ کا پرچم لیے ہوئے
طغیانِ آرزو کو ادھر آنے دیجیے
اتنی بلندیوں کا تصور بھی تھا محال
بختِ رسا کے اوج سے ڈر جانے دیجیے
آنکھوں میں عکسِ گنبدِ خضریٰ رہے مدام
کشکولِ شوقِ دید ہے بھر جانے دیجیے
قدموں کو چھوڑنا مرے بس میں نہیں حضورﷺ
قدموں ہی میں ریاضؔ کو مر جانے دیجیے

ریاض حسینؔ چودھری کے ان اشعار نے مدینہ منورہ کے سفر کو بھی کیفِ مسلسل عطا کیا اور مدینہ

میں موجودگی کو بھی پر سرور بنائے رکھا۔ رحمت کی وادیوں میں اُترنا اور خوشبو کے ساتھ بکھرنا، شاخِ گلابِ جاں کا نکھرنا اور عکسِ گنبدِ خضرا سے کشکولِ شوق دید کا بھر جانا، عطاؤں کا ایک ایسا سلسلہ ہے جس کا محض تصور ہی، دل کی دنیا کو پر بہار بنائے رکھنے کے لیے کافی ہے۔ عکسِ گنبدِ خضریٰ کا آنکھوں میں مرتسم ہو جانا اور مرتسم رہنا، یاد کو ایک مستقل حسن بخشتا ہے کہ ؎

بچھڑ کے بھی تری یادوں کی رہگزر میں رہے
سفر کے بعد بھی ہم حالتِ سفر میں رہے

آخری شعر، قدمین شریفین کی جانب بیٹھ کر دہرایا جائے تو دل سے دعا نکلتی ہے کہ اس خوبصورت مقام کے لیے کیسا برمحل شعر، زائر کو شاعر نے عطا کیا ہے۔ آخر میں ریاضؔ ہی کے دو شعر، جنھیں اعترافِ احساس کے طور پر اس خاکسار نے اپنی تحریروں میں کئی بار استعمال کیا ہے ؎

کلکِ ثنا کو نور کی موجوں میں رکھ دیا
یعنی گدازِ عشق کو ہونٹوں میں رکھ دیا
کتنا کرم کیا ہے خدائے رحیم نے
اُن کی ثنا کو ڈوبتی سانسوں میں رکھ دیا

گنبدِ خضریٰ کی ترکیب محلِ نظر ہے کہ گنبد مذکر ہے، اور فارسی لفظ ''خضریٰ'' مؤنث ہے اور عربی لفظ، عربی اور فارسی میں ترکیب تو درست ہے مگر تذکیر و تانیث میں اختلاف ناروا ہے۔ تاریخی حقائق کے مطابق شروع میں حجرۂ انور پر گنبد نہیں تھا۔ ۱۲۷۹ء میں پہلی بار گنبد تعمیر کیا گیا جو چھت کے نیچے مربع شکل اور اوپر ہشت پہلو تھا، ۱۴۸۳ء میں حاکم مصر کے حکم سے امیر مدینہ نے گنبد کی تجدید کرائی، انہوں نے کالے پتھر سے تعمیر کرا کے اس پر سفید رنگ کرایا۔ ۱۸۱۸ء میں سلطان محمود بن سلطان عبدالحمید ثانی نے نیا گنبد بنوایا اور اس پر سبز رنگ کرنے کا حکم دیا جس کی وجہ سے گنبد خضریٰ (گنبد اخضر درست ترکیب ہے) کے نام سے شہرت پذیر ہوا۔ جو اَب تک درخشندہ و تابندہ اور مرجعِ خلائق بنا ہوا ہے۔ درج بالا اشعار میں ریاض حسینؔ چودھری اسی سبز گنبد کو اپنی آنکھوں میں سمیٹنے اور سنبھالنے کی آرزو کر رہے ہیں کہ یہ عکس ایک دائمی نقش کی شکل اختیار کر جائے۔ میں نے کتنے ہی زائرین کو چھتریوں والے صحن میں بیٹھے، اس گنبد اخضر کو مسلسل تکتے دیکھا ہے۔ ٹکٹکی لگا کر اس سبز گنبد کو دیکھنے کی توفیق ملے اور ڈاکٹر خورشیدؔ رضوی کی ایک غزل کے یہ شعر حاشیۂ خیال پر اُبھر کر، زبان پر آ جائیں تو پھر لطفِ دید، کہ لفظ اس کیف کی ترجمانی نہ کر سکیں ؎

آنکھ مت جھپکایئے، تارِ نظر مت توڑیئے
چاند کو دل کے سویدا تک اُترنے دیجیے
روکیے اشکوں کی گرتی چلمنوں کو روکیے
ان دریچوں میں کوئی صورت اُبھرنے دیجیے
سامنے ہے، اس کو آنکھوں میں بسا لے جایئے
عمر بھر اس ایک پل کو مت گزرنے دیجیے

ریاضؔ کا آخری شعر کس قدر جاں فزا ہے کہ جان تو بہرنوع جانی ہے کہ وہ آنی جانی شے ہے، جان، محبوب کے قدموں میں جائے تو اس کا جانا حسن، سکون اور طمانیت کا مظہر ہے، جگرؔ مرادآبادی یاد آ گئے۔ بہ تصرف ادنیٰ ؎

جان دے ہی دی، جگرؔ نے آج پائے ناز پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

جنگ احد میں ایک صحابیؓ زخمی ہو گئے تھے۔ ان کی زندگی کا شعلہ آخری لپک لے رہا تھا کہ رسالت مآب ﷺ کا گزر ادھر سے ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''کوئی خواہش ہو تو بتاؤ'' جاں بلب صحابیؓ نے اپنا زخمی جسم گھسیٹا اور سر حضور ﷺ کے قدموں پر رکھ دیا اور اپنی جان، جان آفرین کے حوالے کرتے ہوئے، احد کے دامن میں، نعت کا مقطع، اپنے خون کی سرخی سے لکھ دیا ؎

منم و ہمیں تمنا کہ بوقتِ جاں سپر دن
بہ رخِ تو دیدۂ باشم، تو درونِ دیدہ باشی

O

خود وقت کو ملتا ہے سکوں تیری گلی میں
سنتے ہیں یہاں گردشِ ایّام نہیں ہے

ایک حسین اتفاق ہے کہ سجاد باقؔر رضوی کی کسی غزل کا یہ شعر بھی مسجدِ نبوی ﷺ میں بار بار یاد آیا ؎

خود وقت کو ملتا ہے سکوں اس کی گلی میں
سنتے ہیں وہاں گردشِ ایام نہیں ہے

میں نے وہاں کے بجائے یہاں اور ضمیر غائب کو ضمیر مخاطب میں بدلا اور جب بھی اسے پڑھا تو دل کو سکون و راحت کے عالم میں پایا۔ مسلم امّہ پر آج جو وقت پڑا ہے اور وہ ایام کی جس گردش کا شکار ہے وہ داستان طویل بھی ہے اور دلگداز بھی۔ راحت پر گھٹن چھا گئی ہے۔ خلوص مفاد اور خود غرضی میں بدل گیا ہے۔ ظاہر نظر افروز ہے مگر باطن، چنگیز سے تاریک تر، غیروں کی چیرہ دستیوں نے ہمیں پارہ پارہ کر رکھا ہے۔ بے چینی و بے بسی، بے یقینی و بے مروتی، بے حیائی و بے وفائی..... ایک دردناک کرب، روح کو ڈس رہا ہے۔ سوچ، سچائی کو ترس رہی ہے اور دل، طمانیت کو، خونِ مسلم، پانی سے بھی اَرزاں ہے، عصمت و عفت کے آبگینے، آوارہ قہقہوں کے نرغے میں ہیں۔ افسوس کہ اسلام ہمارے لیے الزام بن گیا ہے ؎

اس جرم میں پہنچے ہیں سرِ دار کہ ہم لوگ
اس قامتِ زیبا کو بھلا کیوں نہیں دیتے

ایسے میں جب ایک زائر، اپنے زخم زخم وجود اور پارہ پارہ دل کو لے کر مدینہ پہنچتا ہے اور درود وسلام کے نغموں سے سرشار ہوکر جب بارگاہِ رحمت میں فریاد کناں ہوتا ہے تو اُسے سکون و عافیت کا ایک ایسا ناز آفریں احساس ہوتا ہے کہ وہ خود کو بھول جاتا ہے اور اُسے یوں لگتا ہے کہ وہ امن وراحت کی ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہے جہاں وقت کی گردش تھم گئی ہے۔ جہاں ہوا کی موج بھی جھک جھک کے اور رُک رُک کے گزرتی ہے، جہاں بادل برستا ضرور ہے مگر گرجتا نہیں۔ جہاں ہر زخم کو مرہم ملتا ہے..... درود پاک کا ورد کہ وہ ایک ایسی خوبصورت دعا ہے جو کسی حال میں ردنہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنے انداز میں درود بھیج رہے ہیں اور ملائکہ بھی اور اللہ تعالیٰ نے بندوں کو بھی درود کی تلقین فرما کر انہیں یہ معراج بخشی کہ وہ درود پاک کے طفیل اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کے ہم زبان ہو جائیں۔ درود کے ذریعے ہم اس بات کی آرزو کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ، اپنے حبیب پاک ﷺ پر زیادہ برکتیں، رحمتیں، سعادتیں اور نوازشیں نازل فرمائے اور پھر اس پاکیزہ ذریعے سے برکتوں، رحمتوں، سعادتوں اور نوازشوں کی یہ دنیا ہم دنیا داروں کے لیے وقف رہے کہ اُن کی ذاتِ پاک عالمین کے لیے رحمت تھی اور رحمت ہے۔ پیہم نوازشات کے اس عالم میں کہاں گردشِ ایام کی تلخیاں اور کہاں وقت کی سنگینیاں..... اور درج بالا شعر کے ساتھ ہی اس شعر کو بھی مسجد نبوی ﷺ کی فضا اور ہوا نصیب رہی ہے ؎

یوں مدینے میں پہنچ کر دل کو ملتا ہے سکوں
جیسے اک زخمی پرندہ آشیاں تک آ گیا

O

☆

غنچۂ دل کے لیے وجہِ نمو
تیرے کوچے کی ہوائے مشکبو

(جمال سویدا)

O

اے خاصۂ خاصانِ رسل ﷺ، وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

یہ شعر ''مسدس حالی'' سے مستعار ہے۔ مولانا حالؔی نے سرورِ کائنات ﷺ کی بارگاہ میں عرضِ حال کرتے ہوئے امت مسلمہ کی زبوں حالی کا تذکرہ جس سوز و درد کے ساتھ کیا ہے اسے پڑھ کر، یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جو بات، حالؔی، رو رو کر کرتا ہے اقبالؔ وہی بات جرأت کے ساتھ کرتا ہے۔ حالؔی کے زمانے میں مسلمانوں پر جو ''وقت پڑا تھا''۔ اس کی مختصراً تفصیل یوں ہے کہ امت فرقہ بندی کا شکار ہو کر پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے، لوگوں میں نہ فقر کی نعمت باقی ہے نہ غنا کی دولت، عالم بے عقل ہے، جاہل، وحشی، منعم، مغرور اور مفلس، گدا۔ بڑے چھوٹے اور چھوٹے، بڑے ہو گئے ہیں، عزت، عظمت اور فضیلت کے آبگینے چور چور ہو گئے ہیں اور دین ''بے برگ و نوا'' ہو کر رہ گیا ہے۔ حالؔی نے مسلمانوں کے انحطاط کا نقشہ کچھ ایسے پُر سوز انداز میں کھینچا ہے کہ دل بھر آتا ہے۔ ''مسدس'' کے آخر میں جو ضمیمہ ہے وہ اپنے اندر بہار کا پیغام اور امید کی کرن لیے ہوئے ہے جو غمزدہ دلوں، لرزتے لبوں اور بہتے آنسوؤں کو سنبھالا دیتا ہے اور یہی وہ ضمیمہ ہے جس نے ''مسدس'' کو ایک مکمل ادب پارہ بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''مسدس'' مسلمانوں کے ادبار و اقبال کی ایک دل آویز تاریخ ہے۔ نصیحتوں کا مرقع اور عبرتوں کی داستان ہے۔ یہ تب کی بات تھی آج اگر حالؔی زندہ ہوتا اور مسلمانوں کے حال زار کو دیکھتا تو شاید کوئی سا لفظی اسلوب اور کوئی سا شعری پیرایہ بھی اس لہولہو کیفیت کو بیان نہ کر سکتا۔ نبیٔ کریم ﷺ کے

التفات کی تب اتنی ضرورت نہ تھی جتنی اب ہے۔ حالؔی، بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں دعا کی التماس کر رہا ہے کہ نصِ قرآنی کے مطابق حضور ﷺ کی دعا، امت کے لیے سکون وعافیت کا ایک مقبول ومبرور ذریعہ ہے۔ مولانا ظفرؔ علی خاں کہتے ہیں ؎

اے خاورِ حجاز کے رخشندہ آفتاب
صبحِ ازل ہے تیری تجلّی سے فیض یاب
مغرب کی دستبرد سے مشرق ہوا تباہ
ایماں کا خانہ کفر کے ہاتھوں ہوا خراب
اے قبلۂ دو عالم و اے کعبۂ دو کون
تیری دعا ہے حضرتِ باری میں مستجاب
یثرب کے سبز پردے سے باہر نکال کر
دونوں دعا کے ہاتھ بصد کرب واضطراب
حق سے یہ عرض کر کہ ترے نا سزا غلام
عقبیٰ میں سرخرو ہوں تو دنیا میں کامیاب

اے خاصۂ خاصانِ رسل ﷺ آپ کی امت آج بفضلہٖ مسلمان تو ہے مگر مومن نہیں رہی۔ (حکم ہمیشہ اکثریت پر لگایا جاتا ہے۔) دنیا کی محبت نے اُسے خدا سے غافل کر رکھا ہے۔ توحید کو شرک وبدعت کی آلودگیوں نے دھندلا دیا ہے۔ اس کا علم، نظر سے محروم ہے۔ زبان دل کی رفیق نہیں رہی اور منافقت خون بن کر رگوں میں گردش کر رہی ہے۔ نتیجہ معلوم کہ وہ ثریا کی رفعتوں سے ثریٰ کی پستیوں تک آ گئی ہے۔ آپ ﷺ نے ایک جنگ میں حاتم طائی کے قبیلے کی اسیر بیٹی (جو کہ بے پردہ تھی) کے چہرے پر اپنی وہ چادر تان دی تھی جس کا ہر تار لاکھوں سعادتوں کا امین تھا۔ آج آپ کی امت پوری دنیا کے سامنے بے چادر ہے اور اُسے کوئی چادر عطا کرنے والا نہیں۔ آج برقِ بلا نے ہمارے ہی آشیانوں کو چن لیا ہے، آج وہ خونِ مسلم پانی سے بھی ارزاں ہو گیا ہے جسے آپ ﷺ ہی نے کعبے سے بھی مقدس قرار دیا تھا۔ آج مسلم امّہ کا پورا چمن شعلوں کی زد میں ہے ؎

آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

آج ہماری آنکھیں سراب اور دل خراب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اغیار کی تقلید نے اغیار ہی کو ہم

پر مسلط کر رکھا ہے۔ آج وہ تمام برائیاں ہماری زندگی میں در آئی ہیں جن کے آنے پر آپ ﷺ نے وعید دی تھی کہ تب حادثے یوں آئیں گے جس طرح کسی ہار کا رشتہ ٹوٹ جانے سے اس کے موتی پے بہ پے گرتے ہیں۔ آج آپ کی امت پیہم حوادث کی زد میں ہے۔ ہر قدم بھی حادثہ، ہر آرزو بھی حادثہ۔

آپ خاصۂ خاصانِ رسل ﷺ ہیں آپ ﷺ جملہ انبیائے کرام کے سرتاج ہیں۔ وہ سب آپ ﷺ ہی کی آمد کی خبر دیتے رہے۔ اقبالؒ گزشتہ انبیائے کرام کو ''قافلہ ہائے رنگ و بو'' سے تعبیر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نور و نکہت کے یہ قافلے آپ ﷺ ہی کے تلاش میں نکلتے رہے۔ اُن کی زبانیں آپ ﷺ کے ذکر سے لبریز اور اُن کے صحائف آپ ﷺ کے کی یاد سے معمور رہے۔ آپ ﷺ اسی لیے آخر میں تشریف لائے کہ آپ ﷺ سے انوار رسالت کو حسنِ تکمیل تک پہنچنا تھا ؎

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیر یاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی امت کو خیر الامم کہا۔ اسی کے بارے میں کہا گیا کہ وہ جملہ انسانیت کی راہنمائی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اسی کے متعلق فرمایا گیا کہ یہی غالب رہے گی بشرطیکہ اس کے دل ایمان سے بہرہ ور رہے..... مگر آج ایمان کی یہی وہ جنس ہے جس کا ہمارے بازارِ حیات میں قحط نظر آ رہا ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل ﷺ! ایسے میں اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کی بحالی اور سرفرازی کے لیے دعا فرمائیے کہ آپ کی دعا، بارگاہِ ایزدی میں مقبول و مبرور بھی ہے اور زخم زخم امّہ کے لیے وجہِ سکون و شفا بھی.....۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل ﷺ، صورتِ حال انتہائی دگرگوں ہے ؎

رُتیں یوں بے ثمر کر دی گئی ہیں
جو کلیاں تھیں، شرر کر دی گئی ہیں
لہو پوشاک بندوں کو ملی ہے
مساجد خوں میں تر کر دی گئی ہیں
جواں لاشے اُٹھائے جا رہے ہیں
کہ عمریں مختصر کر دی گئی ہیں

جنھیں دیدہ وری بخشی گئی ہے
وہ آنکھیں بے بصر کر دی گئی ہیں
کتابوں میں جنھیں منفی پڑھا تھا
وہ قدریں معتبر کر دی گئی ہیں
ستم کی گرم بازاری ہے ہر سو
اور آہیں بے اثر کر دی گئی ہیں

یاد رہے کہ حالی (۱۸۳۵ء-۱۹۱۴ء) نے سرسید کے کہنے پر اپنی معروف نظم ''مدوجزر اسلام'' لکھی تھی۔ جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نظم ملتِ اسلامیہ کے عروج و زوال کی تاریخ ہی نہیں ہماری ملّی بے حسی کا ایک دلگداز نوحہ بھی ہے یہ مسلمانوں کے جذبۂ ایمان کو ابھار کر، انھیں فکر و عمل پر آمادہ کرنے کی ایک شاعرانہ کوشش ہے۔

دہلیٔ مرحوم کے اس دور پُرآشوب میں
کچھ ادیب العصر بھی، کچھ شاعرِ عالی بھی تھے
لیکن ان اُلجھی ہوئی راہوں میں باحالِ تباہ
ہمزبانِ سیّدِ خستہ جگر، حالی بھی تھے

دورِ حاضر کے شاعر سرور حسین نقشبندی نے حالی کی مذکورہ بالا نعت پر تظمین کی ہے۔ چند شعر دیکھیں۔

اک ایک گھڑی ہم کو قیامت کی گھڑی ہے
جانے مری دھرتی کو نظر کس کی لگی ہے
اس ڈوبتی کشتی میں ہر اک چیخ رہا ہے
اے خاصۂ خاصانِ رسل ﷺ! وقت دعا ہے

ارزاں ہے جو سب سے، وہ مسلماں کا لہو ہے
اب چاروں طرف برسرِ پیکار عدو ہے
جس جا بھی مسلماں ہیں، یہی آہ و بکا ہے
اے خاصۂ خاصانِ رسل ﷺ! وقت دعا ہے

O

آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ ﷺ
در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ ﷺ

محمد ﷺ ہی وہ اسم گرامی قدر ہے جس سے ہماری آبرو قائم ہے۔ ورنہ ہم کیا ہیں، ایک چلتی پھرتی ہوئی لاش، سانس لینے والے مردے، یہ نام ہمارے دل کی دھڑکنوں میں بستا اور دل کے ویرانے کو زندگی، رخشندگی اور تابندگی عطا کرتا ہے۔ اس ایک نام کے احترام میں ہم اللہ تعالیٰ کو حق مان کر اس کے گھر کے گرد رواں دواں ہیں۔ ہم رخسارِ کعبہ کے خال دلکش کو بوسہ دینے کے لیے بے تاب رہتے ہیں کہ کسی آستاں کے اس اُکھڑے ہوئے پتھر کو حضرت محمد ﷺ نے چوما ہے، اسی نام کی فضیلت سے مکہ، مکہ اور مدینہ، مدینہ ہے۔ حرم کعبہ، محترم اور حرم نبوی، دلنواز ہے۔ اسی کی بدولت مکہ میں سر جھکتا ہے اور مدینہ میں دل، اسی ایک نام کی عظمت سے مکہ میں عقیدہ سنورتا اور مدینہ میں عقیدت نکھرتی ہے۔ اسی کی بنا پر ہم وہاں کے رہگزاروں اور کہساروں کو بھی محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں ایک پتھر کو پہچانتا ہوں جو بعثت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا۔'' نگہِ محبت ڈھونڈتی ہے کہ مکہ کے پتھروں میں وہ پتھر بھی تو کہیں ہوگا ؎

ڈھونڈیے موجِ صبا میں ڈھل کے اس کو ڈھونڈیے
قریہ قریہ، کُو بہ کُو، خود کو بکھرنے دیجیے

یہ کچھ کم ہے کہ ہم ان فضاؤں میں سانس لے رہے ہیں جن میں حضرت محمد ﷺ کے انفاسِ پاک کی مہک رچی ہوئی ہے۔ یہ کچھ کم خصوصیت ہے کہ ہم آبِ زمزم، رُک رُک کر نہیں، پیٹ بھر کر پی رہے ہیں۔ روایت ہے کہ حجۃ الوداع پر آپ ﷺ کے لیے آبِ زم زم کا ایک ڈول نکالا گیا۔ آپ ﷺ نے اس میں کچھ نوش فرمایا اور باقی ڈول میں اپنی ایک کلّی ڈال دی اور ارشاد فرمایا کہ اسے چاہِ زمزم میں ڈال دو، گویا ہم عاصی و خاطی، حضرت محمد ﷺ کا پیا ہوا پانی پی رہے ہیں کہ ؎

بہ خاصاں می دہد شہ، بادۂ نوشیدۂ خود را

یہاں تک کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی اسی نام اور اسی شخصیت عظیم و جلیل ﷺ کی بنا پر کرتے ہیں کہ

خدا کو میں نے پہچانا محمد کے وسیلے سے ﷺ

حضرت مجدّد الف ثانیؒ، اپنے ایک جملے میں کس خوبی سے حمد و نعت کو یکجا کر گئے ہیں۔

''حق سبحانہٗ تعالیٰ را بواسطۂ آں دوست دارم کہ ربِّ محمد است (ﷺ)''

کائنات کی اور کتنی ہی سعادتیں ہیں جو ہمیں اس نام کے وسیلے سے ملیں۔ ''تاریخ اُٹھایئے اور وَرق پہ وَرق پلٹیے، معلوم ہوگا کہ ایک ذاتِ محمد ﷺ نے پندرہ صدیوں میں کروڑوں انسانوں کو نشو و نما دی، بالا بلند کیا۔ دوام بخشا اور صرف ایک نسبت کی بدولت قیامت تک زندہ کر ڈالا، پھر یہ محض عقیدت کی بات نہیں، ارادت کا تذکرہ نہیں۔ اخلاص کا افسانہ نہیں۔ شوق کی دُھن نہیں، عشق کا راگ نہیں، حسن کی ثنا نہیں، تعریف کا لہجہ یا ثنا کا زمزمہ نہیں، ہر ایک بات پنی تلی، صاف ستھری، بولتی چالتی شہادت کے ساتھ موجود ہے۔'' (۱۳)

انھی فیوض و برکات کا نتیجہ ہے کہ گنہگار سے گنہگار مسلمان کے دل کی دھڑکن اس اسم پاک کے آتے ہی تیز ہو جاتی ہے اور جب بھی اس نام کی آبرو پر آنچ آنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو ہر مسلمان اپنی جان قربان کر دینے کو اپنے لیے سامانِ ناز اور وثیقۂ آخرت سمجھتا ہے کہ ؎

سر بیچ کر متاعِ دل و جاں خریدنا

سودا ہے وہ کہ جس میں خسارہ کوئی نہیں

آج طاغوتی قوتوں کی سب سے بڑی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ اس گنہگار، اس فاقہ کش اور اس گئے گزرے مسلمان کے دل سے ''روحِ محمد'' ﷺ نکال دی جائے۔ آج مسلم امّہ، چاروں طرف اسی یلغار کی زد میں ہے۔ ابلیسی قوتوں کی بھول ہے کہ مسلمان یہ اسمِ مبارک بھول سکتا ہے۔ وہ خود کو بھول سکتا ہے اس نام کو نہیں۔ وہ اپنے جسم کو تیروں سے چھلنی کرا سکتا ہے، دار و رسن پر جھول سکتا ہے مگر اس نام کو بھول نہیں سکتا کہ یہی اس کی زندگی بھی ہے اور زندگی کی آبرو بھی۔ اُسے یہ کسی نوع سے بھی گوارا نہیں کہ اس نام پر کسی انداز سے بھی حرف آئے کہ یہی نام اس کے ایمان کا اعتبار ہے۔ یاد رہے کہ ''عقیدوں اور نظریات سے محبت نہیں ہو سکتی، محبت انسان سے ہوتی ہے اگر پیغمبر ﷺ سے محبت نہ ہو تو خدا سے محبت اور اسلام سے محبت نہیں ہو سکتی۔'' (۱۴)

O

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ، تیرے محیط میں حباب

درج بالا شعر علامہ اقبالؒ کی مشہور نظم 'ذوق وشوق' کے چوتھے بند کا پہلا شعر ہے۔ اقبال دسمبر ۱۹۳۱ء میں عالمی مسلم کانفرنس میں شرکت کے لیے فلسطین گئے تھے۔ اُن کا قیام بیت المقدس میں بھی رہا اور انہوں نے فلسطین کے تاریخی مقامات بھی دیکھے، ان کے دل میں مدینہ منورہ میں حاضری کے لیے تڑپ تھی۔ اسباب بھی پیدا ہو چکے تھے مگر اقبالؔ نہ جا سکے، اُن کے اپنے الفاظ میں:۔

''اس بات سے شرم آتی تھی کہ گویا میں ضمناً دربارِ رسول اکرم ﷺ میں حاضر ہوں۔''

حرمِ نبوی ﷺ کا اس قدر احترام کہ اقبالؔ مقصد کی یکتائی اور وحدت کو مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جب بھی دیارِ ناز میں حاضری کی توفیق ملے تو مقصود صرف وہیں کی آرزو ہو اور وہیں کا ارادہ، وہ اپنی آرزو کو تقسیم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ 'ذوق وشوق' ایسی خوبصورت نعتیہ نظم آرزو کی اسی تڑپ اور فراق کے اسی گداز کے گرد گھومتی ہے۔

ع ..... چہ می کردیم یارب! گر نہ بودے نارسید نہا

بھارت کے معروف ادیب اور نقاد ڈاکٹر عبدالمغنی نے 'ذوق وشوق' کو حمدیہ نظم قرار دیا تھا مگر اقبال کے شارحین نے واضح طور پر اسے نعتیہ نظم قرار دیا ہے۔ مرزا محمد منور مرحوم کے الفاظ میں ''اقبال نے 'ذوق وشوق' کے بیشتر اشعار فلسطین میں کہے تھے مگر وہ عالمِ خیال میں نواحِ مدینہ منورہ کی سیر و زیارت کر رہے تھے۔ دردِ ہجراں مضطرب کر رہا تھا، دل میں دیارِ حبیب ﷺ کے دیدار کا

ذوق، شوق انگیز تھا، ارمان مچل رہے تھے، روحانی کرب اور جسمانی بُعد، عجیب بے سکون لذت اور بڑی لذیذ بے سکونی کا عالم تھا۔'' اس سلسلے میں برادر محترم پروفیسر افضال احمد انور کا مضمون (مطبوعہ نعت رنگ کراچی، فروری ۱۹۹۸ء) انتہائی مبسوط اور تحقیقی ہے، جس میں انہوں نے اس نظم کو نعتیہ قرار دیا ہے، میں نے جب اولیائے کرام کے ذوقِ نعت سے متعلق ایک کتاب ''تیرا وجود الکتاب'' کے نام سے مرتب کی تو مجھے محبّی پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے لکھا کہ اللہ کا شکر ہے کہ آپ نظم ''ذوق وشوق''، کے سلسلے میں میرے ہمنوا ہیں کہ وہ نظم اپنے اندر ثنائے رسول ﷺ کا ایک دل آویز اور روح پرور آہنگ لیے ہوئے ہے۔ یوں سمجھیے کہ اس نظم کا پہلا بند تشبیب کا ہے جس میں مدینہ منورہ کے مضافاتی مقامات اور وہاں کی دلکشا فضا کا تذکرہ ہے۔ دوسرے بند میں مسلم امّہ کی خستہ حالی کا دلگداز بیان ہے اس بند کے آخری دو شعر جذبۂ عشق کی تاثیر اور ہمہ گیری کے سلسلے میں ہیں اور وہ فی الواقع گریز کی حیثیت رکھتے ہیں اور آخری تین بند نبی کریم ﷺ کے بارے میں ہیں جن میں قلب ونظر کی جملہ چاہتیں منتہائے کمال پر پہنچ کر ہم آہنگ ہوگئی ہیں کہ

- قافلہ ہائے رنگ و بو (انبیائے کرام) آپ ﷺ کی تلاش میں نکلتے رہے، اور آپ ﷺ آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب ہیں۔ گویا آپ ﷺ وجہ وجودِ کائنات ہیں اور آخر میں تشریف لائے ہیں۔
- تب وتابِ کائنات آپ ﷺ کے دم قدم سے ہے۔ آپ ﷺ کے خرامِ ناز سے ریت کے ذروں میں بھی سورج کی چمک آ گئی ہے ؎

بہار آفریں ہے تری خوش خرامی
چمن کھل رہے ہیں ہر اک نقشِ پا سے

- شاہانہ جلال ہو یا فقیرانہ جمال، وہ آپ ﷺ کی نگہِ التفات کا ایک ادنی کرشمہ ہے۔
- آپ ﷺ کی محبت اور اطاعت، میری عبادت کا حسن ہے۔
- سرگرداں عقل کو آپ ﷺ کے فیض سے منزل کا سکون نصیب ہوتا ہے، آپ ﷺ ہی کے کرم سے محبت بھرے دلوں کو حضوری کا کیف ملتا ہے۔
- انوارِ رسالت کی تابانیوں ہی سے زندگی کی ظلمتوں کو روشنی مل سکتی ہے۔
- کائنات کی بے ثمر رُتوں کو بہاروں کی رعنائی آپ ﷺ کی رحمت سے ملے گی۔
- محبت کی دنیا میں فراق، وصل سے کہیں بڑھ کر ہے کہ اس میں لذتِ طلب ہے اور وصل میں مرگِ آرزو اور ؎

چیست حیاتِ دوام، سوختنِ ناتمام

زیب عنوان شعر، مدینہ منوّرہ میں یاد آتا رہا کہ اس میں براہِ راست نبیٔ کریم ﷺ سے خطاب ہے، آپ ﷺ لوح بھی ہیں، قلم بھی، گویا اللہ تعالیٰ کا وہ علم جس سے پوری کائنات درخشندہ ہے جو بہر کیف مکمل و اکمل ہے اور ہر شے کو محیط ہے۔ اس کے اسرار و رموز آپ ﷺ کے ذریعے ہم تک پہنچے۔ اگر آپ ﷺ نہ آتے تو ہماری پوری کائنات دُھواں دُھواں ہوتی۔ آپ ﷺ مجسم قرآن ہیں، آپ ﷺ کے اخلاق اور احکامات، قرآن کی ایک عملی تفسیر ہیں، قرآن پاک ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور آپ ﷺ اس کا ایک مکمل نمونہ۔ گویا آپ ﷺ ہی کے لیے کائنات وجود میں آئی۔ یہ آسمان جو بلند و رفیع ہے جس کا احاطہ ناممکنات میں سے ہے، وہ آپ ﷺ کے ''محیط وجود'' کے سامنے یوں ہے جیسے سمندر کے مقابل حباب، اقبالؔ ہی کا شعر ہے ؎

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

آخر میں حضرت جامیؒ کے شاگرد اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے استاد، حضرت شیخ محمد یعقوب صرفی کشمیریؒ کا ایک شعر ہے ؎

ھو الاول ھو الاخر، ھو الظاھر، ھو الباطن
ھو العبد الذی اَوحیٰ الیہ اللّٰہ ما اَوحیٰ

(وہی اول وہی آخر وہی ظاہر وہی باطن
وہی ہے مصطفیٰ ﷺ جس کو دیا اللہ نے، جو چاہا)

O

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھی تو ہو

دل، ہر جاندار کے سینے میں دھڑکتا اور خون فراہم کرتا ہے اگر اس کا یہی کام ہوتا تو کائنات کا سب سے سچا انسان (ﷺ) یہ نہ فرماتا کہ جسم میں ایک عضو ایسا ہے کہ وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے۔ وہ سنور جائے تو پورا جسم سنور جاتا ہے۔ استفسار پر آپ ﷺ نے دل کی جانب اشارہ فرمایا تھا۔ گویا دل بگاڑ یا سنوار، دونوں کا مرکز ہے اور اسی کا تزکیہ مسلمان کو مومن بنا دیتا ہے۔ اس کے مردہ ہونے سے کافر مردہ اور اسی کے زندہ ہونے سے مسلمان پایندہ ہیں ورنہ حیوان اور انسان میں کیا فرق ہے؟ مسلمان اور کافر میں کیا فرق ہے؟ یہ بھی حق ہے کہ آنکھیں نابینا نہیں ہوتیں، سینوں کے اندر دل اندھے ہو جاتے ہیں۔ دل کی زندگی اللہ اور اس کے نبی ﷺ کی یاد سے عبارت ہے۔ گویا زندہ دل وہی ہے جو محبوب کی یاد میں دھڑکتا ہے۔ اقبالؒ نے زوالِ اُمّہ کی وجہ یہ بتائی ہے ؎

شبے پیشِ خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا خوارند و زارند
ندا آمد، نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

معلوم یہ ہوا کہ ہم مسلمان اس لیے زوال پذیر ہیں کہ ہم جانوروں کے مانند سینے میں صرف دھڑکنے والا ایک دل رکھتے ہیں مگر اس دل کی دھڑکن کسی یاد سے عبارت نہیں، کسی حسین آرزو کے دل میں آ جانے ہی سے یہ ویرانہ، آباد ہوا کرتا ہے ؎

تمہاری آرزو کیوں دل کے ویرانے میں آ پہنچی
بہاروں میں بسی ہوتی، ستاروں میں رہی ہوتی

ویران دل انتظار و آرزو کی لذتوں اور ہجر و وصال کی کیفیتوں سے تہی ہوتا ہے۔ یادوں سے خالی دل محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اور یادوں سے معمور دل، ایک پر کیف کائنات ہے۔ یہی دل زندہ ہے اور دل والے کبھی تنہا نہیں ہوتے۔ اُن کی صبحیں یادوں سے معطر اور شامیں اشکوں سے منور رہتی ہے ؎

یاد کے قصر میں اُمید کی قندیلیں ہیں
میں نے آباد کیے درد کے صحرا کیسے

اگر ہم اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ پانا چاہتے ہیں تو ہمیں دل کی ویرانی کو نبیٔ کریم ﷺ کی محبت سے شادابی عطا کرنا ہوگی۔ یہی ایک علاج ہے پژمردگی کو شگفتگی میں بدلنے کا ؎

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اور یاد رہے کہ اطاعت کے بغیر محبت ایک لفظ ہے بے معنی اور ایک خاکہ ہے بے رنگ، دراصل اطاعتِ رسول پاک ﷺ ہی سے دل زندہ ہوتے اور زندہ رہتے ہیں۔

زندہ دل میں محبت بھی ہوتی ہے اور احترام بھی، عقیدت بھی ہوتی ہے اور احتیاط بھی۔ خوف بھی ہوتا ہے اور اُمید بھی۔ احترام کا جذبہ، محبت کو حد کے اندر رکھتا ہے، احتیاط، عقیدت کو مبالغے سے بچاتی ہے۔ خوف بے راہ روی سے بچاتا اور اُمید، یاس کی تاریکیوں سے، خوف، محبوب کی عظمت کے تصور سے انسان کو لرزہ براندام رکھتا ہے۔ دل میں خوف اس کی زندگی کی علامت ہے۔ یہ خوف ایک چراغ ہے جس کی روشنی میں بندہ خیر و شر کو دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی نیکیوں کے بارے میں بھی ایک خوف سا دامن گیر رہتا ہے کہ نہیں معلوم یہ قبول بھی ہوتی ہیں یا نہیں۔ یوں فخر و تکبر کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ کوتاہیوں پر ندامت اور لغزشوں پر استغفار، دل میں انابت پیدا کرتا ہے۔ کوتاہیٔ عمل کا احساس اور نیکیوں میں سبقت لے جانے کا جذبہ، دل زندہ کی ایک تابندہ علامت ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ، کہیں تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے ترے جینے سے

دل، مادی زندگی کی نسبت، روحانی زندگی میں کہیں زیادہ اہم ہے۔ مادی طور پر دھڑکنے والے دل کی زندگی محدود مگر روحانی طور پر زندہ دل کو قبر کی گہرائی بھی خاموش نہیں کر سکتی۔ ہرگز نمیرد

آنکہ دلش زندہ شد بعشق۔ ذکر و فکر روح کی غذا ہے۔ یاد زندہ رہے تو دل محبت کے اُجالوں سے جگمگا اُٹھتا ہے۔ محبت کا نتیجہ سوزِ طلب ہے، دلِ بے آرزو، حیوانوں کو زیب دیتا ہے، انسانوں کو نہیں..... بے شعور انسان طبیعات کی رو سے ذی حیات ہے۔ حقیقت کی رو سے نہیں، وہ زندہ حیوان ہے، زندہ انسان نہیں، زندہ انسان وہ ہے جسے شعورِ حق و باطل ہو.....اقبالؔ نے کہا تھا ؎

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

O

☆

''اللہ والے کا دل اس کی آنکھ میں ہوتا ہے اور آنکھ دل میں ہوتی ہے۔ صاحبِ حال ''نمی دانم'' کے پردے میں دانائی کے چراغ جلاتا ہے۔ اس کی خاموشی میں جمالِ گفتگو کے جلوے ہوتے ہیں۔ اس کے قرب میں انسان اپنے آپ سے دور چلا جاتا ہے۔ اس کی محفل میں گردشِ زمان و مکان رک سی جاتی ہے۔''

(واصف علی واصف)

O

اک شخص سراپا رحمت ہے، اک ذات ہے یکسر نورِ خدا
ہم ارض و سما کو دیکھ چکے، کوئی اس جیسا نہ ملا
سورج نے ضیا اس چشم سے لی، اس نطق سے غنچے پھول بنے
اُٹھا تو ستارے فرش پہ تھے، بیٹھا تو زمیں کو عرش کیا
بطحا کے مسافر دیکھ کے چل یہ اس کے نقوشِ پا ہی تو ہیں
تاریخ کے لالہ زاروں میں از غارِ حرا تا کرب و بلا
کیا بات کہی ہے مرشد نے، اللہ کی اس پر رحمت ہو
سبحان اللّٰہ، ما اجملک ، ما احسنک، ما اکملک
کتھے مہر علی، کتھے تیری ثنا، گستاخ اکھیں کتھے جا اڑیاں

آغا شورش کاشمیری (۱۹۱۴ء۔۱۹۷۵ء) سے مجھے قلبی اور قلمی لگاؤ ہے، قلبی اس لیے کہ ختمِ نبوت کے تحفظ کے سلسلے میں اُن کی خدمات قابلِ تحسین اور قابل قدر ہیں۔ قلمی اس اعتبار سے کہ ان کے اندازِ نگارش نے میرے قلم کو اظہار کے بہت سے تیور عطا کیے اور خود ان کی تحریر و تقریر میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا رنگ، ڈھنگ اور آہنگ نمایاں ہے۔ ان کی بیشتر شاعری سیاسی موضوعات سے متعلق ہے۔ گویا ہنگامی نوعیت کی ہے، ظفر علی خاں کی طرح ان کی نعتیہ شاعری، مختصر ضرور ہے مگر خلوصِ دل اور ندرتِ اظہار نے اُسے آفاقی

تاب وتب عطا کر رکھی ہے۔ان کی ایک طویل نعت کے درج بالا چار شعر بھی مدینہ منوّرہ میں یاد آتے رہے، یہ نعت دراصل تضمین ہے، حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ کی ایک معروف نعت کے ایک انتہائی مقبول شعر پر، جس میں انہوں نے اُس بہر نوع اجمل، اکمل اور احسن وجودِ ذی جود ﷺ کی توصیف کے سلسلے میں اپنے عجزِ اظہار کو بڑے ہی دل نواز انداز سے بیان کیا ہے۔نعت نگاری کے سلسلے میں ڈاکٹر خورشید رضوی، اپنے رنگ میں بڑے کام کی بات کہہ گئے ہیں ۔

شان ان کی سوچیے اور سوچ میں کھو جایئے
نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جایئے
سونپ دیجے دیدۂ تر کو زباں کی حسرتیں
اور اس عالم میں جتنا بن پڑے رو جایئے
یا حصارِ لفظ سے باہر زمینِ شعر میں
ہو سکے تو سرد آہوں کے شجر بو جایئے

درج بالا اشعار میں شورشؔ کہتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ سراپا رحمت ہیں۔قرآن پاک نے آپ کو رحمۃ للعالمین قرار دیا..... درخت اپنے پھل سے اور انسان اپنی تعلیم سے پہچانا جاتا ہے۔ نبی ﷺ کی شناخت قرآنِ مجید سے ہوتی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ حضور ﷺ کا وجود سراپا رحمت ہے۔ وہ ضلالت کو ہدایت دینے والے اور جہالت کو علوم سکھانے والے ہیں۔گمناموں کو رفعت دینے والے، مجہولوں کو نامور کر دینے والے، قلت کو کثرت اور تنگ دستی کو غنا سے بدل دینے والے ہیں۔ خدا نے ان کے ذریعے سے اختلاف کو اتفاق میں بدلا۔ پھٹے ہوئے دلوں کو اُلفت عطا فرمائی۔ یہ رحمت ہی کے مختلف مظاہر ہیں..... یہ مقام بڑے غور کا ہے کہ کیا ایک انسان سب انسانوں کے لیے اور سب جہانوں کے لیے رحمت یا باعث رحمت ہوسکتا ہے اور اگر ایک انسان سب انسانوں کے لیے، سب جہانوں کے لیے، پوری کائنات کے لیے، رسولِ رحمت ہے تو وہ ایک انسان کیا انسان ہوگا؟ اب ایسے انسان کے بارے میں کچھ کہنے کی بجائے اُس پر درود وسلام بھیجا جائے۔ عام آدمی اپنی ذات کے لیے باعث رحمت نہیں ہوسکتا اور سرکار ﷺ پوری کائنات کے لیے باعثِ رحمت ہیں۔یعنی پوری کائنات کے لیے مایوسیوں سے نکلنے کی ضمانت عطا فرماتے ہیں تو مطلب واضح ہوا کہ رحمت، قربِ رسول ﷺ ہے اور اس قرب سے محروم انسان کو اس کے اعمال کی عبرت کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔عمر گزشتہ کے کفر اور اس کی بداعمالیوں کے نتیجے سے

بچنے کا واحد ذریعہ حضورﷺ کی مہربانی ہے۔ہمیں اپنے اعمال کی کمی بیشی سے بچانے والی ذات حضور اکرمﷺ کی ذاتِ گرامی قدر ہے۔آپﷺ کا وجودِ مبارک جہاں باعثِ تخلیق کائنات ہے وہاں باعثِ قیام کائنات اور باعثِ نجاتِ کائنات بھی ہے۔ (۱۵)

چونکہ نبیٔ پاکﷺ وجہِ وجودِ کائنات ہیں اس لیے شورشؔ نے اپنے انداز میں کہا کہ سورج اُن کی آنکھوں سے ضیا لیتا اور غنچے ان کے نطق سے پھول بنتے ہیں۔اُن کی تکریم کے لیے ستارے فرش اور زمین عرش ہو جاتی ہے۔زائر کو اگر نگہِ شوق نصیب ہو تو اس وادیٔ جمال میں اُسے قدم قدم تاریخ کے لالہ زار لہراتے نظر آتے ہیں۔غارِ حرا سے کرب و بلا تک تاریخ کے حاشیے آنسوؤں سے تر بھی ہیں اور لہو سے رنگین بھی۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ، ابتدا ہے اسماعیلؑ

O

☆

وہ جس کے لطف سے کھلتا ہے غنچۂ ادراک
وہ جس کا نام، نسیمِ گرہ کشا کی طرح

(سراج الدین ظفر)

O

وہ اک اُمّی کہ ہر دانش کو چمکاتا ہُوا آیا
وہ اک دامانِ بخشش پھول برساتا ہُوا آیا
وہ اک نغمہ کہ انسانوں کو چونکاتا ہُوا آیا
وہ اک جذبہ کہ ارمانوں کو دھڑکاتا ہُوا آیا
وہ اک عظمت کہ مظلوموں کے چہروں پر دمک اُٹھی
وہ اک بندہ کہ سلطانوں کو ٹھکراتا ہُوا آیا
مشیّت حسن کی تکمیل فرماتی ہوئی اُبھری
تصوّر آخری تصویر بن جاتا ہُوا آیا
ترے در کے سوا آسودگیِ دل کہاں ملتی
ترے در پر زمانہ ٹھوکریں کھاتا ہُوا آیا

درجِ بالا پانچ شعر یہاں بھی یاد رہے اور وہاں بھی یاد آئے جہاں زائر تجلیوں میں کھو کر خود کو بھول جاتا ہے۔ ان اشعار میں نبیٔ پاک ﷺ کی جامع کمالات ہستی کی چار صفات کا ذکر ہے۔ آپ ﷺ امّی ہیں مگر آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا ہُوا ایک ایک لفظ حکمت و بصیرت کا بحر بے پایاں ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیم نے خفتہ و مردہ انسانیت کو زندگی اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو بندگی کا پیغام دیا اور بتایا کہ بندگی ہی میں زندگی ہے، بندگی کے بغیر زندگی، شرمندگی ہے، اور مقامِ عبودیت ہی میں اس احسن تقویم کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ آپ ﷺ نے جذبوں کو بھی جلا بخشی کہ اونٹوں

کے چرانے والے وقت کے شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے لگے اور انہوں نے قیصر و کسریٰ کے تبختر کو مٹی میں ملا دیا۔ آپ ﷺ نے مظلوموں کے قدموں میں ظالموں کو جھکا دیا اور ہر رسم جاہلی کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ آپ ﷺ صورت اور سیرت کے اعتبار سے مجسم حسن تھے۔ آپ ﷺ ہمارے لیے ایک عظیم احسانِ ربی ہیں، اور آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کے اتنے احسان ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ والضحیٰ میں واضح کر دیا کہ

''تجھے تیرا رب بہت جلد انعام دے گا اور تو راضی ہو جائے گا۔''

ہم اس انعام کی وسعتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے جس سے حضور ﷺ خوش ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ذکر کی رفعت، متبعین کی کثرت اور اُخروی عظمت کے ساتھ ساتھ وہ حقِ شفاعت بھی شامل ہے جو ہم عاصیوں کے لیے مخصوص ہے۔ بہر کیف آپ ﷺ کے احسن وجود میں مشیّت نے حسن کی تکمیل فرما دی اور مصورِ حقیقی کا مثالی تصور، آخری تصویر بن گیا کہ جناب عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ؎

''زلیخا کی سہیلیاں اگر حضور اقدس ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھ لیتیں تو ہاتھوں کے بجائے دلوں کو کاٹ لیتیں۔''

علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کا پورا پورا جمال ظاہر نہیں کیا گیا ورنہ آدمی دیکھ نہ سکتے۔ حضرت محمد قاسم نانوتویؒ کے الفاظ میں:

جمال کو ترے کب پہنچے حسن یوسفؑ کا
وہ دلربائے زلیخا، تو شاہدِ ستّار
رہا جمال پہ تیرے حجابِ بشریت
نہ جانا کون ہے کچھ بھی کسی نے، جُز ستّار

آخری شعر میں ضمیر جعفریؔ کہتے ہیں کہ پریشاں حال اور گم کردہ راہ انسان کو مدینہ پہنچ کر، سکون منزل کا ایک طمانیت بخش احساس ہوتا ہے اور یقین اُبھرتا ہے کہ یہیں سے دل کی تڑپ کو آسودگی، نگاہ کی آوارگی کو ارتکاز، فکر کی آلودگی کو طہارت اور زبان و قلم کی بے احتیاطیوں کو ادب کے قرینے عطا ہوں گے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ایک نعتیہ قصیدے کی تضمین میں لکھتے ہیں: (ترجمہ)

''آپ ﷺ ہر لحظہ وجودِ عالم کا دار و مدار ہیں اور ہر مشکل میں سخاوت کے

دروازے کی کنجی ہیں اور ہر شدت میں پریشان و بے قرار کی پناہ ہیں اور ہر
مصیبت میں آفت رسیدہ کا سہارا ہیں اور ہر ایک توبہ کرنے والے کے
لیے بخشش کا وسیلہ ہیں۔''

آخر میں حسن رضوی کے دو خوبصورت نعتیہ شعر۔

درود اس کے لیے ہے، سلام اس کے لیے
کہ جس کے نور سے گھر گھر چراغ جلتا ہے
ملی ہیں مجھ کو وہ کرنیں حضور ﷺ کے دَر سے
کہ جن کو دیکھ لے سورج تو رُخ پلٹتا ہے

O

☆

جو تیری یاد میں گزرے، وہی پَل زندگی ٹھہرے
بظاہر ساری گھڑیاں، سارے لمحے ایک جیسے ہیں
(شہزاد احمد)

O

تری حدیث ہے اُمُّ الکتاب کی تفسیر
تری زباں بھی خدا کی زباں سے ملتی ہے
اسی سے ہوتی ہے تزئینِ گلشنِ ہستی
وہ بوئے گل جو ترے گلستاں سے ملتی ہے

''سورۂ والنجم'' میں اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ کی گفتار کے بارے میں واضح فرمادیا 'وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ' کہ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتے۔ کردار، سراپا حسن، اس لیے رفتار کے ٹیڑھے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ گم کردہ راہ بھی نہیں اور نہ اُن کا راستہ غلط ہے، وہ تو ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ہیں، بہکنے اور بھٹکنے کا خدشہ ہی نہیں، شاعر نے جو کہا کہ ؎

تری زباں بھی خدا کی زباں سے ملتی ہے

اسی لیے کہا کہ آپﷺ وحیٔ الٰہی کے بغیر لب کشائی ہی نہیں کرتے، تاریخ شاہد ہے کہ آپﷺ کی زبانِ مبارک سے مزاح اور خوش طبعی کے موقعوں پر بھی، سچ اور حق کے سوا کچھ نہ نکلتا تھا اور غصے کے عالم میں بھی آپﷺ کو اپنی زبان پر اس قدر رقابو تھا کہ کوئی نامناسب کلمہ نکلتا ہی نہیں تھا۔ حق یہ ہے کہ آج:

''زبانوں میں تاثیر ہے تو اس نام (محمدﷺ) سے، قلم میں ولولہ ہے تو اس ذکر سے، لفظوں میں بانکپن ہے تو اس خیال سے، دل میں سرور ہے، تو اس تصور سے، دماغ میں حسن ہے تو اس جمال سے، آنکھوں میں نور ہے تو اس ظہور سے۔'' (۱۶)

نبیٔ پاکﷺ کی پوری زندگی، قرآن پاک کے عطا کردہ معیار کے عین مطابق تھی اسی لیے آپﷺ کو مجسم قرآن کہا گیا۔ جناب عائشہؓ سے کسی نے آپﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا خلقہٗ القرآن۔ دینِ اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نوعِ انسانی کو زندگی کا ایک ایسا ضابطہ دیا جو حیاتِ انسانی کے تمام پہلوؤں پر حاوی بھی ہے اور اُن کے لیے کافی وشافی بھی اور راہنمائی چاہنے والوں کے لیے قدم قدم روشنی موجود ہے۔

اسلام نے دیگر مذاہب کے مانند صرف تعلیمات پر اکتفا نہیں کی بلکہ سیرتِ مطہرہ کی شکل میں اس کا عملی نمونہ بھی ہمارے سامنے رکھ دیا کہ اس الوہی ضابطے پر یوں عمل کرو جیسے صاحبِ کتاب ﷺ نے کیا کیونکہ بغیر معلم کے کتاب بے تاثیر ہے۔ وہ تعلیم تو دے سکتی ہے مگر تربیت نہیں کر سکتی۔ اسی کو قرآن پاک نے تلاوت کے ساتھ تزکیہ وحکمت سے تعبیر کیا ہے۔ تربیت، شخصیت کیا کرتی ہے، کتاب نہیں۔ یہی دلیل ہے اس امر کی کہ نبیٔ پاک ﷺ کے فرامین، قرآن ہی کی تفسیر ہیں اور قرآن آپ ﷺ کی سیرت کا عکسِ جمیل اور افہام وتفہیم اور علم وعمل کے لیے دونوں لازم وملزوم۔ آپ ﷺ کی احادیث اور آپ ﷺ کی سنت مطہرہ، دونوں قابل تقلید ٹھہرتے ہیں کہ ہمیں آپ ﷺ ہی کے اتباع کا دعویٰ ہے اور اسی کا حکم۔ گویا ایک وحی متلو ہے ایک غیر متلو۔ ایک قرآن پاک کی شکل میں، جس کی تلاوت فرض ہے اور دوسری احادیث کی صورت میں کہ ان کی تلاوت نہیں ہوتی مگر وہ اس لیے قابل عمل ٹھہرتی ہیں کہ اُن کے بغیر قرآن کے اسرار ورموز کھلتے اور کھِلتے نہیں۔ ہمیں قرآنِ پاک پر عمل کرنا ہے۔ کیسے؟ جیسے صاحب قرآن ﷺ نے کیا۔ ہمیں قرآن کو ویسے سمجھنا ہے جیسے اس عظیم الشان انسان ﷺ نے سمجھا یا جو معلم بہ تعلیمِ الٰہی تھا، نبیٔ پاک ﷺ کی سنت ہی سے سوچ کو دانائی، گفتار کو سچائی، رفتار کو زیبائی اور کردار کو رعنائی ملتی ہے۔ اس کائنات میں جہاں جہاں نور ہے وہ سنت ہی کا فیض ہے اور جہاں جہاں ظلمت ہے وہ حصولِ نور کے لیے مدینے ہی کی طرف لپک رہی ہے۔ ہمارے پاس راہنمائی کے لیے دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک قرآن اور دوسری سنت۔ ؎

ہر خیر تری سیرتِ تاباں سے چلی ہے
خوشبو کی ہر اک موج گلستاں سے چلی ہے

''ایک قرآن وہ ہے جو تیس پاروں میں بند ہے اور جس کی تلاوت کرۂ ارض کے کسی نہ کسی حصے میں روز وشب کی ہر ساعت کے ساتھ ہوتی ہے جو اذانوں میں گونجتا، نمازوں میں دمکتا اور یا اللہ کی تنہائیوں میں چمکتا ہے جو عابدوں کا اوڑھنا، زاہدوں کا لباس، فقیروں کا توشہ، عالموں کی غذا، فقیہوں کی روشنی اور درویشوں کی متاع ہے۔ دوسرا قرآن وہ ہے جو تیرہ برس تک مکہ کی گلیوں میں پھرتا اور پتھر کھاتا رہا، جس کی ریش مبارک پر خون کے قطرے جم گئے تھے۔ صلوٰۃ وسلام ہو اس عظیم انسان ﷺ پر جو خلوتوں کا ملجا اور جلوتوں کا ماویٰ ہے۔ جس کا نور سب سے پہلے پیدا کیا گیا اور جس کا ظہور سب سے آخر میں ہوا اور جس پر خدا کی حجت ختم ہوتی ہے۔''(۱۷)

تیری معراج کہ تو لوح و قلم تک پہنچا
میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا

اسراء سے مراد ہے راتوں رات نبیٔ پاک ﷺ کا مکہ سے بیت المقدس تشریف لے جانا اور ''معراج'' سے مراد وہاں سے عالم بالا میں تشریف لے جانا ہے۔ یہ واقعہ جسم اور روح سمیت پیش آیا تھا۔ وقت کے بارے میں اختلاف ہے۔ تفصیل کچھ یوں ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام براق لے کر تشریف لائے۔ یہ خچر سے چھوٹا ایک جانور ہے جو اپنا کھر اپنی نگاہ کے آخری مقام پر رکھتا ہے۔ اس وقت نبیٔ پاک ﷺ مسجد حرام میں تھے۔ آپ ﷺ اس جانور پر سوار ہو کر حضرت جبریل علیہ السلام کی معیّت میں بیت المقدس تشریف لائے اور وہاں جس حلقے میں انبیا اپنی سواریاں باندھتے تھے اسی میں براق کو باندھ دیا۔ پھر مسجد اقصیٰ میں داخل ہوئے اور اس میں انبیا کی امامت فرمائی۔ پھر حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے پاس دو برتن لائے۔ ایک شراب کا اور ایک دودھ کا، آپ نے دودھ کو پسند فرمایا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا ''آپ ﷺ نے فطرت پائی۔ آپ ﷺ کو بھی ہدایت نصیب ہوئی اور آپ ﷺ کی امت کو بھی۔ اگر آپ ﷺ نے شراب پسند فرمائی ہوتی تو آپ ﷺ کی اُمت گمراہ ہو جاتی۔'' پھر آپ ﷺ کو بیت المقدس سے آسمانِ دنیا تک لے جایا گیا۔ مختلف آسمانوں کے دروازے آپ ﷺ کے لیے کھلتے گئے۔ ہر آسمان پر موجود نبی، سلام و مرحبا کے بعد آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کرتا رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ساتویں آسمان پر اپنی پشت بیت المعمور سے لگائے ہوئے تھے جس میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں اور دوبارہ ان کے پلٹنے کی باری نہیں آتی اور جو خانہ کعبہ کے عین اوپر واقع ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبیٔ اکرم ﷺ کو وہ رفعت اور عظمت عطا کی جس کا تصور بھی ہم لوگ نہیں کر

سکتے۔ اپنے خصوصی جلووں سے اُن کی نگاہوں کو شاد کام فرمایا اور نماز کے تحفے کے ساتھ اُن کے دل کو مسرتوں سے بھر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازوں کے ثواب کو پچاس نمازوں کے برابر کر دیا۔ حضور ﷺ نے عالمِ حضوری میں کیا کچھ پایا اور عطا کرنے والے نے کیا کچھ عطا کیا اس کا احاطہ ناممکنات میں سے ہے ؎

سرنگوں ہو گئے ظلمت کے نشاں آج کی رات
ہر طرف نور کے دریا ہیں رواں آج کی رات
گردشِ شام و سحر اپنا چلن بھول گئی
جادۂ شوق پہ ہے کون رواں آج کی رات
جس طرف سے وہ گئے، راستے گلزار بنے
نقشِ پا بن گئے منزل کا نشاں آج کی رات
سانس لینے کی فرشتوں کو جہاں تاب نہیں
کون یہ محوِ تکلّم ہے وہاں آج کی رات

ہم عاصیوں کی معراج تو ان قدموں تک پہنچنا ہے جو عرش پر پہنچ کر، ہماری فلاح و بہبود اور رشد و ہدایت کے لیے فرش پر آئے تھے۔ اُن قدموں کی چاندنی نصیب ہو جائے تو قلب و نظر اور گرد و پیش کی ہر ظلمت اُجالوں میں ڈھل سکتی ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ کے وہ مبارک قدم جنھوں نے عرب کی ریت کو ریشم کا لوچ عطا کیا تھا ؎

قدم بوسی کی دولت مل گئی تھی چند ذرّوں کو
ابھی تک وہ چمکتے ہیں ستاروں کی جبیں ہو کر

اور بقول علامہ اقبالؔ جس کے نشانِ پا سے سینکڑوں طور اُبھرتے اور لاکھوں جلوے بکھرتے ہیں۔ وہ قدم نصیب ہو جائیں تو ہمیں کسی اور معراج کی ضرورت باقی نہیں رہتی ؎

شاید اسی کا نام ہے توہینِ جستجو
منزل کی ہو تلاش ترے نقشِ پا کے بعد

اس عاجز نے کچھ ایسے ہی احساسات کے ساتھ مسجدِ نبوی، ریاض الجنۃ اور قدمین شریفین کے سامنے، یہ شعر بار بار پڑھا کہ اپنے نقوشِ پا کی چمک سے، میرے دل کی تاریکیوں کو بھی انوار عطا کر دیجیے کہ ذرے آفتاب سے ٹکرا کر ہی ماہتاب بنا کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک اور

شعر بھی یاد آتا رہا، کاش! کیف ونشاط کا یہ عالم مستقل سا ہو جائے اور ان کی یاد، دل کی انگشتری کا نگینہ بنی رہے۔ وہ شعر یوں ہے ؎

مجھ کو بھی اس زمین پہ معراج بخش دے
توفیق دے کہ خود کو ترا نقشِ پا کہوں

حق یہ ہے کہ اسی نقشِ پا کی چاندنی نے قلب ونظر کے اندھیروں کو اُجالا عطا کیا۔ یہی چاندنی، خود آگہی کو خدا آگاہی تک لے گئی اور اسی معرفت نے تشکیلِ ذات کو تکمیلِ ذات تک پہنچا دیا۔ یوں خودی کے راز داں، خدا کے ترجماں بن گئے۔ نبیٔ کریم ﷺ نے ایک ایسی تاریخ مرتب کی کہ اس کا ہر رخ قابلِ قدر، ہر انداز قابلِ تحسین اور ہر باب قابلِ ستائش ہے..... تاریخ کی اس شاہراہ سے انسانوں کے وہ عظیم قافلے گزر رہے ہیں جن کے غبارِ راہ نے مہر و ماہ کو غازہ عطا کیا، جن کی نگاہوں نے دلوں کو تسخیر کیا، جن کی جبینوں نے سجدوں کو انوار دیئے اور جن کی جنوں آفرینیوں نے جہانِ ہوش کو زیر و زبر کیا۔ حق یہ ہے کہ ہمارے گرد و پیش سعادتوں اور فضیلتوں کے جتنے ہالے ہیں وہ آپ ﷺ ہی کے نقوشِ پا کی چاندنی سے مستعار ہیں۔ ؎

اِک روز اس کو خلعتِ نقشِ قدم ملے
شاعر بھی آرزو کے گھروندے بنائے ہے

O

☆

آدم کا فخر، عظمتِ انساں مرا نبی ﷺ
راہِ یقین و منزلِ عرفاں مرا نبی ﷺ

(محمد احمد اریب)

O

آؤ، کہ ذکرِ حسنِ شہِ بحر و بر کریں
جلوے بکھیر دیں، شبِ غم کی سحر کریں
جو حسن میرے پیشِ نظر ہے اگر اُسے
جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں
فرمائیں تو طلوع ہو مغرب سے آفتاب
چاہیں تو اک اشارے سے شقِّ قمر کریں
وہ چاہیں تو صدف کو دُرِ بے بہا ملے
وہ چاہیں تو خزف کو حریفِ گہر کریں
شعر و ادب بھی، آہ و فغاں بھی ہے ان کا فیض
پیشِ حضور، اپنی متاعِ ہُنر کریں
آنسو قبول ہوں درِ خیر الانام پر
نالے طوافِ روضۂ خیرالبشر ﷺ کریں

یہ نعتیہ اشعار مجھے یاد بھی ہیں اور کئی حوالوں سے عزیز بھی۔ نبیٔ کریم ﷺ کا حوالہ تو بہر نوع عزیز ترین ہے کہ نعت نام ہی اُن کی توصیف کا ہے۔ میں نے ۱۹۷۶ء میں ایک نعتیہ مجموعہ ''مخزنِ نعت'' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اس میں حافظ مظہر الدینؒ کی درج بالا نعت، ذیلی حاشیے کے ساتھ شامل کی تھی۔ کتاب کی اشاعت کے بعد، جناب حافظ مظہر الدینؒ گوجرانوالا تشریف لائے اور مجھے ملنے کی آرزو کی، میں خود حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھ سے سوال کیا ''میں نے کئی نعتیں کہی ہیں، آپ نے یہی نعت کیوں منتخب کی؟'' جہاں تک یاد ہے میں نے عرض کی کہ صرف اس لیے کہ

اس نعت کے بعض شعر میرے والد اکثر گنگنایا کرتے ہیں۔'' آپ کے والد؟ میں نے جواب دیا'' مولوی محمد شریف'' حافظ مظہر الدینؒ چونکے اور کچھ لمحوں کے لیے مراقبے میں چلے گئے کیونکہ میرے والد اور اُن کے والد دونوں حضرت سید سراج الحق پانی پتیؒ سے بیعت تھے۔ والدِ محترم کے ذکر کے ساتھ ہی، حافظ صاحب کا التفات، احترام کے سانچے میں ڈھل گیا اور انہوں نے انکشاف کیا کہ اس نعت کے لکھنے کے بعد انہیں دیارِ خدا اور رسول ﷺ میں حاضری کا شرف نصیب ہُوا تھا۔ میں بوقتِ حاضری درج بالا اشعار ہی پڑھتا رہا۔ نعت طویل ہے اور غالباً ان کے مجموعۂ نعت تجلیات کے شروع میں ہے۔ اس نعت کا آخری شعر ہے ؎

اب کے جو قصدِ طیبہ کریں رہروانِ شوق
مظہر کو بھی ضرور شریکِ سفر کریں

جناب حافظ مظہر الدینؒ اہلِ دل بھی تھے اور صاحبِ نظر بھی۔ حبِ رسولِ اکرم ﷺ انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ اُن کا نعتیہ کلام گدازِ فکر کا ایک ایسا مرقع ہے کہ وہ خود بخود نگاہ میں جچتا اور دل میں سماتا چلا جاتا ہے۔ اسلاف کی کہی گئی نعتوں میں محبت کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے مگر تغزل کا وہ لوچ نہیں جو جدید شعراء کے ہاں ہے۔ خدا کرے کہ جدید شعراء کے دل بھی اسلاف کے سوز و درد سے معمور ہو جائیں۔ اگر آج کے شاعر کو ساز کے ساتھ سوز بھی مل جائے تو سونے پر سہاگا ہے۔ تاہم حافظ مظہر الدینؒ کے ہاں دردِ دل شعر کے سانچے میں ڈھل کر سحرِ حلال بن گیا ہے۔ گویا وہ قدیم و جدید کا ایک خوبصورت امتزاج ہیں۔ نعت فی الواقع نیاز و ناز کی ایک ایسی کائنات ہے جہاں ذوق کو سرمدی سرور اور شوق کو کیفِ دوام عطا ہوتا ہے۔ یہ محبت کی ایک کیف آفرین دنیا ہے۔ یہاں روح کی لرزشیں، داستانِ غم سناتی اور محبت کے آنسو، دردِ دل کہتے ہیں۔ عالمِ نعت گوئی میں جب جنوں نغمہ بار ہوتا ہے تو کونین جھومتے اور جہانِ ہوش زیر و زبر ہو جاتا ہے اور جنوں ہی جادہ، جنوں ہی رہبر اور جنوں ہی منزل بن جاتا ہے۔ وفورِ عشق و مستی کا یہی وہ مقام ہے جہاں وہی اول ہوتے ہیں، وہی آخر، وہی ابتدا، وہی انتہا، وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ۔

یاد رہے کہ حبِّ رسول ﷺ کا دل کی گہرائیوں میں اُتر جانا، اساسِ نعت، گنبدِ خضریٰ سے دُوری کا احساس، گدازِ نعت اور اُسوۂ رسول ﷺ کا چراغِ زندگی بن جانا مقصودِ نعت ہے۔

O

کہا ہے کس نے کہ سردارِ انبیا نہ کہو
کہا ہے کس نے کہ سرتاجِ اولیا نہ کہو
کہا ہے کس نے کہ روئے رسولِ اکرم ﷺ کو
رخِ جمالِ الٰہی کا آئینہ نہ کہو
کہا ہے کس نے کہ الطافِ حق کے قاسم کو
کمالِ رحمتِ باری کی انتہا نہ کہو
کہا ہے کہ کس نے کہ سرتا بپا ادب بن کر
نبی ﷺ کو مرکزِ انوارِ انبیا نہ کہو
کہا کس نے کہ مایوسیوں کے عالم میں
دلِ شکستۂ عاشق کا آسرا نہ کہو
کہا ہے کس نے کہ مشکل کشائیوں کے لیے
انہیں وسیلۂ تکمیلِ التجا نہ کہو
یہی ہے فلسفۂ 'انما انا بشر'
خدا کے بعد سبھی کچھ کہو، خدا نہ کہو

رسولِ پاک ﷺ کو کس نے کیا کہا اور کیا نہیں کہا اور کیا کہنا چاہیے؟ اس کے بارے میں سوچ و بچار ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ایک ذرہ، آفتابِ عالم تاب کی تابشوں کو سمیٹنے کی کوشش میں

مصروف ہے اور اپنی حقیقت اور حیثیت دونوں سے بے خبر ہے۔ بہتر ہے کہ انسان غالبؔ کا ہمزباں ہوکر ثنائے رسول ﷺ کو ربِ رسول پر چھوڑ دے اور اپنے لیے ثنائے خواجہ ﷺ کی بہترین شکل یعنی درود وسلام کو چن لے کہ یہ قربِ رسالت ﷺ کا ذریعہ بھی ہے اور ایک پاکیزہ محرک بھی کہ یاد کا جواب، یاد سے ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے بھی، فرشتوں کی جانب سے بھی اور خود حضور ﷺ کی طرف سے بھی اور اسی یاد پر تعلق کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔ یہی وہ ذکر ہے جس سے اعمال کا حسن نکھرتا، لحد عنبریں رہتی اور مغفرت کے ایوان وا ہو جاتے ہیں، درود افضل ترین عمل ہے، ایک ایسا نور ہے جس سے اعمال کی تاریکیاں دُھل جاتی اور دعائیں مستجاب ہوتی ہیں، قبولیتِ دعا کے لیے ''درود'' ایک اچک لے جانے والی بجلی سے بھی زیادہ تیز رفتار ہے، گویا درود ہماری دعاؤں کا محافظ، رضائے الٰہی کا حاصل اور سعادتوں کا سرچشمہ ہے ؎

ہر سانس سے آتی ہو صدا صلِّ علیٰ کی
ہم لاکھ جئیں، اصل میں جینا تو یہی ہے

مقامِ رسالت مآب ﷺ کیا ہے؟ ایک انسان کے تخئیل کی اُڑانیں بھی خصائصِ نبوت اور انوارِ نبوت کا احاطہ نہیں کرسکتیں ؎

اللہ کے سوا کسے معلوم یہ رُموز
وہ ذات میں، صفات میں کتنا عظیم ہے
بہتا ہے وقت اس کے سمندر میں مثلِ خس
وہ ماورائے عہدِ قدیم و جدید ہے
وحدت کی موج موج کا حاصل یہی گہر
ہستی کی آبرو یہی دُرِّ یتیم ہے

مقامِ نبوت پر بحث وتمحیص سے بہتر ہے کہ ہم قرآن کے آئینے میں صرف اپنا چہرہ دیکھیں اور اپنا مقام متعین کرنے کی کوشش کریں گویا اپنے بس میں رہیں۔

انور صابریؔ (۱۸۹۶ء۔۱۹۷۵ء) درج بالا نعتیہ اشعار میں، مقامِ رسالت ﷺ کے بارے میں موجود نزاعی مباحث کو استفہامیہ انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کی اپنی سی سعی کررہے ہیں، حقیقت یہی ہے کہ

لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

بیدلؔ، ہم ایسے بے خبروں ہی کے لیے کہہ گیا ہے کہ ؎

زلافِ حمد و نعت اولیٰ ست برخاکِ ادب خفتن
سجودے می تواں بردن، درودے می تواں گفتن

کاش! ہم اپنی علمی لاعلمی اور عملی بے مائیگی کے اعتراف کے ساتھ ''قصہ مختصر'' کریں اور عقیدت و ارادت کے زعم میں بات نہ بڑھائیں بلکہ اپنی عقیدت کو بینائی عطا کریں کہ اندھی عقیدت، غلو بن کر، ایمان کھو بیٹھتی ہے۔ نعت ایک ایسی توصیف ہے جو مبالغے سے دامن بچاتی اور تاریخی سچائیوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور ایک ایسا ناز ہے جو نیاز کی ادائیں سنبھالے ہوئے ہے۔ نعت ایک ایسا مرکزی نقطہ ہے جس پر دل کی ساری محبت اور نگاہ کی ساری ارادت مرتکز ہو جاتی ہے۔ نعت گوئی ایک ارفع اور نازک مقام ہے۔ ارفع اس لیے کہ جس ذاتِ اقدس ﷺ کی تعریف مالکِ کون و مکاں کرتے ہوں، اس کا حق کیسے ادا ہو سکتا ہے اور نازک اس لیے کہ احتیاط کے تقاضے کڑے ہیں، قلم اور زبان کی ہلکی سی لغزش ایمان کے آبگینے کو ٹھیس پہنچا سکتی ہے۔ عرفیؔ نے کہا تھا ؎

عرفیؔ مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا ست
آہستہ، کہ رہ، بردم تیغ است قدم را

کاش! ہم سمجھیں کہ تلوار کی دھار پر چلنے کے لیے بینائی کے ساتھ ساتھ انتہائی دانائی بھی مطلوب ہے۔

O

بارگاہِ پاک میں پہنچے ثنا کرتے ہوئے
مدعا پایا ہے، عرضِ مدعا کرتے ہوئے
تھام کر دامن کو اُن کے بے محا بارو دیا
میں کہ گھبراتا تھا اُن کا سامنا کرتے ہوئے
التفاتِ سیّدِ سادات کب محدود ہے
وسعتِ دامن بھی دیتے ہیں عطا کرتے ہوئے
بے نیازِ نعمتِ کونین ہوتے گئے
کوچۂ سلطانِ عالم میں صدا کرتے ہوئے

ریاض الجنّۃ کی دلنواز فضاؤں اور رحمت کی جھومتی ہوئی گھٹاؤں میں، درود وسلام کے ہالے میں دل سے اٹھنے والی نواؤں کے رسا ہونے میں نہ کسی نوع کا شک ہے نہ شبہ، جناب حفیظ تائب مرحوم ومغفور کے درجِ بالا اشعار بھی ریاض الجنّۃ میں بالخصوص اور مسجد نبوی میں بالعموم، ذہن کے افق پر لہراتے اور دل کی دنیا کو گرماتے رہے۔ بارگاہ پاک میں توفیق ثنا، عرضِ مدعا کے دوران ہی میں مدعا کامل جانا، روتے روتے اُس دامن کو تھام لینا جو ہر گرتے ہوئے کا سہارا ہے۔ پھر التفاتِ سیّدِ سادات ﷺ کہ.....وسعتِ دامن بھی دیتے ہیں عطا کرتے ہوئے ..... فی الواقع نوازشات کا ایک دل آویز سلسلہ ہے۔ جب حرفِ موزوں کو ہنگامِ موزوں اور مقامِ موزوں

نصیب ہوجائے تو اس کی قبولیت یقینی ہوجایا کرتی ہے ۔

ہے شانِ عودیت، مصروفِ دعا ہونا
منظورِ مشیت تھا، ہر نالہ رسا ہونا

جناب حفیظ تائبؒ میرے مکرم بھی تھے اور محترم بھی۔ عرصہ ہوتا ہے، غریب خانہ پر تشریف لائے، جناب سید فیض الحسن شاہؒ کی ایک تحریر میں یہ شعر کبھی میری نظر سے گزرا تھا ۔

دہد حق عشق احمد ﷺ، بندگانِ چیدۂ خود را
بہ خاصاں می دہد شہ، بادۂ نوشیدۂ خودرا

میں نے تب محترم ڈاکٹر عبدالرؤف ناگی کو یہ شعر سنایا، وہ تڑپ اٹھے، انھوں نے یہ شعر کسی کاتب سے لکھوا کر اور فریم کرا کے، مجھے عطا کیا۔ میں نے وہ فریم محبی حفیظ تائبؒ کو پیش کیا اور کہا کہ آپ اس شعر کے مجھ سے کہیں زیادہ حق دار ہیں، وہ شعر پڑھ کر، آبدیدہ ہوگئے۔ حق یہ ہے کہ وہ اُن خاصانِ بارگاہ میں سے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ خود اپنے محبوب ﷺ کی محبت عطا کرتا اور پھر اس محبت کو شعری اظہار کی توفیق بھی بخشتا ہے۔

میں اُنھی دنوں خواجہ عبدالمنان رازکاشمیریؒ کے نعتیہ دیوان کو ترتیب دے رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں اُسے مرتب نہ کر سکے تھے۔ میں نے محترم حفیظ تائبؒ سے اس نعتیہ مجموعے کے نام کے بارے میں استفسار کیا، تو وہ چند لمحوں کے لیے مراقبے میں چلے گئے اور فرمایا کہ یہ نام تو میں نے اپنے نعتیہ مجموعے کے لیے سوچ رکھا تھا مگر آپ مرحوم دوست کے لیے قبول کر لیں اور وہ نام تھا ''لوح بھی تو، قلم بھی تو'' ۔

نقش گزرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پر کیا کیا
مُڑ کے دیکھوں تو نظر آتے ہیں منظر کیا کیا

سچی بات یہ ہے کہ اُس عہد ساز ثنا خوانِ رسول پاک ﷺ کی محبت، اِس فقیر کی حیاتِ مستعار کا ایک قیمتی سرمایہ ہے اور اُس کی آرزو ہے کہ روزِ حشر، اُسے اس عظیم محبِّ رسول ﷺ کے خنک سائے میں جگہ نصیب ہوجائے، پھر ۔

خوشبوؤں کے دائروں کا عکس لے کر
زندگی، رنگوں کے ساحل پر کھڑی ہو

حفیظ تائبؒ، ۱۴ فروری ۱۹۳۱ء کو احمد نگر ضلع گوجرانوالا میں پیدا ہوئے اور ۲۰۰۴ء میں مالک

حقیقی سے جا ملے اور لاہور میں مدفون ہوئے، انھیں احمد نگر سے اپنے آبائی تعلق پر بجا طور پر فخر ہے، اُن کی ایک نعت کے چند شعر دیکھیے ؎

خوش ہوں کہ میری خاک ہی احمد نگر کی ہے
مجھ پر نظر ازل سے شہ ﷺ بحر و بر کی ہے
تابش مری نظر میں ہے اس رہگزار کی
جس پر نثار جلوہ فشانی قمر کی ہے
لب پر ہے بات خلقِ رسول ﷺ کریم کی
آمد ریاضِ جاں میں نسیم سحر کی ہے
شاید کیا ہے یاد مجھے پھر حضور ﷺ نے
پھر کیفیت عجیب مری چشمِ تر کی ہے
یادِ نبی ﷺ ہو منزلِ عقبیٰ میں ساتھ ساتھ
میری بس ایک یافت یہی عمر بھر کی ہے

اُن کے برادر عزیز، محترم عبدالمجید منہاس کی کوششوں سے ''کلیاتِ حفیظ تائب'' چھپ چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے کہ وہ ہر سال اُن کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔ یوں وہ احباب کو بہلاتے بھی رہتے ہیں اور تڑپاتے بھی..... ''آدمی مرحوم ہو جایا کرتے ہیں مگر یادیں کبھی مرحوم نہیں ہوتیں۔'' ؎

تمہاری یاد ہے میری کتابِ غم کا دیباچہ
خدا رکھے، یہی ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا ہے

O

☆

خوشبو ہے دوعالم میں تری اے گُلِ چیدہ
کس منہ سے بیاں ہوں ترے اوصافِ حمیدہ

(حفیظ تائبؒ)

O

عجب روحِ دو عالم کی محبت کا نشاں نکلا
مرا اشکِ تمنا، داستاں در داستاں نکلا
مواجہہَ پر ہوئی بارانِ رحمت اس کے صدقے میں
بڑے ہی کام کا سرمایۂ سوزِ نہاں نکلا
دیارِ پاک کی جانب سفر، معراج تھی اپنی
وہ منزل آسماں نکلی، وہ رستہ کہکشاں نکلا
نہیں ہے قید حرف وصوت کی اس آستانے پر
مری حیراں نگاہی میں بھی اک طرزِ بیاں نکلا
مرے افکار کو نسبت ہے اِس ذاتِ گرامی ﷺ سے
مرا ہر لفظ دردِ آرزو کا ترجماں نکلا

O

اُن کے سنگِ آستاں تک آ گئے
ہم زمیں سے آسماں تک آ گئے

بات خود ہی داستاں بنتی گئی
اَشک خود شرحِ بیاں تک آ گئے

O

درج بالا نعتیہ اشعار جناب حافظ لدھیانوی (۱۹۲۰ء۔۱۹۹۹ء) کے ہیں، وہ کہا کرتے تھے کہ ''میں جب بھی مواجہہ شریف پر حاضری دیتا ہوں تو التفاتِ سید سادات ﷺ، نعت کا ایک دیوان میری جھولی میں ڈال دیتا ہے۔'' یاد رہے کہ اُن کے نعتیہ دیوان بیس سے زیادہ ہیں۔ میں نے کہیں لکھا تھا کہ نعت کے سلسلے میں قلم بعد میں اُٹھتا ہے اور منظوری پہلے ہو جایا کرتی ہے۔ ورنہ کتنے ہی معجز بیان ہیں کہ شعر و ادب کی قابلِ تقلید صلاحیتوں اور فکر و خیال کی قابلِ تحسین رفعتوں کے باوصف، نعت گوئی کی فضیلت سے محروم رہتے ہیں اور خیال کی بے نام وادیوں میں بھٹکتے بھٹکتے ان کی عمر کا پیمانہ بھر جاتا ہے۔

خورشید احمد گیلانی کے الفاظ میں ''شعر کی جان اگر عمدہ تخیُّل ہے تو اس صنفِ شاعری کے کیا کہنے جس کا مرکزی خیال ذاتِ نبی ﷺ ہو، خوبصورت تمثیل سے اگر شعر کا چہرہ نکھرتا ہے تو سیرتِ مصطفیٰ ﷺ سے بہتر حسین مثال کیا ہو سکتی ہے؟ لفظ کا لباس اگر شعری پیکر کو جاذبِ نگاہ بناتا ہے تو لفظ و حرف کی قبا کو راست آنے کے لیے قامتِ رسول ﷺ سے زیادہ موزوں اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟ اگر نفیس پیرایہ شعر کی آبرو بنتا ہے تو حضور ﷺ کے سراپا سے زیادہ نفیس کون سا پیرایہ تخلیق ہوا ہے؟ اگر دل نشین ابلاغ شعر کو پَر لگا دیتا ہے تو ابلاغ کے لیے سیدِ عالم ﷺ کے وصف سے زیادہ کون سا شاندار موضوع ہو سکتا ہے؟''

حافظ لدھیانوی کے یہ اشعار مسجدِ مصطفیٰ ﷺ، ریاض الجنۃ اور قدمین شریفین کی جانب واقع ستون کے پاس اکثر میری بے کیفیوں کو کیف عطا کرتے رہے۔ کسی کے اشعار کا ان مقدس مقامات پر یاد آ جانا، اشعار کے مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر کی بلندیٔ درجات کی بھی ایک واضح دلیل ہے ورنہ اس بارانِ نور میں تو انسان خود کو بھول جاتا ہے ؎

کیا کہہ سکیں کہ کہنے کی طاقت ہی چھن گئی
ہوش و حواس کھو گئے سب ان کے سامنے

کس کس طرح سے دید کی دل میں تھی آرزو
آنکھیں ہی بند ہوگئیں اب ان کے سامنے

حافظ لدھیانوی مرحوم کا یہ مصرع، مرا اشکِ تمنا داستاں درداستاں نکلا
اور..... اشک خود شرح بیاں تک آ گئے

واقعی آنسو، ترجمانِ دلِ بے قرار ہے اور وہ جو کچھ کہہ جاتا ہے کوئی سالفظی پیرایہ بھی وہ کچھ نہیں کہہ سکتا.....اور

''آنسو کیا ہیں؟ بس موتی ہیں، چمکنے والے، بہنے والے، گرم، آنسو انسان کی فریاد ہیں۔ پرانی یادوں کے ترجمان ہیں۔ یہ آنسو انمول خزانہ ہیں، یہ خزانہ کمزور کی قوت ہے، دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلنے والا آب حیات کا چشمہ، سعادتوں کا سرچشمہ، آرزوؤں کے صحرا میں نخلستانوں کا مژدہ، آنسو تنہائیوں کا ساتھی، دعاؤں کی قبولیت کی نوید، انسان کے پاس ایسی متاعِ بے بہا ہے جو اُسے دیدہ وری کی منزل عطا کرتی ہے۔ یہ موتی بڑے انمول ہیں، یہ خزانہ بڑا گرانمایہ ہے، یہ تحفہ، فطرت کا نادر عطیہ ہے، تقربِ الٰہی کے راستوں پر چراغاں کرنے والے موتی انسان کے آنسو ہیں۔''

O

☆

آنکھوں کے جھرنے تنگ تھے طوفان کے لیے
آنسو جو سر پھرے تھے، مساموں سے بہہ گئے

(جان کاشمیری)

O

حضور ﷺ عجزِ بیاں کو بیاں سمجھ لیجے
تہی ہے دامنِ فن، آستاں پہ کیا لاؤں

خانہ کعبہ میں انسان اپنے رب کے حضور میں روتا بھی ہے اور تڑپتا بھی، چیختا بھی ہے اور چلاّتا بھی، گھومتا بھی ہے اور جھومتا بھی۔ مگر اس کے بعد جب وہ اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوتا ہے تو پہلی شرط یہی ہوتی ہے کہ وہاں ویسے ہی حاضری ہو جیسے صحابہؓ حضور ﷺ کی زندگی میں دیا کرتے تھے۔ یہ تقاضے اس قدر کڑے اور نازک ہیں کہ زائر درگاہِ نبی کو ہر قدم اور ہر نفس، خدشہ رہتا ہے کہ کہیں احترام کے آبگینے کو ٹھیس نہ لگ جائے کہ جس کا بظاہر احساس ہی نہ ہو، اور بے شعوری میں سب سے بڑی دولت ہی سلب ہو کر نہ رہ جائے، جس کا نام ایمان ہے۔ مواجہہ شریف پر مرقوم قرآنِ پاک کی آیتِ شریفہ بھی یہی احساس دلاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے گھر میں کی جانے والی غلطیوں کو تو پیہم معاف کرتے ہی رہتے ہیں مگر گنبد خضرا کے روبرو ہو جانے والی کسی لغزش کے لیے اُسی بارگاہ سے رجوع کرنے کی تلقین کرتے ہیں، جن کی دعائیں، جن کا استغفار اور جن کی رحمت، مضطرب اور پریشان دلوں کے لیے وجہِ سکون ہے۔ آپ ﷺ کی رحمت ہی کی بنا پر دنیا و آخرت کی سعادتیں، دنیا والوں کے لیے وقف ہیں۔ یہ آپ ﷺ کی رحمت ہے کہ امتِ مسلمہ مکمل نوعیت کی تباہی سے محفوظ ہے۔ مشرکین تک کے لیے بد دعا نہ کرنا بھی آپ ﷺ ہی کی رحمت کی خصوصیت ہے۔ آپ ﷺ ہی کا فرمان ہے ''میں رحمت مجسم بن کر آیا ہوں جو اللہ کی طرف سے اہل جہان کے لیے ایک ہدیہ ہے۔'' آپ ﷺ کو قرآنِ پاک نے رؤف و رحیم قرار دیا۔ سو آپ ﷺ ہی کی رحمۃ للعالمینی ہم عاصیوں کی واحد آس ہے۔ آپ ﷺ کے احسانات بیان کرنے سے زبان قاصر اور آپ ﷺ کی رحمتوں کے اعتراف کے لیے الفاظ عاجز ہیں۔ اس لیے اس بارگاہِ

ناز میں سکوت کے سانچے میں ڈھلا ہوا درودِ پاک ہی تکلّمِ بلیغ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس بارگاہِ ادب واحترام میں حاضری سے قبل دل میں چاہتوں کا ایک سیلِ بے پناہ ہوتا ہے مگر بوقت حاضری لفظ، جذبات بننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ہر پیرایۂ فن تشنہ اور ہر طرزِ سخن مبہم رہتا ہے کہ ؎

مرے دردِ نہاں کا حال محتاجِ بیاں کیوں ہو
جو لفظوں کا ہو مجموعہ وہ میری داستاں کیوں ہو

عالمِ فراق میں، کئی کئی نعتیہ مجموعوں کے خالق، جب اس بارگاہِ حسن میں پہنچتے ہیں تو بہت کچھ کہہ سکنے کے باوجود کچھ بھی نہیں کہہ پاتے کہ ؎

کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیا کرتے ہیں لوگ
خامشی بھی ایک طرزِ گفتگو ہے دوستو

اور ؎

ڈوبا ہوا سکوت میں ہے جوشِ آرزو
اب تو یہی زباں مرے مدعا کی ہے

کہ حضور ﷺ عجزِ بیاں کو بیاں سمجھ لیجے۔ یہاں اگر کچھ بات بنتی ہے تو صرف آنسوؤں کی چاندنی میں، درود وسلام کے نغموں سے، کہ یہی نغمے دل کی تڑپ کو سکون، اضطراب کو طمانیت اور تپش کو ٹھنڈک کا وہ احساس عطا کرتے ہیں کہ خود اس کیفیت کو بیان کرنے سے لفظ عاجز اور معجز بیان قاصر ہیں۔ حق یہ ہے کہ دیارِ خدا اور رسول ﷺ میں حاضری مقدور کی نہیں، مقدر کی بات ہے۔ نصیب جاگ جائے تو چپ ہو جانا ہی بہترین اظہارِ تشکر ہے۔ آنکھوں کو بند کر کے، انسان کو من میں ڈوبنے کی توفیق مل جائے تو مدّ ہم سے مدّ ہم نقش بھی اُجاگر ہو جایا کرتا ہے۔ خاموشی ہی سے انسان کو دل کے آئینے میں ذات اور کائنات کو دیکھنے کی سعادت ملتی ہے۔ خاموشی، خود شناسی سے خدا شناسی تک کا ایک دلنواز سفر ہے۔ یہی وہ تجربہ ہے جو انسان کو حجابات کی دنیا سے نکال کر محرمِ راز بنا دیتا ہے ؎

تم کو آنکھیں تو مشیّت نے عنایت کر دیں
قاسمِ نور سے تم دیدۂ بینا مانگو

اور کیا بعید ہے کہ الطافِ حق کے اس عظیم وجلیل قاسم کی برکت سے مولا کریم ہمارے دل کو سوز، روح کو لرزش، آنکھ کو موتی، قلم کو نور اور نوا کو گداز عطا کر دیں۔

O

طوفانِ زندگی کا سہارا تمھی تو ہو
دریائے معرفت کا کنارا تمھی تو ہو
تمھی تو ہو دل عالم کے دلنواز
دلدار و دل نشین و دل آرا تمھی تو ہو
جاتی ہے عرشؔ پر یہ تمھارے ہی فیض سے
میری دعائے دل کا سہارا تمھی تو ہو

یہ تین شعر پنڈت بال مکند عرشؔ ملسیانی (۱۹۰۸ء۔۱۹۷۹ء) کے ہیں جو اُن کے مختصر مگر خوبصورت مجموعۂ نعت ''آہنگِ حجاز'' (مطبوعہ ۱۹۵۳ء) کی ایک نعت سے ماخوذ ہیں اور میرے ذہن میں محفوظ۔ 'آہنگِ حجاز' کا دیباچہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا تھا۔ یہ نعتیہ مجموعہ ۱۹۵۴ء کے لگ بھگ جناب احسان صابری مرحوم نے بھارت سے لاکر، والدِ مرحوم کو دیا تھا۔ پوری کتاب آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی تھی۔ میں ان نعتوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے اس نعتیہ مجموعے پر ایک مضمون لکھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس مضمون کے بارے میں ایک فاضل پروفیسر نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ اگر اس ہندو کو نبی پاک ﷺ سے اتنی ہی محبت ہے تو وہ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا؟ میں اس سوال کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے صرف یہ کہا کہ غیر مسلم جب حضرت محمد ﷺ کی بہر نوع مکمل شخصیت کو دیکھتے ہیں تو بے ساختہ تعریف پر مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ جب حضرت عبدالمطلب نے

اپنے پوتے کا نام ''محمد'' رکھا تو اس نام کے بارے میں لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا تو دادا نے جواب دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ اس بچے کی تعریف ساری دنیا کرے۔ حقیقت میں محمد، محمد بنتے ہی تب ہیں جب اُن کی تعریف غیر مسلم کریں۔ ہمارا تعریف کرنا تو ہمارا ایک دینی اخلاق ہے۔ میں نے فاضل پروفیسر سے کہا کہ نبیٔ کریم ﷺ کی تعریف تو کرنا ہی پڑتی ہے جو محض نام لیتا ہے وہ بھی تعریف ہی کر رہا ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کے غیر مسلم نعت گو، مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ جب ہم مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو اسلام لانے کے ارادے کو ملتوی کر دیتے ہیں کہ ؎

یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

اللہ تعالیٰ ہمیں سچے مسلمان بننے کی توفیق دیں تا کہ ہمارے کردار کا حسن خوشبو بن کر گردو پیش کو مہکا سکے کہ خوشبو کو کسی اعلان اور اشتہار کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ خود بولتی ہے ؎

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خوشبو کی طرح اُڑ کے ترے دل میں اُتر جائے

کاش! ہمارے دل میں نبیٔ پاک ﷺ کی سچی محبت ہو، محبت اور محبوب دونوں دل میں ہوں اور ہم معاملاتِ حیات میں ان کی سیرت کو مشعلِ راہ بنائیں کہ قرآن پاک نے انھیں ''سراجِ منیر'' سے تعبیر کیا ہے۔ غیروں کی نقالی چھوڑیں، ایک الوہی اور مکمل ضابطے کے ہوتے ہوئے کسی اور انسانی قانون کی ضرورت باقی نہیں رہتی، حدیثِ پاک ہے کہ تم جس قوم کے طور طریقے اپنا لو گے وہی تم پر مسلط ہو جائے گی۔

درج بالا اشعار بھی مدینے کی پاکیزہ فضاؤں میں یاد آتے رہے اور کیوں نہ یاد آتے کہ جب آلامِ روزگار طوفان بن کر زندگی کا احاطہ کر لیتے ہیں اور انسان جینے کے ہاتھوں مر رہا ہوتا ہے تب نبیٔ پاک ﷺ کی ذات ایک عظیم سہارا بنتی ہے کہ آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ جانے والی انسانیت کو آگ سے بچانا اور جنت کی بہاروں تک لے جانا بفضلہٖ ان کا منصب ہے۔ وہ علم و عرفان کا بحرِ زخار ہیں۔ وہ دل دار بھی ہیں، دلنواز بھی۔ دل نشیں بھی اور دل آرا بھی۔ آخری شعر میں تخلص کے بامعنی استعمال سے ایک لطف پیدا ہو گیا ہے۔ کاش! ہم مسلمان دل کی گہرائیوں سے نبیٔ پاک ﷺ کو طوفانِ زندگی کا سہارا مانیں اور دعائے دل کی قبولیت کا ایک مستند ذریعہ سمجھیں..... اور عملی اعتبار سے اسلام کی سچائی اور رعنائی سے دنیا کو متاثر کریں تا کہ اغیار پیغمبرِ اسلام ﷺ کی تعریف کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی تعریف پر بھی مجبور ہو جائیں اور ہمارے کردار و

اعمال کے حسن کو دیکھ کر مائل بہ اسلام ہوں کیونکہ انگیٹھی اس وقت تک کمرے کو گرم نہیں کرتی جب تک وہ خود انگارا نہیں بنتی۔

تجھ کو اے دل، خود تڑپنا بھی ہے تڑپانا بھی ہے
آگ بننا ہی نہیں ہے آگ برسانا بھی ہے
صرف سننا ہی نہیں تجھ کو پیامِ دلبری
بلکہ اس پیغام کو عالم میں پھیلانا بھی ہے
خود سراپا نور بن جانے سے کب چلتا ہے کام
تجھ کو اس ظلمت کدے میں نور برسانا بھی ہے

O

☆

ہے یہی نام تو میری شب یلدا کی سحر
جسم و جاں میں جو چراغاں ہے اِسی نام سے ہے
(صبیح رحمانی)

O

تو اے مولائے یثرب ﷺ! آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زُنّاری

اقبالؒ بظاہر بات اپنی کر رہے ہوتے ہیں مگر وہ ذات کے ساتھ کائنات لے کر چلتے ہیں اور

جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

یہ دنیا ابھی اللہ والوں سے خالی نہیں ہوئی۔ ابھی نیتوں میں قدرے خلوص، اعمال میں کچھ صالحیت اور ایمان میں زندگی کی رمق موجود ہے کہ بہت کچھ ہو چکنے کے بعد بھی، ابھی تک قیامت نہیں آئی۔ سچی بات یہ ہے کہ کائنات، انسان کی شانِ عبودیت کا اظہار بھی ہے اور اعتراف بھی، غور کیجیے تو قدم قدم، مظاہر پرستی کی جڑ کٹتی اور خدا پرستی کی بنیاد پڑتی ہے کہ ہر مظہر فنا پذیر ہے۔ ہر شے اپنے اپنے طور پر خالقِ کائنات کے حضور میں سرنگوں اور اس کی شان میں غزل خواں ہے مگر اس خمیدگی کو زندگی اور اس بندگی کو پایندگی انسان نے دی ہے بلکہ مسلمان نے دی ہے۔ حضور ﷺ نے جنگِ بدر سے قبل اسی لیے فرمایا تھا کہ ''اگر آج یہ مٹھی بھر مسلمان مارے گئے تو اے اللہ! تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔'' گویا جب تک زبان حمد کے ترانے گاتی رہے گی، اس وقت تک کائنات قائم رہے گی اور جب نطقِ انسانی سے اُبھرنے والی حمد و ثنا پر چپ لگ جائے گی اور جب جبینیں سجدوں کے نور سے محروم ہو جائیں گی، تب کائنات بھی اپنے وجود کا مفہوم کھو دے گی اور اس کا قیام اور نظام دونوں بے مقصد ہو کر رہ جائیں گے ؎

دفعتاً سازِ دوعالم بے صدا ہو جائے گا
کہتے کہتے رُک گئے جس دن ترا افسانہ ہم

جہاں تک ہماری اکثریت کا تعلق ہے۔ اس کی دانش افرنگی اور ایمان زُنّاری ہے۔ ہم نے تباہ ہونے والی قوموں کی سبھی علامتیں، حسن سمجھ کر قبول کر لی ہیں۔ آج مغرب کی اندھا دُھند تقلید کو روشن خیالی کا نام دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ اسلام سے زیادہ روشن خیال ضابطۂ حیات کوئی اور نہیں ہے اور مومن سے زیادہ روشن خیال کوئی ہو نہیں سکتا کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ سچے متبعین کو ظلمت سے نور کی طرف لاتا ہے۔ نام نہاد مسلمان ہونے کا احساس مواجہہ شریف کے سامنے شدید تر ہو جاتا ہے، دل کی سیاہیاں، فکر کی کجرویاں اور نظر کی بدکاریاں، اُبھر اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ ان کی ایک نگہِ لطف، عمر بھر کی سیاہیوں کو اُجال کر رکھ دے گی۔ ہمارا ایمان ہے کہ یہی وہ آفتاب ہے جس کی ایک کرن، گفتار، رفتار اور کردار کا رُخ بدلنے کے لیے کافی ہے۔ یہی وہ چارہ ساز ہیں جن کا ہلکا سا التفات دل کی ہر بیماری کے لیے پیامِ شفا ہے اور انھی کی چارہ سازی ہمارے زخموں کا واحد مرہم ہے ؎

مجھ کو طلب کیا گیا، سرکار، آ گیا
شرمِ گنہ لیے، یہ گنہگار، آ گیا
پھیلا کے اپنا دامنِ صد چاک اے حضورﷺ!
درویشِ بے نوا، سرِ دربار آ گیا
سکّے جراحتوں کے لیے، غم کے شہر سے
آقا! تری عطا کا خریدار آ گیا

مدینے میں پہنچنے کا حقیقی مقصد، مدینے والےﷺ کی ہدایات پر حقیقی عمل ہے۔ اُن کی چارہ سازی یہی ہے کہ اُن کے بتائے ہوئے نسخے پر عمل کیا جائے، اور وہ نسخہ وہی ہے جو مدینے والےﷺ نے اپنے آخری حج کے خطبے میں بتا دیا تھا کہ قرآن اور میری سنت کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ یہی علاج ہے تمھاری ہر علالت کا، سچی بات یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے جسم کو جکڑ رکھا ہو یا دل کو گھن لگا دیا ہو یا زمانے کی گردشوں نے چکرا رکھا ہو۔ ایسے میں نبیٔ پاکﷺ کی ذات ہی ایک عظیم سہارا ہے، آپﷺ کی سنت ہی ایک عظیم مشعل ہے اور آپﷺ کا لایا ہوا ضابطۂ حیات ہی ایک عظیم رہنما ہے، دنیاوی زندگی میں بھی اور اُخروی زندگی میں بھی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ قصیدہ ہمزیہ میں کہتے ہیں:

''اے اللہ کے رسولﷺ، اے تمام خلق سے بہتر، قیامت کے دن میں آپ کی عطاو

بخشش چاہتا ہوں، جس کو کوئی سخت مشکل پیش آئے تو حضورﷺ ہی ہر بلا کے بچاؤ کے لیے قلعہ ہیں۔ حضورﷺ ہی کی طرف میری توجہ ہے اور حضورﷺ ہی میرا سہارا ہیں اور آپﷺ ہی سے بھلائی کی طمع اور اُمید ہے۔''

منور بدایونی کہتے ہیں ؎

ہر دل کی تسلی بھی ہے، ہر غم کی دوا بھی
کیا چیز ہے مولا، تری خاکِ کفِ پا بھی
ہونے کو تو ہو گی دلِ مضطر کی دوا بھی
اِکسیر ہے لیکن ترے دامن کی ہوا بھی

O

☆

میں درد کے تپتے ہوئے صحرا میں کھڑا ہوں
وہ ابرِ کرم، روحِ جہاں، جانِ تمنا

(محمد احمد اریب)

O

اے ظہورِ تو، شبابِ زندگی
جلوہ ات، تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمیں از بارگاہت ارجمند
آسماں از بوسۂ بامت بلند
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش
تا بیاساید دلِ بے تابِ من
بستگی پیدا کند سیمابِ من
بافلک گویم کہ آرامم نگر
دیدہ ای آغازم، انجامم نگر

اقبالؒ نے اسرار و رموز، میں ایک طویل نظم ''عرض حال بحضور رحمۃ للعالمین ﷺ''، کے عنوان سے لکھی ہے، جس میں نعت کا ایک دلنواز انداز بھی ہے اور دل کی تمناؤں کا ملتجیانہ اظہار بھی۔ نعت جس رنگ اور آہنگ سے ہو، جس زبان اور جس ہیئت میں ہو، میں اُسے درود و سلام ہی کا ایک شعری اسلوب سمجھتا ہوں۔ ''نعت تخئیل کے نازک آبگینے، محبت کے بے بہا خزینے، حرف و لفظ کے رواں دواں سفینے اور اظہار و بیان کے خوبصورت قرینے کا دوسرا نام ہے۔'' یوں شاعر

بیاباں بیاباں بھٹکنے اور سر ٹکرانے کے بجائے ایک ایسی شاہراہ پر آ جاتا ہے جہاں نظر نظر پھول مہکتے اور قلم قلم سچائیاں لو دیتی ہیں.....ایک ایسی شاہراہ جو بندے کو خالق سے بھی ملاتی ہے اور بندے کو بندے سے بھی۔ جس سے یہ دنیا بھی سنورتی ہے اور دوسری دنیا بھی نکھرتی ہے۔ غزل گو شاعر جب نعت کہتا ہے تو اُسے یوں لگتا ہے جیسے وہ بیاباں سے وادیٔ گل و لالہ میں آ گیا ہو۔ نعت، غزل کو 'باوضو' بنا دیتی ہے اور ہولے ہولے شاعر خود بھی 'باوضو' ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ کی شاعری نے تو راستہ ہی وہ چنا جس کی طرف قرآنِ پاک راہنمائی کرتا ہے۔ محبت کے لیے محبوب بھی وہ انتخاب کیا جس سے خود خالق محبت کرتا ہے۔

مذکورہ بالا طویل نعتیہ نظم کے درج بالا پانچ شعر بھی اکثر یاد آئے۔ پہلے دو شعر نعتیہ ہیں کہ آپ ﷺ کے ظہور نے ہماری پژمردہ حیات کو شگفتگی اور ہمارے افسردہ جذبوں کو جنوں کا والہانہ پن عطا کیا ہے۔ آپ ﷺ تشریف نہ لاتے تو ہماری زندگی سراپا شرمندگی ہوتی، اقبالؔ کے نزدیک زمین اس لیے ارجمند ہے کہ وہاں حضور ﷺ کی بارگاہ ہے اور آسمان اس لیے بلند و بالا ہے کہ اس نے گنبدِ خضرا کو بوسہ دے رکھا ہے۔ اس شعری توصیف کے بعد اقبالؔ آرزو کرتے ہیں کہ اُنھیں دلِ زندہ نصیب ہو۔ بصارت، بصیرت سے نور افروز ہو کہ اصل زندگی، دل ہی کی زندگی ہے اور پھر ایک حسین آرزو کہ قبر کے لیے جگہ سایۂ دیوار میں عطا ہوتا کہ عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ جائے اور وہ آسمان سے کہیں کہ ؎

بیا بہ خاکِ من و آرمیدنم بنگر

اور اقبالؔ کو قبر کے لیے جگہ بھی ملی تو کہاں؟ شاہی مسجد کے سائے میں.....،

اسی نظم میں اقبالؒ اپنے بارے میں کہتے ہیں ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پاکن مرا

''اس دعا و خواہش کے باوجود جس میں اقرار و اظہار کی روح موجود ہے۔ اگر دبستانِ اقبال کا کوئی عبقری، ادب کے نگار خانے کا کوئی نابغہ اور سرکاری توشہ خانے کا کوئی دانشور، اقبالؔ کے

افکار کو یورپی علم وفلسفہ کے دسترخوان پر لے جاتا ہے اور اس کو اصرار ہے کہ اقبالؔ نے اپنے فن و حکمت اور اسلامی اصطلاح میں دعوت وتذکیر کے لیے قرآن وسنت سے باہر مستعار خیالات پر انحصار کیا ہے یا اس کی کوئی سی بات جو اس کے ہاں بنیاد کا درجہ رکھتی ہے، قرآن وسنت کی نفی پر ہے یا اس معاملے میں اس نے اجتہاد کر کے مغربی فکر کا سانچا تسلیم کیا ہے تو اس کا جواب خود کلام اقبال ہی سے دیا جا سکتا ہے۔ ان افرنگ زدہ لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

ترا وجود سراپا تجلیٔ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی، خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر'' (۱۸)

O

☆

جگر خراش بہت اپنی داستاں ہے حضورﷺ
بیانِ درد بھی ناقابلِ بیاں ہے حضورﷺ
(انور صابری)

O

دونوں جہاں کے قبلہ و کعبہ تمھی تو ہو
ہر عہد، ہر صدی کا تقاضا تمھی تو ہو
جس سے مہک رہا ہے جہانِ دل و نظر
باغِ ازل کے وہ گلِ تازہ تمھی تو ہو
سب بے جواز ہیں مرے سینے کی دھڑکنیں
دراصل زندگی کا حوالہ تمھی تو ہو
کب سے محیط ہے مرے دن پہ یہ تیرگی
شہرِ غبارِ شب کا سویرا تمھی تو ہو
گردن جھکی ہوئی ہے گناہوں کے بوجھ سے
جُود و کرم کا سرمدی دریا تمھی تو ہو

آپ ﷺ کی سنّت مطہرہ، ہر شخص اور ہر دور کے لیے ایک خوبصورت، حسین، مکمل اور قابل تقلید نمونہ ہے۔ آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب، ازل کے مصور کا وہ نقشِ قلم ہے جو ابد آثار ہے۔ آپ ﷺ کو مکمل شخصیت کے ساتھ مکمل صفات بھی عطا کی گئی ہیں۔ یہ کہنا بھی بجا ہے کہ

آپ ﷺ کی وجہ سے صفات کو معراج نصیب ہوئی۔ ذات وصفات کی اسی معراج کا نتیجہ ہے کہ ہم آپ ﷺ کی ہر بات کو بلاتحقیق سچ جانتے اور مانتے ہیں اور سچ کے بارے میں کسی نوع کی سوچ ہی تشکیک کا پیش خیمہ ہے۔ سب سے بڑی بات، کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے ایک ان دیکھی ذات ہے مگر ہم نے اُسے دل کی گہرائیوں سے مانا اور خود کو اس کے حضور میں جھکا دیا صرف اس ذاتِ گرامی قدر ﷺ کے کہنے سے کہ وہ زبانِ پاک کھلتی ہیں صداقتوں کے لیے تھی۔ نبی، پیدا ہی نبی ہوتا ہے گو اعلانِ نبوت پختگی کی عمر میں ہُوا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی صداقتِ گفتار اور نزہتِ کردار، قبل نبوت بھی مسلّمہ تھی۔ آپ ﷺ نے اپنے اخلاق کے اسی حسن کو دلیلِ نبوت بنایا تھا کہ جو شخص مخلوقات کے بارے میں جھوٹ نہیں بولتا وہ خالق کے بارے میں کب دروغ گوئی سے کام لے گا؟ اللہ تعالیٰ نے ہر حسن آپ ﷺ کی ذات میں جمع فرما دیا۔ عبادات سے لے کر معاملات تک، ہر جمال آپ ﷺ کی ذاتِ پاک میں منتہائے کمال پر نظر آتا ہے۔ ہمہ صفت موصوف ......حسن آپ کی صفت اور صفت آپ کا حسن۔ گویا آپ ﷺ بہر اعتبار معتبر ہیں، حسنِ کائنات بھی اور کائناتِ حسن بھی۔ قاضی محمد سلیمان منصوری پوریؒ اپنی ایک مختصر مگر جامع کتاب مہرِ نبوت، میں لکھتے ہیں کہ:

''آنحضرت ﷺ شاہد خلق ہیں، حکم ماننے والوں کو خوشخبری سناتے اور نافرمانوں کو ڈراتے ہیں، انجانوں کی پناہ، اللہ کے بندے اور رسول، سب کام کو اللہ پر چھوڑ دینے والے، نہ عادت کے سخت اور نہ بول چال میں کرخت، اُن کی تعلیم اندھوں کو آنکھیں، بہروں کو کان دیتی ہے اور غافل دلوں سے پردہ اُٹھاتی ہے۔ ہر ایک خوبی سے آراستہ، ہر ایک خلقِ کریم سے عطا یافتہ، سکینہ ان کا لباس ہے، نکوئی ان کا شعار ہے، اُن کا ضمیر تقویٰ ہے۔ ان کا کلام حکمت ہے، صدق وصفا ان کی طبیعت ہے، عفو واحسان ان کی عادت ہے، عدل ان کی سیرت ہے، سچائی ان کی شریعت ہے اور ہدایت ان کی راہ نما ہے۔ ملت ان کی اسلام ہے اور احمد ﷺ ان کا نام ہے۔''

ریاض حسینؔ چودھری ایک خوش فکر اور خوش ادا نعت گو ہیں۔ ان کے درج بالا اشعار قاری کو فکر کی بالیدگی بھی عطا کرتے ہیں اور اظہار کی تازگی کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ جود و کرم کا سرمدی دریا اور شہرِ غبارِ شب کا سویرا، ایسی خوبصورت تراکیب سے ذوقِ سلیم مدتوں مسحورِ لذت رہ سکتا ہے۔ مولا کریم انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور اُن کے اشعار سے دل بہلانے والے اس عاجز

انسان کو بھی متاعِ خیر کی تابندگی عطا ہو کہ وہ بھی شاعر کا ہم نوا ہے اور اِن روح پرور فضاؤں میں آرزوؤں کے گھروندے بنا رہا ہے۔

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی کے الفاظ میں:

''مجھے تو ریاض حسین چودھری کا پورا وجود مصروف نعت گوئی نظر آتا ہے۔ اُن کا تخیّل اور مشاہدہ ہر جلوۂ رنگ و نور میں نبیٔ اکرم ﷺ کے خدوخال کو تلاش کر لیتا ہے۔ اُن کے ہاں الفاظ اور ترکیبیں رقص کرتی اور دف بجاتی نظر آتی ہیں، اُن کا شعورِ نغمہ ایک غیر ارضی استعارہ ہے۔''

O

☆

اِس سے غرض نہیں کہ مرا آشیاں رہے
یہ بھی نہیں، چمن میں مری داستاں رہے
اتنی سی التجا ہے مگر ربِّ ذوالجلال
اقلیم نعت میں مرا نام و نشاں رہے

(ریاض حسین چودھری)

O

یہ قاسمِ نعمت ہیں جو مانگوں گا ملے گا
ہوتے ہیں خزانے یہیں تقسیم خدا کے

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیٔ پاک ﷺ کو کن کن نعمتوں سے نوازا اور کتنا نوازا، نہ ہم اس کا اندازہ کر سکتے ہیں اور نہ یہ ہمارا منصب ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انبیائے سابق کو جو مانگنے کے بعد ملا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بے طلب عطا فرمایا کہ آپ ﷺ راضی ہو جائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قیامت کے دن رسوا نہ ہونے کی التجا کی (شعراء۔۸۷) آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے یقین دہانی کرا دی کہ اللہ تعالیٰ اس دن نبی اور اس کے ساتھ مومنین کو رسوا نہیں کرے گا۔ (تحریم۔۸) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے اور بیٹوں کے لیے بتوں کی عبادت سے بچنے کی دعا کی۔ (ابراہیم۔ ۳۵) اور حضور ﷺ کے اہل بیت کو اللہ تعالیٰ نے از خود مطہر بنا دیا۔ (احزاب۔۳۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قیامت تک کے لیے اپنے ذکرِ جمیل کے قیام کی التماس کی۔ (شعراء۔۸۴) دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے نبیٔ کریم ﷺ کے ذکر کو خود ہی رفعت عطا کر دی۔ (الم نشرح۔۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جنت نعیم کی وراثت کے لیے دعا کی۔ (شعرا۔۸۵) اور نبیٔ پاک ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کوثر عطا کیا۔ (کوثر۔۱) کوثر جنت کی ایک عظیم نہر کا نام ہے اور وہ حوض بھی مراد ہے جس کے ساقی حضور ﷺ خود ہوں گے اور اپنے امتیوں کو اپنے دستِ مبارک سے پانی پلائیں گے اور یاد رہے کہ اس حوض میں پانی، جنت کی اُسی نہر سے آ رہا ہوگا۔ اس سلسلے میں حضرت نفیس الحسینیؒ کی ایک حسین آرزو قلم کی نوک پر آنے کے لیے مچل رہی ہے ۔

ہو نصیب جامِ کوثر، یہ نفیسؔ کی دعا ہے
مگر اک حسیں تمنا، کہ حضور ﷺ خود پلائیں

ابن کثیر نے 'کوثر' کو خیرِ کثیر سے تعبیر کیا ہے۔ جس سے دنیا و آخرت کی ہر بھلائی کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے ذکر کا رفع و دوام بھی شامل ہے..... اور نوازشات کا یہ سلسلہ پیہم جاری ہے کہ ملاءِ اعلیٰ میں اللہ پاک اور ملائکہ اپنے اپنے انداز میں قدر و منزلت کے اس سلسلے کو وسعت و رفعت دینے میں ہمہ دم مصروف ہیں گویا عالم علوی میں آپ ﷺ کا ذکر جاری ہے، رحمتوں کا نزول بھی ہو رہا ہے اور بلندیٔ درجات کی آرزو بھی۔ ہم خاکیوں کو بھی درود و سلام کا حکم ہے تاکہ آپ ﷺ کی عظمتوں اور رفعتوں کے اعتراف و اضافے میں عالم علوی اور عالم سفلی دونوں ہم آہنگ ہو جائیں اور آپ ﷺ کا ذکر یوں بلند ہو کہ اوقاتِ عالم کا ایک لمحہ بھی ایسا نہ ہو جو اس ذکر سے معمور نہ ہو۔

ہر لمحہ، ہر صدی کا ازل سے اُفق اُفق
صلِّ علیٰ کا سرمدی نغمہ سنائے ہے

طغیانِ ناز کے انداز دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی بات بھی، حضور ﷺ کے دہنِ مبارک سے سننا اور لوگوں کو سنانا پسند فرماتے ہیں۔ بخشش کے انداز بھی نرالے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والوں کو آپ ﷺ ہی کی خدمت میں بھیج کر حکم دیتے ہیں کہ اب مجھ سے بخشش طلب کرو اور جن کے پاس بھیجا ہے وہ بھی بخشش کی التماس کریں۔ تو پھر میں معاف کرنے والا بھی ہوں اور مہربان بھی۔ (نساء۔۶۴) اور پھر نبیٔ کریم ﷺ کو اپنے لیے، مومنوں اور مومنات کے لیے استغفار کا حکم بھی ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ ﷺ کی دعا کو پریشاں حالوں کے لیے وجہِ سکون بھی بنا دیا (توبہ۔۱۰۳) اور آپ ﷺ کو مومنوں کے لیے رؤف و رحیم اور جملہ عالمین کے لیے سراپا رحمت بھی۔ سوچتا ہوں کہ خود اللہ تعالیٰ کے نزولِ رحمت اور ملائکہ کے التماسِ نزولِ رحمت کے بعد ہم عاصیوں اور خاکیوں کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دراصل اللہ تعالیٰ نے ہمیں سعادتوں اور رحمتوں کے ہالے میں رکھنے کے لیے ہی یہ اہتمام فرمایا ہے۔

درج بالا شعر بنیادی طور پر استمداد کی نوعیت کا ہے۔ میری علمی لاعلمی استمداد و توسل کی بحث میں پڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ اس میں اُس حدیثِ پاک کی طرف اشارہ ہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ''اللہ معطی ہیں اور میں قاسم ہوں'' گویا آپ ﷺ پر 'معطی' کی طرف سے عطاؤں کی بارش ہو رہی ہے اور یہ عطائیں، ہماری خطائیں ڈھانپتی چلی جا رہی

ہیں۔ ہماری ہر آرزو کے سیاق وسباق میں درودِ پاک ایک پاکیزہ حوالہ ہی تو ہے، یہی حوالہ ہماری آبرو ہے اور استجابتِ دعا کی دلیل بھی اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہر لحہ یہ یقین رہے کہ 'معطی' اللہ اور صرف اللہ ہے۔ اس نظریے میں کسی نوع کی دراڑ نہیں آنی چاہیے ورنہ دین کی پوری عمارت ہل جائے گی۔

O

☆

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہے جس کا نور
وہ جلوہ زارِ حسنِ درخشاں تمھی تو ہو
شادابیٔ صنوبر و نسریں تمھی سے ہے
بوئے گُل و بہارِ گلستاں تمھی تو ہو
اختؔر کو بے نوائی دنیا کا فکر کیا
ساماں طرازِ بے سروساماں، تمھی تو ہو
(اختر شیرانی)

O

چوں بنامِ مصطفیٰ ﷺ خوانم درود
از خجالت آب می گردد وجود
چوں نداری از محمد ﷺ رنگ و بو
از درودِ خود میالا نامِ او

مدینہ منورہ میں حاضری، اِس گندم نما جوفروش اور زُنّار دار خرقہ پوش کے لیے ایک کٹھن اور آزمائشی سا مرحلہ رہی ہے۔ جب بھی اللہ پاک نے حاضری کی توفیق بخشی میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ علامہ اقبالؒ نے احتساب کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کو تو درگزر کی التماس کرتے ہوئے کہہ دیا کہ چلیں پھر حساب کتاب کر لینا لیکن احتساب کے اس منظر کو اپنے تک محدود رکھنا، نگاہِ مصطفیٰ ﷺ سے بچا اور چھپا کر کہ وہاں شرمساری کی تاب نہیں ہے۔ اقبالؔ اللہ تعالیٰ کو کس شوخی سے کہہ رہا ہے ؎

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
خود بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

کہ وہ اُسی کی تخلیق ہے جیسی بھی ہے، اُسی کی ہے اور اُسی نے یہ جانتے ہوئے اُسے احسنِ تقویم بنا کر دنیا میں بھیجا کہ وہاں جا کر یہ بندہ لغزشوں اور گناہوں کو بھی شعار بنائے گا اور گاہے بگاہے سربسجود بھی ہوگا، یہ بھی کرم کا ایک انداز ہے کہ ''علمِ گناہ'' کے باوجود بندے کو اپنا خلیفہ بنا کر وہ اعزاز بخشا کہ کائنات کی ہر شے کو اس کے لیے مسخر کر دیا ؎

مرے ذوقِ تسخیرِ فطرت کے آگے
عناصر کا قلب و جگر کانپتا ہے

اور ملائکہ کو حکم دیا کہ اس کی عظمتوں کے حضور میں جھک جاؤ اور اپنی مہربانیوں کے دامن کو یہاں تک وسیع کیا کہ ابلیس کو کہا کہ تو میرے بندوں کو بہکاتا رہے گا اور میں اپنے بندوں کو معاف کرتا رہوں گا، یہاں تک کہ ان کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دوں گا۔ شاعر نے اگر یہ کہا کہ ؎

اس قدر پیار ہے انساں کی خطاؤں سے مجھے
کہ فرشتہ مرا معیار نہیں ہو سکتا

تو یہ حسین آرزو بھی کی کہ ؎

اے خدا! پھر یہ جہنم کا تماشا کیا ہے
تیرا شہکار تو فی النّار نہیں ہو سکتا

بہر کیف میرے لیے مدینہ پاک کی حاضری ایک مشکل مرحلہ رہی ہے۔ یہاں آتے ہی، ندامت کا ایک احساس قلب ونظر کا احاطہ کر لیتا ہے۔ میں تو خود کو سلام پیش کرنے اور درود پڑھنے کے قابل بھی نہیں پاتا رہا۔

۱۹۹۸ء میں شرمساری کی اس کیفیت سے نجات دلانے کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے یہ بات دل میں ڈالی کہ سورۂ توبہ کی آخری دو آیتوں کا سہارا کیوں نہیں لیتے؟

لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ○

سورۂ توبہ کی درج بالا آیات واضح کر رہی ہیں کہ یہی وہ ذاتِ گرامی قدر ﷺ ہے جس پر ہمارا دنیاوی اضطراب اور اُخروی عذاب دونوں انتہائی گراں گزرتے ہیں۔ جن کے دنوں کی تپش اور شبوں کا گداز ہماری خیر خواہی کے لیے وقف رہا ہے۔ جن کی دعائیں اور جن کا استغفار تب بھی وجہِ سکون تھا اور اب بھی۔ جو آسان دینِ حنفی کے ساتھ مبعوث ہوئے، جو ہماری دنیاوی ہدایت اور اُخروی منفعت کے حرص کی حد تک خواہاں ہیں اور جنھیں ہمارا دوزخ میں جانا کسی نوع بھی گوارا نہیں ہے، جن کا فرمان ہے کہ ؎

''میں تمھیں تمھاری پشتوں سے پکڑ پکڑ کر کھینچتا ہوں لیکن تم مجھ سے دامن چھڑا کر زبردستی نارِ جہنم میں داخل ہوتے ہو۔''

مدینہ منورہ میں سورۂ توبہ کی درج بالا آیات مجھے ہولے ہولے حوصلہ دینا شروع کر دیا کرتی ہیں اور پھر حدیث شریف کے چالیس درود وسلام.....اب کے تو حضور ﷺ کے قدمین شریفین کے سامنے اس پُرتقصیر کو کچھ یوں لگا کہ جیسے

کوئی ہے مائلِ لطف و کرم پوشیدہ پوشیدہ

○

گزاری ہے شبستانِ ہوس میں زندگی میں نے
پشیماں ہوں، پشیماں ہوں، پشیماں، یارسول اللہ ﷺ
تن آساں، ناتواں، آلودہ داماں، بے سروساماں
کہوں کس منہ سے میں خود کو مسلماں، یارسول اللہ ﷺ
کرم نے تیرے بخشا حوصلہ عرضِ تمنا کا
وگرنہ میں کہاں کا ہوں سخنداں، یارسول اللہ ﷺ

دورِ حاضر (کہ فتنۂ آخر زماں ہے) میں اخلاق و سیرتِ اسلامی اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اس لیے اگر کوئی ایسی شخصیت ہو جس کی آنکھ میں حیا کی معصومیت، دل میں ایمان کی حلاوت اور روح میں خدا کا خوف اور خشیت ہو، تو اس کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا گو بھی رہنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں ان نعمتوں کے لیے شکر گزار بھی کہ ہر تعریف کا سزاوار وہی ہے اور ہر ثنا اسی تک جاتی ہے۔ ؎

ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے دَر تک

رازؔ کاشمیری، میرے ایسے ہی دوستوں میں سے تھے، وہ نعت بھی اچھی کہتے تھے اور غزل بھی شریفانہ، لاہور کے شستہ و شگفتہ ادبا و شعرا سے ان کے قریبی مراسم تھے۔ جناب عبدالعزیز خالدؔ بھی ان کے حلقۂ احباب میں تھے۔ جناب عبدالعزیز خالدؔ (۱۹۲۷ء۔۲۰۱۰ء)، اس گئے گزرے دور

میں ایک فاضل شخصیت تھے۔ وہ عربی زبان کے اُردو شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں قرآن و حدیث اور قدیم صحائف کے حوالے جا بجا جلوہ گر ہیں۔ عربی کی بلاغت اور فارسی کی حلاوت سے دورِ حاضر کم نصیب ہے۔ اس لیے ہم لوگوں کو عبدالعزیز خالد کی شاعری کو پڑھنے کے لیے بہت کچھ سیکھنا اور سمجھنے کے لیے بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے، ہم لوگ اپنی علمی بے مائیگی کا ماتم کرنے کے بجائے انہیں ادق نگار اور مشکل نویس کہتے ہیں۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کے الفاظ میں ''وہ سطحیت کے اس دور میں ٹھوس علمیت کے علمبردار تھے۔ وسعتِ مطالعہ کے نتیجے میں ان کے کلام پر مشرق و مغرب کے آداب کا اثر پڑا اور اُن کی حیثیت اُس دریا کی رہی جس نے دیس دیس کی مٹی لا کر اپنے دیس میں بچھا دی۔'' ایک شام راز کاشمیری مرحوم نے مجھے بتایا کہ آج ایک نعتیہ مشاعرے میں جناب عبدالعزیز خالد نے ایک خوبصورت نعت (درج بالا شعر اُسی نعت کے ہیں) سنائی اور میں نے مشاعرے کے بعد انہیں کہا کہ خالد صاحب مبارک ہو، ''کس بات کی؟'' کہ آج آپ کی نعت کا ایک مصرع سامعین کی سمجھ میں آ گیا ہے۔'' وہ کون سا ہے؟'' پشیماں ہوں، پشیماں ہوں، پشیماں، یارسول اللہ ﷺ''۔ مجھے یہ تین شعر، تب سے اب تک یاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ راز کاشمیری کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور عبدالعزیز خالد کو نصرتِ جاوداں سے نوازیں کہ ان کے ان اشعار نے، نبیٔ کریم ﷺ کے حضور میں، حالِ دل کہنے میں بہت اعانت کی۔ یوں زندگی بھر کی ندامتوں اور پشیمانیوں کو اُنھی کے کرم کا سہارا لے کر، اُنھی کی بارگاہِ رحمت میں پیش کر دیا کہ نسبت تو اس بُرے کی آپ ﷺ ہی سے ہے اور واضح ہے کہ بُرے آپ ﷺ کے ہیں اور ''الطالح لی'' آپ ﷺ ہی کا فرمان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرفانِ ذات بھی اس در کی وابستگی سے ملتا ہے اور عرفانِ حق بھی اسی بارگاہ سے عطا ہوتا ہے، زندگی کی ہر تاریکی کو اُجالا اسی ذات پاک ﷺ کی اطاعت سے ملتا ہے کہ اس ذاتِ اقدس ﷺ نے ہمارے دونوں ہاتھوں پر چراغ رکھ دیئے ہیں، ایک چراغ سنت ہے دوسرا قرآن ؎

تو نے اے نورِ مجسم! راز یہ افشا کیا
ہے اندھیرا خود ہی اپنا، خود اُجالا آدمی
کاش! تیرے چشمۂ حیواں پہ آ پہنچے کبھی
یہ سرابوں سے سرابوں تک بھٹکتا آدمی

O

نہ فکر بس میں، نہ قابو نظر پہ ہے آقا
دل و دماغ کی دنیا ہے تیرگی کے لیے
زمانے بھر میں تجلّی بکھیرنے والے!
کچھ اہتمام، مرے دل کی روشنی کے لیے

نبیٔ کریم ﷺ کی ایک دعا کا ترجمہ کچھ یوں ہے ۔

''یا اللہ! میرے بدن میں مجھے عافیت دے، یا اللہ! میرے کانوں میں مجھے عافیت دے، یا اللہ! میری آنکھوں میں مجھے عافیت دے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔''

جسمِ انسانی میں آنکھ ایک بلیغ ترین عضو ہے اور کان سماعت کا ایک ذریعہ ہیں، آنکھ، نظاروں کو دیکھ کر اور کان سریلی آوازوں کو سن کر، لطف و لطافت کو، دل، ذہن اور روح کی طرف منتقل کرتے ہیں اور تصور کو تصویر بنتے دیر نہیں لگتی، اقبال عظیم، ایک عظیم شاعر تھے، نابینا تھے۔ وہ اسی نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی یوں کرتے ہیں ۔

تصور خود بنا لیتا ہے آوازوں سے تصویریں
مری محفل میں نا دیدہ بھی، نادیدہ نہیں ہوتے

کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ خوش الحان قاری کی آواز بھی عورت کے کان میں نہیں پڑنا

چاہیے کہ وہ فسادِ قلب کا باعث بن سکتی ہے۔ کانوں کو بند کرنا مشکل ہے۔ مگر نگاہوں کو جھکائے رکھنا، نسبتاً آسان ہے، اسی لیے اسلام نے نگاہوں کو جھکے رہنے کا حکم دیا ہے کہ عفتِ نگاہ ہی سے دل کی صالحیت عبارت ہے۔ بدنظری، شیطان کا مسموم تیر بن کر دل کو بگاڑتی ہے اور دل بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے۔ جبکہ خوش نظری، ناظر کو جلوۂ حسن سے حسن آفرین تک لے جاتی ہے اور پھر ہر لحظہ نیا طور ہے نئی برقِ تجلی اور مرحلہ ہائے شوق طے ہوتے ہی نہیں کہ وہ حسن آفرین ہر روز نئی شان سے جلوہ گر ہوتا اور رہتا ہے۔

جناب واصف علی واصفؔ لکھتے ہیں کہ:

''آنکھیں کبھی کبھی انسان سے ناراض ہو جاتی ہیں..... اور پھر اس کو بدبخت نظاروں کی طرف لے جاتی ہیں، وہ آوارہ پھرنے لگتا ہے۔ وہ برہنگیٔ اجسام کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔ آنکھیں ایسا ایسا منظر تلاش کر کے انسان کے آگے پیش کرتی ہیں کہ وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ بدبخت نظاروں کا متلاشی انھی بدبختیوں کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے اور پھر وہ اس عاقبت تک جا پہنچتا ہے جو ان نظاروں کی ہوتی ہے..... نفس کو اُکسانے کا عمل آنکھوں سے شروع ہوتا ہے..... اور پھر انسان ایک درندے کی طرح اپنے شکار کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ گناہ کی تلاش ہی تو گناہ ہے۔ آنکھوں کا یہ عمل کبھی کبھی تو قوموں کو تباہ کر دیتا ہے..... نظاروں کا گناہ ختم ہو جائے تو وجود کا گناہ ختم ہو جاتا ہے۔ ایسی باطل شناس آنکھیں شفایاب ہو سکتی ہیں اگر ان کو وہ سرمہ مل جائے جسے خاکِ مدینہ و نجف کہا گیا ہے۔''

گزشتہ دنوں ایک اللہ والے، باتوں باتوں میں یہ بات کہہ گئے کہ ''وہ اخبار نہیں پڑھتے کہ آج کے اخبار نہ دیکھنے کے قابل ہیں اور نہ پڑھنے کے۔'' ہمارے ذرائع ابلاغ جس انداز سے بدنظری اور بے حیائی کو فروغ دے رہے ہیں، اس سے ایمان کا بچنا ویسے ہی مشکل ہو گیا ہے جیسے انگارا، مٹھی میں تھامنا۔ گھر سے لے کر بازار تک، نامحرم جلوے نگاہوں سے لپٹ لپٹ جاتے ہیں۔ ہمارے دور کا سب سے بڑا مسئلہ، نظر ہی کو قابو میں رکھنا ہے جو کسی صاحب نظر ہی کے التفات سے حل ہو سکتا ہے کہ اس کی توجہ، نظر اور فکر دونوں کا رُخ بدل کے رکھ دیتی ہے۔ گویا نظر کی بے راہ روی ہی، فکر کو پراگندہ کرتی ہے اور یہی پراگندگی دل کو تیرہ و تاریک بنا دیتی ہے..... اور یہ

تیرگی، اللہ تعالیٰ کے نبیٔ پاک ﷺ اور اُن سے تعلقِ خاطر رکھنے والے، اولیائے کرام کی توجہاتِ گرامی قدر ہی سے روشنی میں بدل سکتی ہے ؎

دماغوں سے آؤ، دلوں کی طرف
بڑھاؤ قدم منزلوں کی طرف
فقیروں کی صحبت بڑی چیز ہے
کبھی آؤ، ان محفلوں کی طرف

اللہ تعالیٰ جناب پروفیسر محمد حسین آسیؔ کو صحت و عافیت سے نوازیں، زیبِ عنوان اشعار انہی کے ہیں۔ حضرت آسیؔ، خاصانِ بارگاہ میں سے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں وقت کے ایک ایسے ولیٔ کامل ؒ کی صحبت عطا فرمائی جس کی نگاہ دلوں کی کائنات بدلنے پر قادر تھی۔ نتیجہ معلوم کہ اُن کی تربیت اور اُن کی توجہ نے انہیں عصمتِ نگاہ سے بھی نوازا اور عفتِ قلب سے بھی۔

میں دعا گو ہوں، اُن کے قلم کی رعنائی کے لیے، جس نے اس پریشاں نظر اور آلودہ داماں انسان کو اس بارگاہِ اقدس میں حالِ دل کہنے کا سلیقہ دیا، جہاں لب، کھلنے سے پہلے، اسلوب کا کوئی نہ کوئی حسن تلاش کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اسلوب کا یہ حسن بھی محبوب کی عطا ہے۔ اپنا فخر نہیں ؎

قلم نے چوما جب امّی لقب کے ہاتھوں کو
صحیفہ ہائے ادب نے بلاغتیں پائیں
دلوں نے سوز، دماغوں نے سوچ، ذہن نے لفظ
زباں نے صوت، خیالوں نے حرمتیں پائیں

کتنی سچی بات ہے مخبرِ صادق ﷺ کی، کہ بڑھاپے میں 'حرص اور اُمید' بڑھ جاتے ہیں۔ جہاں تک اس پُرتقصیر کا تعلق ہے، پایانِ عمر میں ''ہوس'' چھپ چھپ کے سینے میں تصویریں بنا رہی ہے۔ اقبالؒ کے دور میں، 'براہیمی ایمان' پیدا تو ہوتا ہوگا، گو مشکل سے، بڑی مشکل سے.....مگر میں اس ایمان کی ایک رمق کے لیے ترس رہا ہوں اور پھر رحمٰن و رحیم ذاتِ بلند و برتر کی یہ ہدایت یاد آجاتی ہے کہ ''میری رحمت سے کافر ہی مایوس ہوتے ہیں، مسلمان نہیں.....اور پھر رحمتِ عالم ﷺ کا یہ ارشاد تپتے ہوئے دل پر طمانیت کی پھوار بن کر برستا ہے کہ دورانِ نماز میں، برے خیالات کا در آنا اور پھر نمازی کا نماز ہی میں انہیں جھٹکنا، دلیلِ ایمان ہے۔ سوچتا ہوں کہ کیا میں واقعی ایمان کے مقام پر ہوں اور پھر اِس سوچ کے ساتھ ہی تیرہ تیرہ دل اور تار تار گریبان دونوں ایک خنک سی

چاندنی میں نہا جاتے ہیں.....الحمدللہ۔

(جناب پروفیسر محمد حسین آسی ۸ اگست ۲۰۰۶ء کو وفات پا گئے، مولا کریم انہیں نصرتِ جاوداں سے نوازے۔ اُن کے والد گرامی قدر کا نام صوفی محمد مقبول تھا۔ وہ حضرت سید جماعت علی شاہؒ علی پور سیداں شریف کے مرید خاص تھے۔ حضرت آسی کی تاریخ ولادت ۱۹۳۹ء اور مقام ولادت بکنور ضلع گورداسپور ہے، آپ کا نام بھی حضرت سید جماعت علی شاہ لاثانیؒ ہی نے رکھا تھا۔ آپ نے اسلامیات اور اردو میں ایم۔ اے کیا۔ لاہور، ڈسکہ، سیالکوٹ اور شکرگڑھ کے تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے۔ آپ حضرت نقشِ لاثانی سید علی حسین شاہؒ کے خلیفہ تھے۔ ۱۹۷۶ء میں اپنے مرشد کی معیت میں حج کی سعادت حاصل کی۔ دوسری مرتبہ ۲۰۰۰ء میں پھر حج کیا۔ ۵۰ سے زائد موضوعات پر آپ کی تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ گورنمنٹ کالج شکرگڑھ کے ادبی مجلّے کا قرآن نمبر آپ کی ایک وقیع تالیف ہے جسے نہ اہلِ نظر، نظر انداز کر سکتے ہیں نہ تماشائی۔)

O

☆

وہ ناطق، جس کے آگے مہر برلب بلبلِ سدرہ
وہ صادق، جس کی حق گوئی کا شاہد نطقِ ربّانی

(اقبال سہیل)

O

ڈاڑھی سفید ہو چکی،دل ہے ابھی سیاہ
غافل سمجھ سکا نہیں، فطرت کا انتباہ
نیکی کا گر خیال بھی آیا تو دو گھڑی
اورغفلتوں میں کٹ گئے کتنے ہی سال و ماہ
ہے ماحصل یہی سفرِ حیات کا
کچھ ارمغانِ معصیت، کچھ ہدیۂ گناہ
تیرے کرم کی آس ہے آسی کا آسرا
اے تاجدارِ طیبہ و بطحا! خدا گواہ
پہنچوں ترے حضور میں،مَیں چل کے سر کے بل
دل میں ہے اشتیاق کا طوفانِ بے پناہ
کب آئے گا بلاوا فقیرِ حقیر کو
ہے گوش بر آواز وہ ہر شام، ہر پگاہ

ذاتی اور کیفیاتی نوعیت کی یہ غزل نما نظم، جناب محمد رمضان راتھر (وفات ۱۹۷۹ء) کی ہے۔ میں نے کبھی ان کی غیر مطبوعہ بیاض میں پڑھی تھی اور

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

راتھر، ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (اب یونیورسٹی) گکھڑ میں میرے تدریسی رفیق رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک عبقری ذہن دیا تھا اور اس وہبی صلاحیت کو وسعتِ مطالعہ نے جلا بخشی تھی۔ وہ بہترین شعری ذوق کے حامل تھے۔ دینی رسوخ ورثے میں ملا تھا، دل والے تھے، شب بیدار تھے، انہیں مل کر اور اُن سے ہمکلام ہو کر یوں لگتا تھا جیسے اُن کا وجود عناصرِ اربعہ سے نہیں بلکہ فنون لطیفہ سے بنا ہُوا ہے۔ وہ خوش نویس بھی تھے اور بجا طور پر دعویٰ کر سکتے تھے کہ ؎

ساختہ ام خامہ زبالِ پری

اور نزہتِ فکر کے اعتبار سے کہ سکتے تھے کہ ؎

نہم غازہ بررخِ مہر و ماہ

میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ شعر و ادب کی زیبائی، درس و تدریس کی رعنائی اور فکر و نظر کی رسائی۔ میرے طالب علمانہ مزاج کو اُن کی صحبت سے بہت کچھ ملا کہ ؎

انداز تھے جذب اس میں سب شمعِ شبستاں کے
اِک حسن کی دنیا تھی خاکسترِ پروانہ

سوچتا ہوں کہ اب تو وہ سانچا ہی ٹوٹ گیا ہے جس میں راتھر ایسے اہل نظر، اہل دل اور اہل علم لوگ ڈھلا کرتے تھے۔ انہیں دیارِ خدا اور رسول ﷺ میں حاضری کی شدید آرزو تھی اور اس نظم میں بھی یہی تڑپ موجود ہے وہ اس حسین آرزو کو دل ہی میں لیے، اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔ میرا یقین ہے کہ جب اِدھر حاضری کی آرزو دل میں اُبھرتی ہے تو ثواب اُسی لمحے، نامۂ اعمال میں درج اور جمع ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ وہاں نیت کے خلوص ہی کی قدر ہے اور وہ نیت کب عمل بنتی ہے، یہ ہمارے اختیار میں نہیں، وہ علیم و حکیم ذاتِ بلند و برتر، بہتر جانتی ہے کہ کسے اپنے در پر بلانا ہے اور کسے انتظار میں تڑپانا اور کہتے ہیں کہ عاشقوں کو بلایا کم اور تڑپایا زیادہ کرتے ہیں ؎

تیری دوری سے مرے دل نے یہ محسوس کیا
درد، شعلہ بھی ہے، نغمہ بھی ہے، آواز بھی ہے

مسجدِ نبوی میں ان اشعار کا یاد آ جانا، محبی محمد رمضان راتھر کے لیے دعائے مغفرت کی حیثیت

رکھتا ہے کہ دعا، ہاتھ اُٹھانے سے کہیں زیادہ، دل کی دھڑکنوں اور نگاہوں کی تمناؤں کا نام ہے۔ جناب راؔقمر لالۂ صحرائی تھے، خاموشی سے چل بسے۔ وہ حبابِ بحر کا شیشہ تھے، ٹوٹے مگر صدا نہیں آئی، اُن کی خوبصورت تحریروں کا ڈھیر اور اُن کے قلم کا نور یہ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے کہ یہ وجود جس مٹی میں ملے گا وہ مٹی بھی یقیناً خوشبو دینے لگے گی اور اس سے واقعی لالہ وگل پھوٹیں گے۔ اُن کی تحریروں میں کلیوں کی چٹک اور شبنم کا لہجہ تھا اور جب دل پر چوٹ پڑتی تھی تو اُن کے لفظ پھول بن کر نکھرتے اور آنسو بن کر چھلکتے تھے اور گاہے دبی چنگاریوں کی طرح سلگنے لگ جاتے تھے......وہ خود ایک سلگتا ہوا نغمہ تھے......سراپا آہنگ ہونے کے باوجود ایک بے صدا موسیقی......آخر میں ان کی ایک غیر مطبوعہ نعت ؎

این فقیرِ رہ نشین و خاکسار
با حضورِ دل، بچشمِ اشکبار
خواجۂ کونین ﷺ را گوید سلام
وز ادب خواند درودِ بے شمار

برمکینِ گنبدِ خضریٰ سلام
بر سوار لیلۃ الاسریٰ سلام
بر جمالِ مہوشِ بطحا درود
بر ادائے مہ رخ طیبہ سلام

اے مکینِ خاطرِ دل خستگاں
اے نگارِ خالق کون و مکاں
در فراقِ تو ز جاں افتادہ ایم
شہسوارا! سوئے ما درکش عناں

من فقیر ابن فقیر، ابن فقیر
روز و شب در بندِ عصیانم اسیر
کم نہ گردد، یک شعاع از نورِ تُو
کلبۂ تاریکِ من کن مستنیر

O

مشرف گرچہ شد جامیؔ زلطفش
خدایا! ایں کرم بارِ دگر کن

مولانا جامیؒ کی پوری نعت یوں ہے ؎

نسیما، جانبِ بطحا گزر کن
ز احوالم محمد ﷺ را خبر کن
بہ بر ایں جانِ مشتاقم بآں جا
فدائے روضۂ خیرالبشر ﷺ کن
توئی سلطانِ عالم یا محمد ﷺ
ز روئے لطف سوئے من نظر کن
مشرف گرچہ شد جامیؔ زلطفش
خدایا، ایں کرم بارِ دگر کن

یہ معروف نعت جامیؒ کی کلیات میں نہیں ہے۔ میں اسے ''تاریخِ ملتان''، مؤلف کرم الٰہی بدرؔ کے صفحہ ۱۵ سے نقل کر رہا ہوں۔ اس خوبصورت نعت پر مؤلف نے یہ نوٹ دیا ہے۔

''جب مولانا جامیؒ اپنی صفائی باطن کے امتحان میں کامیاب ہو کر آقائے نامدار ﷺ کی زیارتِ پاک سے سرفراز ہوئے تو انہوں نے قلعۂ ملتان پر حضرت شیخؒ (حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ) کے قدموں میں کھڑے ہو کر اپنی شہرۂ آفاق التجا لکھی۔''

زیارتِ رسول پاک ﷺ بڑے ہی نصیب کی بات ہے۔ ایک ایسا شرف ہے کہ اس پر حیاتِ

مستعار تا قیامت نازاں رہ سکتی ہے۔ مدینہ آپ ﷺ کی زیارت ہی سے کعبہ صفت، محترم ہے، صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کی زیارت ہی کی بدولت گھٹا ٹوپ اندھیروں میں منزل کی طرف رہنمائی کرنے والے روشن ستارے ہیں۔ امام ابن حزم رحمۃ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی ایک جھلک یوں دکھاتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نہ بہت لانبے تھے، نہ پستہ قد بلکہ آپ ﷺ کا قد مبارک درمیانہ تھا۔ رنگ کے اعتبار سے آپ نہ بالکل سفید تھے نہ گندم گوں، بلکہ رنگ سفیدی کے ساتھ سرخی لیے ہوئے تھا۔ چہرہ مبارک چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن، چمکدار، سر کے بال نہ بالکل سیدھے نہ بالکل پیچدار بلکہ ہلکی سی پیچیدگی کے ساتھ گھونگریالے تھے۔ اعضا کے جوڑوں کی ہڈیاں موٹی اور پُرگوشت تھیں۔ پلکیں سیاہ سرمگیں، آنکھوں کی سفیدی میں باریک سرخ ڈورے، دندان مبارک خوبصورت چمکدار، دہن اعتدال کے ساتھ فراخ یعنی تنگ نہ تھا، ناک خوبصورت، رفتار تیز تھی۔ چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ آپ ﷺ ڈھلوان زمین پر اُتر رہے ہیں، جب آپ ﷺ توجہ فرماتے تو پورے بدن کے ساتھ فرماتے یعنی صرف گردن پھیر کر متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ نگاہ اکثر نیچی رہتی تھی۔ ہتھیلیاں پُرگوشت اور ملائم تھیں۔ ایڑی میں گوشت کم تھا۔ ریش مبارک گھنی اور بال سیاہ تھے۔ آپ ﷺ کے پاؤں کے تلوے قدرے گہرے تھے۔ سر کے بال زیادہ لمبے ہوتے تو کان کی لو تک یا شانے تک رہتے تھے۔ آپ ﷺ کے سر اور ڈاڑھی کے بال بیس سے زیادہ سفید نہ تھے یعنی گنتی کے بال سفید تھے۔''

نبیٔ پاک ﷺ خُلقاً و خلقت دونوں اعتبار سے مکمل و اکمل تھے۔ جن بزرگوں نے نبیٔ اکرم ﷺ کا حلیہ بیان کیا ہے وہ فصاحت و بلاغت کی جملہ دلپذیریوں کے باوجود حسنِ صورت کی محض ایک جھلک ہی دِکھا سکے ہیں، حقیقت وصف کا ادراک نہ کسی سے ہوسکا اور نہ کوئی کرا سکا کہ اُسے خالقِ کائنات کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ امام بوصیریؒ کے مطابق:

''انہوں نے صرف صورت دکھائی ہے تیری صفات کی لوگوں کو، جیسا پانی صورت دکھاتا ہے ستاروں کی۔'' کسی اللہ والے نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ''رسولِ پاک ﷺ کا کامل حسن ہمارے لیے ظاہر نہیں ہوا کیونکہ اگر ظاہر ہو جاتا تو آنکھیں آپ ﷺ کے دیدار کی تاب نہ لاسکتیں۔'' تشبیہات و استعارات کا سارا جمال، اس کمال کے محض

ایک پرتو کے لیے ہے کیونکہ ''حقیقت میں مخلوقات سے میں سے کوئی شے آپ ﷺ کی صفات خُلقیہ اور خِلقیہ کے مماثل ومعادل نہیں۔''

رخِ مصطفیٰ ﷺ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں، نہ دکانِ آئینہ ساز میں

اہلِ نظر کہتے ہیں کہ یہ پُر انوار سراپا، دل کی انگشتری کا نگینہ ہو اور زبان درود وسلام سے تر رہے تو زیارتِ رسول پاک ﷺ نصیب ہو جاتی ہے۔ نوازنا تو بہر کیف محبوب ہی نے ہے۔ ضروری ہے کہ زبان غلط گوئی، کان غلط سماعت اور نظر غلط بینی سے امکانی حد تک بچی رہے..... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دل کو خلوت خانہ بنانے کی سعی کی جائے کہ ؎

جانے کب دے دے، صدا کوئی حریمِ ناز سے
بزم والو! گوش بر آواز رہنا چاہیے

سوچتا ہوں کہ اطاعتِ رسول ﷺ، زیارتِ رسول ﷺ سے زیادہ اہم ہے اور یہ حقیقت پہلے بھی لکھی جا چکی ہے کہ حضور ﷺ محض خراجِ عقیدت لینے کے لیے تشریف نہیں لائے تھے بلکہ مقصودِ بعثت خراجِ اطاعت تھا، کہ یہی اطاعت حب رسول ﷺ کے اخلاص کا معیار ہے۔ یہی پیمانہ ہے جو ناپ کر بتا دیتا ہے کہ ایک مسلمان کو نبیٔ کریم ﷺ سے کس قدر محبت ہے۔

حضرت اویس قرنیؓ، زیارتِ رسول ﷺ سے محروم رہے مگر نگہِ رسول پاک ﷺ میں محترم ٹھہرے۔ حضرت حمزہؓ کا قاتل وحشی اشاعت اسلام کے بعد طائف بھاگ گیا تھا۔ وہ رمضان ۹ھ میں قاصدوں کے ساتھ حاضر ہوا اور اسلام لایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ''میرے سامنے نہ آیا کرو، مجھے چچا حمزہؓ کی شہادت یاد آ جاتی ہے۔'' حضرت وحشیؓ فوراً خود کو مدینے سے دور لے گئے اور صحابہ کرامؓ ان کی زیارت کو جایا کرتے تھے کہ وہ مقامِ اطاعت پر تھے۔ انھوں نے مسیلمہ کذّاب کو اُسی حربے سے قتل کیا جس سے حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا۔ حضرت وحشیؓ کہا کرتے تھے کہ ''میں نے حالتِ کفر میں خیر الناس کو شہید کیا اور حالتِ اسلام میں شر الناس کو قتل کیا۔''

تاریخ میں یہ واقعہ بھی محفوظ ہے کہ ایک دن نبیٔ پاک ﷺ مسجد نبوی میں صحابہؓ سے کچھ فرمانا چاہ رہے تھے اور فرما رہے تھے، بیٹھو بیٹھو۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ابھی وہیں پہنچے تھے جہاں صحابہؓ کی مبارک جوتیاں پڑی ہوئی تھیں وہ اس آواز کے سنتے ہی وہیں بیٹھ جاتے ہیں..... اطاعت کا یہ انداز، سبحان اللہ، لوٹنے کی جائے ہے..... بہر کیف میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے اطاعتِ

رسول ﷺ ہی کی توفیق مانگنا چاہیے کیونکہ زیارتِ رسول پاک ﷺ، بس کی بات نہیں، عطا ہے عطا کرنے والے کی.....اور بڑے نصیب کی بات ہے۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کے الفاظ میں

''سچی بات یہ ہے کہ ہم کہاں؟ اور نبیٔ کریم ﷺ کی زیارت کہاں؟ چنانچہ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیعؒ کی خدمت میں ایک صاحب آئے اور کہا، حضرت! مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتا دیجیے جس کی برکت سے حضور اقدس ﷺ کی زیارت نصیب ہو جائے۔ حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا ''بھائی! تم بڑے حوصلے والے آدمی ہو کہ تم اس بات کی تمنا کر رہے ہو کہ سرکار دو عالم ﷺ کی زیارت ہو جائے۔ ہمیں تو یہ حوصلہ نہیں ہوتا کہ یہ تمنا کریں۔ اس لیے کہ ہم کہاں؟ اور نبیٔ کریم ﷺ کی زیارت کہاں؟ اور اگر زیارت ہو جائے تو اس کے آداب، اس کے حقوق اور اس کے تقاضے کس طرح پورے کریں گے، اس لیے خود اس کے حاصل کرنے کی نہ تو کوشش کی اور نہ کبھی اس قسم کے عمل سیکھنے کی نوبت آئی جس کے ذریعہ حضور اقدس ﷺ کی زیارت ہو جائے، البتہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے خود ہی زیارت کرا دیں تو یہ ان کا انعام ہے اور جب خود کرائیں گے تو پھر اس کے آداب کی بھی توفیق بخشیں گے۔''

حضرت والد صاحبؒ جب روضۂ اقدس پر حاضر ہوتے تو کبھی روضۂ اقدس کی جالی کے قریب نہیں جاتے تھے بلکہ ہمیشہ کا یہ معمول دیکھا کہ جالی کے سامنے جو ستون ہے اس ستون سے لگ کر کھڑے ہو جاتے اور اگر کوئی آدمی کھڑا ہوتا تو اس کے پیچھے جا کر کھڑے ہو جاتے۔

ایک دن خود فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید تو بڑا شقی القلب ہے، اس وجہ سے جالیوں کے قریب ہونے کی کوشش نہیں کر رہا ہے اور یہ اللہ کے بندے ہیں جو جالی کے قریب ہونے اور اسے چمٹنے کی کوشش کر رہے ہیں اور سرکار دو عالم ﷺ کا جتنا قرب حاصل ہو جائے وہ نعمت ہی نعمت ہے لیکن میں کیا کروں کہ میرا قدم آگے بڑھتا ہی نہیں..... جیسے ہی مجھے یہ خیال آیا، اسی وقت مجھے یہ محسوس ہوا کہ روضۂ اقدس کی طرف سے یہ آواز آ رہی ہے کہ:

''یہ بات لوگوں تک پہنچا دو کہ جو شخص سنتوں پر عمل کرتا ہے، وہ ہم سے قریب ہے، خواہ ہزاروں میل دور ہو اور جو شخص ہماری سنتوں پر عمل پیرا نہیں ہے، وہ ہم سے دور ہے، خواہ وہ ہماری جالیوں سے چمٹا کھڑا ہو۔''

چونکہ اس میں حکم بھی تھا کہ ''لوگوں تک یہ بات پہنچا دو'' اس لیے میرے والد صاحبؒ اپنی

تقاریر اور خطبات میں یہ بات لوگوں کے سامنے بیان فرماتے تھے لیکن اپنا نام ذکر نہیں کرتے تھے بلکہ یہ فرماتے کہ ایک زیارت کرنے والے نے جب روضۂ اقدس کی زیارت کی تو اس کو روضۂ اقدس سے یہ آواز سنائی دی.....لیکن ایک مرتبہ تنہائی میں بتایا کہ یہ واقعہ میرے ہی ساتھ پیش آیا تھا۔''

O

☆

اک ہوائے سرخوشی میں جھومتے ہیں جب نہال
جب اذاں بن کر چمک اُٹھتی ہے آوازِ بلالؓ
دل پہ جب اسمِ محمد ﷺ سے برستا ہے سرور
تب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کیا ہوں گے حضور ﷺ

(صہبا اختر)

O

آرزوئے حضوری

لوگ رخصت ہوئے جو حج کے لیے
جلے میری پلک پلک پہ دیئے

دل میں ہے درد و داغِ مہجوری
وہ حرم سے نگاہ کی دوری

نہ زر و سیم ہے نہ جنسِ ہنر
صرف شوقِ سفر ہے برگِ سفر

کس طرح آؤں تیرا گھر دیکھوں
کیسے طیبہ کے بام و در دیکھوں

ربِّ کعبہ! کرم کا طالب ہوں
میں تری ذات سے مخاطب ہوں

کون ہے جو مری پکار سنے
قصۂ چشمِ اشکبار سنے

سخت مضطر ہوں خالقِ کونین
ہو میسر زیارتِ حرمین

گر ملے مجھ کو حاضری کا پیام
چلوں کعبے کو باندھ کر احرام

جب میں باب السّلام سے گزروں
خواہشِ ننگ و نام سے گزروں

آئے جس دم مقامِ ابراہیمؑ
شوق سے خم کروں سرِ تسلیم

مجھ کو یارب ہو طوفِ کعبہ نصیب
سنگِ اسود بھی ہو لبوں کے قریب

ہو مقدر میں سرخرو ہونا
ملتزم سے لپٹ لپٹ رونا

پیاس اپنی بجھاؤں زمزم سے
بے نیازی ہو کیف سے کم سے

ہو نظر میں حطیم کا اکرام ہیں جہاں دفن انبیائے کرام
سعی جب ہو صفا و مروہ کی یاد ہو ہاجرہ کی بے چینی
جب منیٰ میں قیام ہو میرا سجدۂ شکر کام ہو میرا
عرفات آئے تو وقوف کروں جبل الرّحمت اس گھڑی دیکھوں
پھر کروں واپسی پہ قربانی دل کو گرمائے جوشِ ایمانی
یوں ادا ہو خلیلؑ کی سنت اس رسول جلیل کی سنت
دل میں ہو جذبہ حق شعاری کا جاں سپاری کا، جاں نثاری کا
میں بصد عجز و انکسار چلوں جب سوئے شہرِ شہریار چلوں
لے کے انوارِ گنبدِ خضریٰ جگمگا لوں میں روح کی دنیا
جالیوں سے لپٹ لپٹ جاؤں عاجزی سے سمٹ سمٹ جاؤں
پڑھوں سردارِ انبیاء پر سلام پڑھوں اصحابِ باصفا پہ سلام
ہوں دعائیں جوارِ رحمت میں سجدہ ریزی ریاضِ جنت میں

میرے مالک مرے سمیع و بصیر
دیکھوں اس خوابِ خوب کی تعبیر

(جناب حفیظ تائبؒ)

O

التماسِ دعا

ہے شانِ عبودیت، مصروفِ دعا ہونا
منظورِ مشیت تھا، ہر نالہ رسا ہونا

o

وفا کو زمیں میں چھپایا گیا
محبت کا مدفن بنایا گیا

☆

درج بالا شعر کا تعلق حرمین شریفین سے براہ راست تو نہیں ہے، مگر اُن سے متعلق یادوں سے ضرور ہے اور یہ یادیں میری زندگی کی متاعِ عزیز ہیں۔ ۱۹۹۸ء میں حجِ بیت اللہ کے موقع پر، ہمارا گروپ سات افراد پر مشتمل تھا۔ راقم الحروف، اہلیہ اور بیٹی ثوبیہ اقبال، جناب محمد افضل سہیل (سابق سیشن جج) کی اہلیہ اور بیٹا آفتاب سہیل، محترم ضیاء اللہ کھوکھر اور اُن کی اہلیہ، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ہم ساتوں ایک ہی کمرہ میں مقیم رہے۔ دیارِ پاک میں یہ مختصر سی یکجائی، قلبی محبتوں میں بدل گئی۔ میری بیٹی چونکہ کم عمر تھی اس لیے سب کی محبتوں کا مرکز بنی رہی۔ برضائے الٰہی ۲۰۰۳ء میں جناب ضیاء اللہ کھوکھر کی اہلیہ انتقال کر گئیں۔ ۲۰۰۹ء میں عزیزم آفتاب سہیل کی والدہ محترمہ اللہ سے جا ملیں اور زیرِ نظر کتاب کمپوزنگ کے آخری مرحلوں میں تھی کہ ۲۰۱۰ء میں میری بیٹی بھی وفات پا گئی۔ اللہ تعالیٰ سب کی مغفرت فرمائے۔ میں اِسے اُس ذاتِ حکیم و علیم کی رحمت سمجھتا ہوں کہ اُس کی یاد کو حرمین شریفین سے متعلق اس کتاب میں محفوظ ہونا تھا نیز وہ پیدا بھی ربیع الاول میں ہوئی تھی اور فوت بھی اِسی مہینے میں۔ ولادت، شادی اور وفات کا دن بھی ایک ہی ہے اور وہ ہفتہ ہے، اس کا نکاح بھی جناب پروفیسر عطاء الرحمٰن عتیق نے پڑھایا تھا اور جنازہ بھی، جو اُسی گھر سے اُٹھایا گیا جہاں اُس کی ولادت ہوئی تھی۔ وہ حُسن آفرین ذاتِ بلند و برتر اتفاقات کو اسی طرح حُسن عطا کیا کرتی ہے۔

☆

لوگ چار چیزوں کو بوجھ سا خیال کرتے ہیں ۱۔ بیٹی ۲۔ بیماری ۳۔ بارش ۴۔ مہمان۔ حالانکہ یہ چاروں نعمت بھی ہیں اور رحمت بھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ۲۰ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ (۶ مارچ ۲۰۱۰ء) کو یہ چاروں رحمتیں، میرے ہاں یکجا ہو گئیں۔ ایک عجیب اتفاق سے، تبسم روتا رہا، اشک مسکراتے رہے اور ایک عمر رسیدہ والد اپنی نوعمر بیٹی کو، ہلکی ہلکی بارش میں، اپنے والد اور والدہ کے عین قدموں کی جانب، قبر کی گہرائیوں کے سپرد کرتا رہا جو عالمِ زچگی میں وفات پا گئی تھی۔ انتہائی شکر و سپاس، پیدا کرنے والے کے لیے کہ اس نے بیٹی کی کیفیتِ مرگ کو 'شہادت' بنا دیا اور یہ بشارت اُس زبانِ صدق اظہار سے نکلی ہوئی ہے جو کھلتی ہوئی صداقتوں کے لیے تھی، الحمدللہ! کہ آخری غسل کے بعد مرحومہ کے متبسم چہرے پر پُرسکون معصومیت کی جگمگاہٹ تھی، سفرِ آخرت اور جنازے میں شریک مہمانوں کی تعداد بھی رشک آفرین تھی..... مگر اس کی تین کم سِن بیٹیاں،

نہیں سمجھ پا رہیں کہ کیا قیامت گزر گئی ہے..... راضی برضا رہنے کی توفیق بھی، عطا ہوا کرتی ہے، بے بس انسان کے بس کی بات نہیں، مگر دل کے درد کا ستارے بن کر پلکوں پر لَو دینا بھی رحمتِ الٰہی ہے۔ اس سلسلے میں نبیٔ پاک ﷺ کا طرزِ عمل ہمارے سامنے ہے۔

آپ ﷺ کی ایک نواسی حالتِ نزع میں تھی۔ صاحبزادی نے بلا بھیجا، آپ ﷺ تشریف لے گئے تو لڑکی اُسی حالت میں آغوشِ مبارک میں رکھ دی گئی، آپ ﷺ نے اس کی حالت دیکھی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضرت سعدؓ کے استفسار پر آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ رحم ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔''

آپ ﷺ نے اپنے فرزند حضرت ابراہیمؓ کو عالمِ جانکنی میں اپنے ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا اور آنسو تھے کہ مسلسل بہہ رہے تھے۔ وہ آنسو کہ جن کا ایک قطرہ کائنات سے افضل تھا۔ تب آپ ﷺ فرما رہے تھے۔

''آنکھ تو آنسو بہاتی ہے اور دل کو رنج ہوتا ہے مگر ہم زبان سے وہی کہتے ہیں جو ہمارے پروردگار کو پسند ہے، بے شک ابراہیم! ہم تیری جدائی سے غم زدہ ہیں۔''

تاریخ نے آپ ﷺ کا ایک تعزیتی مکتوب بھی محفوظ رکھا ہے جو آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو اُن کے بیٹے کی وفات پر لکھوایا تھا، اس کا ایک اقتباس یوں ہے۔

''پس تم صبر کرو اور دیکھو! تمہاری بے قراری اور بے صبری تمھیں اجر سے محروم نہ کرے، ورنہ پچھتاؤ گے اور اس بات کا یقین کرو کہ بے صبری سے کوئی مرنے والا لوٹ کر نہیں آ سکتا اور نہ غم دور ہو سکتا ہے اور جو حادثہ واقع ہوا ہے، اُسے تو ہونا ہی تھا۔''

اللہ تعالیٰ، میری بیٹی کی برزخی تنہائیوں کو جنت کی بہار آفرین رعنائیوں سے بھر دے کہ قبر کا دروازہ ہر متنفس کے لیے ایک ہی بار کُھلتا ہے اور پھر قیامت تک کے لیے اُسے بند کر دیا جاتا ہے اور یہ کیا کم ہے کہ اِس دنیا سے جاتے جاتے، وہ، میرے اُجڑے ہوئے دل کو درد کی دولت اور میری خشک آنکھوں کو آنسوؤں کی نعمت دے گئی..... درد کے داغ، دل کے چراغ ہیں۔ یہ چراغ فطرتِ انسانی کے جمال کو کمال عطا کرتے ہیں۔ انہی سے دل کو زندگی اور روح کو تابندگی ملتی ہے۔ اقبالؒ نے دل کو راز قرار دیتے ہوئے، درد کو انکشافِ راز کہا ہے..... اور آنسو، اِسی درد کا بے ساختہ اظہار ہیں۔ اِنہی سے سعادتوں اور رحمتوں کے ایوان کھلتے ہیں۔ آنسوؤں کے چراغ منزل نشاں ہوا کرتے ہیں اور اشکوں سے محروم آنکھوں سے وہ سراب کہیں خوش تر ہے جو دُور سے چمکتا ہے،

پانی نہیں ہوتا مگر پانی سا لگتا ہے.....دعا گو ہوں، جانے والی بیٹی کے لیے کہ وہ ؎

تنہائیوں کو دیدۂ پُرآب دے گئی
یعنی صدف کو گوہرِ نایاب دے گئی
خود ہو گئی غروب مگر میری آنکھ کو
اشکِ رواں کے انجمِ شب تاب دے گئی
خاکِ لحد میں ڈوبی ہوئی اُلفتوں کی یاد
دریائے دل کو گردشِ گرداب دے گئی
ہنستے ہوئے بھی دل میں رواں موجِ غم رہے
کیسے عجیب درد کے آداب دے گئی

زندگی کے پیمانے بھرتے ہیں اور چھلک جاتے ہیں کہ قضا و قدر کے خُمکدے کا یہی دستور ہے مگر بعض پیمانے بھرنے سے پہلے ہی چھلک جاتے ہیں کہ اُنھیں دیکھ کر ساقیِ ازل کی آنکھیں بھی بھیگ جاتی ہیں، حق یہ ہے کہ پھول وہی ہے جسے کھلتے ہی ٹہنی سے نوچ لیا جائے بعد میں اُسے کوئی پھول سمجھ کر نہیں چُنتا بلکہ کیاری صاف کرنے کے لیے ایک طرف کر دیا جاتا ہے ؎

آج معلوم ہوا ہستیٔ فانی کیا ہے
چند چلتی ہوئی سانسوں کی روانی کیا ہے
آج سمجھا ہوں کہ یہ ساری کہانی کیا ہے
آج معلوم ہوا، مرگِ جوانی کیا ہے

زندگی سُکھ میں سُکھی رہنے کا نہ سہی، دکھ میں دکھی ہونے کا نام ضرور ہے، اس حیاتِ مستعار میں خوشی کے لمحے گریزپا اور غم کی گھڑیاں پائیدار ہیں، بعض پرندے ٹھکانے بدلتے ہیں، بعض آشیانے اور بعض تو اپنی دنیا ہی بدل لیتے ہیں اور پسماندگان جوں توں زندگی کے دن بھرتے رہتے ہیں، زندہ نہیں ہوتے بلکہ زندہ رہنے کی نقل کرتے رہتے ہیں، اس جبر کو صبر کہہ لیں، یا استقامت کا نام دے لیں، یا کسی کی رضا پر راضی ہونے سے تعبیر کر لیں کہ آنسو بہا کرتے ہیں مگر شکوہ نہیں ہوا کرتا، آنسو تو دردِ دل کا بے ساختہ اظہار ہیں اور شکوہ ہو بھی تو کس سے؟ جو بہر نوع رحیم و کریم ہے، جس کی رحمت کی وسعت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا، جس کی شفقت کے سامنے شفقتِ مادری بھی بے حیثیت ہے اور جس کی رحمت سے وہی دل مایوس ہوتے ہیں جن میں کفر نے اپنا

آشیانہ بنالیا ہو۔گلہ کس سے کریں؟ اُس سے، جو مرض بھی دیتا ہے اور شفا بھی۔ درد بھی دیتا ہے اور دوا بھی..... سچ پوچھو تو یہی ایک دیوار ہے جس سے ہر دُکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے، ہر سلسلہ اُسی سے شروع ہوتا اور اُسی پر ختم ہوتا ہے اور ہر راہ اُسی کی چاہ کے در تک جاتی ہے۔

دلِ پژمردہ اک بے نام خوشبو سے مہک اُٹھا
سجایا میں نے لرزیدہ لبوں پر نام جب اُس کا

نبیٔ پاک ﷺ نے فرمایا کہ ''ہر بچہ فطرتِ صحیحہ لے کر دنیا میں آتا ہے، گویا مسلمان پیدا ہوتا ہے مگر ماحول اس کو بگاڑتا اور کچھ کا کچھ بنا دیتا ہے۔'' شکمِ مادر میں بچے کے لیے رزق کا ایک ذریعہ ہے اور وہ اس کی ناف ہے، دنیا میں آتے ہی اللہ تعالیٰ اس کے لیے ماں کے دودھ کی شکل میں دو دروازے کھول دیتا ہے، بڑا ہوتا ہے تو مولا کریم اس کے لیے اناج، پانی، دودھ اور پھل کی شکل میں چار دروازے کھول دیتا ہے۔ اگر وہ بچہ فطرتِ صحیحہ پر رہتا ہے اپنے آپ کو سنبھالتا، سنوارتا اور نکھارتا ہے تو اللہ تعالیٰ قبر میں اُترتے ہی، اس کے لیے جنت کے آٹھ (۸) دروازے کھول دیتا ہے، خوش نصیب ہیں وہ جن کے کے لیے آٹھ دروازے کھل گئے..... اور پیچھے رہ جانے والے، پکڑے ہوئے اور جکڑے ہوئے پرندے ہیں کہ تہہِ دام پھڑک اور تڑپ رہے ہیں کہ یہ دنیا از روئے حدیث، قید خانہ ہے اور ہم قیدی، اس لیے کہ ہماری گفتار کا ہر بول، ہماری رفتار کا ہر انداز اور ہمارے کردار کا ہر رخ، ایک طے شدہ ضابطے کا پابند ہے۔

میں ہوں اب تک اسیرِ دانہ و دام
جو رہا ہو چکے ہیں، اُن کو سلام

مجھ سے بچھڑنے والی یہ بیٹی، ۱۹۹۸ء میں حجِ بیت اللہ کے موقع پر اور ۲۰۰۰ء میں بہ سلسلہ عمرہ، حرمین شریفین میں، میرے ساتھ تھی۔ حجِ بیت اللہ (۱۹۹۸ء) سے واپسی پر ایک دن اُس نے مجھے کہا کہ ''آپ نے مکہ مکرمہ میں ایک بار کہا تھا کہ ان شاء اللہ پھر آئیں گے۔'' میں نے اُس کی آرزو میں مضمر تڑپ کو محسوس کیا اور خاموشی کے ساتھ عمرے کے لیے کوشش شروع کر دی، اللہ تعالیٰ کو منظور تھا، بات بن گئی اور میں، اہلیہ اور بیٹی کے ساتھ ایک بار پھر (۲۰۰۰ء) دیارِ ناز میں تھا۔ یادوں کی ایک کہکشاں ہے، اُدھر کی یادیں تو بھولتی ہی نہیں، مگر ایک یاد، کہ اُس کا تعلق مدینہ منورہ سے ہے، حج کے ایام میں ہمارا قیام باب التمر میں تھا۔ جس عمارت میں ہم مقیم رہے اس کا نام ''مرکز جلال'' تھا، اس کے مہتمم عبدالستار صاحب تھے جو ملتان کے رہنے والے تھے، ان کے اہل و

عیال اسی عمارت کی بالائی منزل میں رہتے تھے، بیٹی اُن کے ہاں اکثر جایا کرتی تھی کہ اُن کی بیٹی، یاسمین اس کی ہم عمر تھی۔ اب کے ہم عمرے کی ادائی کے بعد مدینہ منورہ گئے تو میں نے بقیع کی جانب واقع ایک فائیو سٹار ہوٹل کے استقبالیہ میں اہلیہ کو بٹھایا اور خود بیٹی کے ساتھ کسی درمیانے درجے کی رہائش کی تلاش میں نکلا، پھرتے پھراتے، وہ مجھے ''مرکز جلال'' کے سامنے لے گئی۔ وہاں عبدالستار تشریف فرما تھے۔ اُسے دیکھتے ہی انہوں نے کہا، ''یاسمین کل ہی تمھیں یاد کر رہی تھی، پروفیسر صاحب کہاں ہیں؟'' اتنے میں، میں بھی پہنچ گیا، اُس نے انھیں کہا، ہم نے اُسی کمرے میں ٹھہرنا ہے، حالانکہ وہ کمرہ خاصا بڑا تھا، چنانچہ وہی کمرہ کھول دیا گیا۔ محترم عبدالستار صاحب نے گاڑی نکالی، مجھے ساتھ لیا اور بیٹی کی والدہ کو بھی لے آئے، ہم نے ایک عمرہ اور کرنے کے لیے مکہ مکرمہ جانا تھا، میں نے عبدالستار صاحب کو کرایہ دینا چاہا، وہ کہنے لگے کہ ''یہ بیٹی کی آرزو تھی، پوری ہوئی، جب آپ حج کے لیے آئیں گے تو میں آپ کے کپڑے بھی اتار لوں گا، میں نے ہنس کے جواب دیا کہ ''کپڑے پہن کر آؤں گا تو پھر'' بہرکیف میں نے ایک سو ریال زبردستی ان کی جیب میں ڈال دیئے۔ وہ ہمیں بس اڈے پر چھوڑنے آئے، جب ہم بس میں سوار ہوئے تو وہ تحائف سے بھرپور دو شاپر چپکے سے بیٹی کو دے گئے، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مرحومہ کو اس کمرے سے محبت تھی جس میں وہ ۱۹۹۸ء میں ٹھہری تھی، اب کے مکہ مکرمہ میں ہماری رہائش کسی اور عمارت میں تھی۔ مگر وہ، آتے جاتے اس کمرے کو اپنی نگاہوں سے ضرور چوما کرتی تھی جس میں وہ دورانِ حج میں، مقیم رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حرمین شریفین کا تو بہرکیف اپنا مقام ہے، دل والوں کے نزدیک وہاں کی ہر شے عزیز ہے۔ اشجار و احجار، در و دیوار اور آثار بھی دل کی دنیا میں لَو دیتے رہتے ہیں۔ یہ یادیں میری اشکبار تنہائیوں کو اکثر بہلایا کرتی ہیں۔ ؎

چار سُو تپتے حقائق کی کڑی بے مہر دھوپ
دل پہ لیکن سایہ افگن ایک افسانہ رہا

اُسے ایک بار پھر دیارِ خدا اور رسول ﷺ میں حاضری کی شدید ترین آرزو تھی اور یہ نوازنے والا ہی جانتا ہے کہ کسے بُلانا ہے اور کسے تڑپانا..... یہ بھی عجیب ماجرا ہے کہ مکہ مدینہ کی حاضری اور پیہم حاضری بھی بعض پتھروں کو موم نہیں کرتی اور عمر بھر آرزو کی دھیمی آنچ میں سلگتے کروڑوں ایسے ہیں

جن کی آنکھیں مکہ، مدینہ کو ترستی رہتی ہیں لیکن خانہ کعبہ اُن کے دل میں بسا ہوتا ہے.....اور وہ حاضری کے بغیر ہی حضوری کی لذتوں سے سرشار رہتے ہیں۔عقلِ بہانہ ساز کے پاس کوئی پیمانہ ہے ہی نہیں کہ کون بارگاہِ ناز کے کتنا قریب اور کون کتنا دُور ہے.....۔

حرمینِ شریفین میں حاضری کی شدید تڑپ رکھنے والی، یہ بیٹی، پابندِ صوم وصلوٰۃ تھی۔اور ؎

ہوئی پردہ نشینِ خاک وقتِ شام سے پہلے!
اُسے عادت تھی اپنے گھر نمازِ شام پڑھنے کی

اس کے انکسار میں ایک وقار اور اس کی سادگی میں ایک افتخار تھا اُسے سچ سے محبت اور جھوٹ سے نفرت تھی، وہ نرم مزاج اور رحم دل تھی، وہ والدین کی فرماں بردار، بہن بھائیوں کی غمگسار، خاوند کی وفادار اور بچوں کی جانثار تھی، وہ اپنی بچیوں کی خوبصورت تعلیم وتربیت کی آرزومند تھی۔اللہ تعالیٰ نے اُسے ہر حال میں مطمئن رہنے کا ایک قابلِ تحسین سلیقہ عطا کیا تھا۔میرے ذہن میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں آ رہا کہ اس نے کسی بات پر تنگ کیا ہو یا کسی شے کے لیے ضد کی ہو۔وہ شروع ہی سے بُردبار اور سمجھدار تھی، وہ لالچ سے بہت دور اور قناعت کے بہت قریب تھی اور سچ فرمانے والے (ﷺ) نے سچ ہی فرمایا تھا کہ ''قناعت وہ دولت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔'' قناعت فی الواقع بہارِ بے خزاں ہے۔وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جایا کرتی تھی اور اُس کی چاہت بھی چھوٹی چھوٹی باتوں ہی کے لیے ہوتی تھی۔اللہ تعالیٰ نے اُسے اعتدال اور سادگی سے زندگی گزارنے کا اسلوب عطا فرمایا تھا۔حق یہ ہے کہ یہ زندگی کہیں اہم ہے کہ اُخروی زندگی کی بنیاد ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ سے دنیاوی زندگی کا حسن پہلے مانگا جاتا ہے کہ یہ زندگی حسین ہوگی تو آخرت خود بخود حسین ہو جائے گی۔کتنی خوبصورت بات کہہ دی، کہنے والے نے کہ دنیا بُری نہیں، دنیا داری بُری ہے۔یہ بیٹی، دنیا میں رہتے ہوئے، دنیا داری سے دُور تھی۔اِسی کو پرہیزگاری کہتے ہیں۔کیسا عجیب نکتہ ہے کہ دین کے مقابلے میں دنیا میں ایک الف زیادہ ہے اور یہ الف، اللہ کا ہے گویا یہ دنیا، اللہ کی ہدایات کے مطابق ہو تو دین بن جاتی ہے۔

میری اس بیٹی کی امیدیں قلیل تھیں مگر مقاصد جلیل تھے، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ وہ اپنی بچیوں کی تربیت کے لیے انتہائی پریشان رہتی تھی، اس کے جانے کے بعد، سوچتا ہوں کہ ان تین نواسیوں (ہادیہ، عمر ۸ سال۔ دانیہ، عمر ۵ سال۔ عائشہ، عمر ۲ ماہ ۱۲ دن) کی تربیت کیسے ہو سکے گی مگر سمجھانے والی عظیم وجلیل شخصیت (ﷺ) نے خوب سمجھا رکھا ہے کہ تین بیٹیوں کی صحیح تربیت پر

جنت ہی نہیں ملے گی جنت میں اُن (ﷺ) کی معیت بھی نصیب رہے گی جو فی الواقع نصیب کی بات ہے۔ میں چراغِ سحر بھی ہوں اور انتہائی خوفزدہ بھی۔ خوف عہدِ حاضر سے ہے کہ اغیار کی ثقافتی یلغار نے نئی پود کو روحِ اسلام سے بیگانہ کر دیا ہے، آج جیسے جیسے تعلیم عام ہو رہی ہے ویسے ویسے تربیت ختم ہو رہی ہے، معلومات بڑھ رہی ہیں اور علم گھٹ رہا ہے، ذہن تیز اور دل تاریک ہوتے جا رہے ہیں، چہرے روشن ہیں اور اندروں چنگیز سے تاریک تر ؎

سوچو! تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو! تو ایک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

آج کا کم سِن بچہ بھی وجہ و دلیل کے بغیر باپ کی بات نہیں مانتا، وہ علم نایاب ہو گیا ہے جو بلاچون و چرا باپ کی چھری کے نیچے گردن رکھ دیتا تھا، حضور ﷺ نے علم کو دلوں کی روشنی اور نگاہوں کا نور قرار دیا ہے، علم وہ ہے جس سے بصارت کو بصیرت نصیب ہوتی ہے، زندگی کا سراغ ملتا ہے، سوچ میں سچائی اور بات میں دانائی آتی ہے اور اندھیرے اُجالوں میں بدلتے ہیں کہ علم، اللہ کا عطا کردہ نور ہے۔

یہ کم سن بچیاں ماں کی مدبّرانہ شفقتوں اور معلّمانہ حکمتوں سے محروم ہیں۔ مامتا ایک پاکیزہ آسمانی جذبہ ہے۔ ماں، کائناتِ زندگی کی اولین تعبیر اور مصحفِ انسانیت کی آیۂ تطہیر ہے، اولاد کے ماتھے پر ماں کا بوسہ، محبت کے تقدّس کی معراج ہے۔ بچوں کی صحیح تربیت کے لیے ماں اور باپ دونوں کی فکری ہم آہنگی ضروری ہے۔ یہی وہ توازن ہے جس سے زندگی میں سلیقہ ابھرتا ہے۔ جس طرح آٹا دونوں ہاتھوں سے گوندھا جاتا ہے۔ آٹا اچھا گوندھا جائے تو پیڑا اچھا بنتا ہے، پیڑا اچھا بنے تو روٹی اچھی پکتی ہے۔ ماں سے محروم بچوں کے لیے باپ کو اپنے اندر مادرانہ شفقتوں اور حکمتوں کو ابھارنے کے لیے سخت ریاضت کرنا پڑتی ہے اور اسی کا دوسرا نام ''مجاہدہ'' ہے۔ یہ شرف ماں اور صرف ماں کو حاصل ہے کہ وہ شوہر کی وفات کے بعد اپنا تن، من اور دھن، اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر نثار کر دیتی ہے، رسولِ پاک ﷺ نے جنت ایسی عظیم نعمت کو، یونہی تو ماں کے قدموں کے نیچے نہیں رکھا، میں سمجھتا ہوں کہ انہی قدموں کے طفیل، اِس زمین کے ذرّے بھی، آسمان کے ستاروں کو شرما رہے ہیں سچ یہ ہے کہ زندگی کے جمال کو کمال، ماں کی وفاؤں اور دعاؤں سے ملا کرتا ہے ؎

ماں جہاں بستی ہے ہر چیز وہیں اچھی ہے
آسماں! تیرے ستاروں سے زمیں اچھی ہے

اللہ تعالیٰ ہادیہ، دانیہ اور عائشہ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، عہد حاضر کی آلائشوں سے بچائے اور وہ سنِ شعور کو پہنچ کر درج ذیل اشعار میں لَو دیتی ہوئی، میرے دل کی دھڑکنوں، روح کی لرزشوں اور نگاہوں کی تمناؤں کو محسوس کر سکیں تو اُن کا یہ احساس، قبر کی گہرائیوں میں بھی، مجھے سکون و عافیت عطا کرے گا۔ ؎

مزاجِ عصرِ حاضر کی کج آئینی سے ڈرتا ہوں
میں اسلامی شعائر کی تمھیں تلقین کرتا ہوں
جنابِ فاطمہؓ کی پاک سیرت کی قسم تم کو
ہمارے بے کراں ماضی کی عظمت کی قسم تم کو
قدم ہر ایک راہِ زندگی میں سوچ کر رکھنا
مسلمان زادیوں کے کارناموں پر نظر رکھنا
عمل خواتین کا ہے آبروئے ملتِ بیضا
حدیثِ خونِ دل ہے رنگ روئے ملتِ بیضا

ممنون رہوں گا، اگر قارئین کرام مرحومہ بیٹی اور پسماندگان کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے کہ

دُعا، اللہ تعالیٰ کی رحمتوں پر نا قابلِ شکست اعتبار کا اظہار ہے اور ہماری مستعار زندگی کا ایک مستقل سہارا ہے۔ دعا، عبادت ہے اور عبادت، دعا بلکہ دعا، عبادت کی روح ہے۔ حدیثِ پاک ہے کہ جس کے لیے دعا کے دروازے کھول دیئے گئے اس کے لیے رحمت کے دروازے کھول دیئے گئے، جانے والوں کا تو ایک بہانہ ہے، دعا تو ہم اپنے لیے مانگتے ہیں، ہم مسلمان ہر مقام پر، اپنی ذات کے ساتھ کائنات لے کر چلتے ہیں۔ ہمیں اپنی دعاؤں میں جملہ مرحومین اور متعلقین کو یاد رکھنا چاہیے کہ غائبانہ دعاؤں کو رحمتِ خداوندی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے اور دوسروں کے لیے دعا گو، پہلے خود نوازے جاتے ہیں۔ مولا کریم ہم سب کی بشری لغزشوں سے درگزر فرمائے، ہم سب کو اپنا محتاج رکھے اور ایمان کی سلامتی عطا کرے ؎

جس قلب میں ایمان کے انوار مکیں ہوں
اُس قلب کو چُھو سکتا نہیں دستِ قضا بھی

O

مرحومہ بیٹی ثوبیہ اقبال کے لیے

تُو دیکھنے میں مائلِ شوقِ سفر نہ تھی
ایسا سفر کرے گی، کسی کو خبر نہ تھی

وہ عزم تھا ترا کہ کسی سے نہ ٹل سکا
وہ زخم تھا کہ کوئی دوا کارگر نہ تھی

کیسے سمٹ گئی تری اُلفت کی داستاں
تیری تو کوئی بات کبھی مختصر نہ تھی

پُرہَول وادیوں میں یہ تنہا سفر کا عزم
تو زندگی میں تو کبھی ایسی نڈر نہ تھی

میں آؤں آستاں پہ ترے اور تُو نہ ہو
صورت یہ خواب میں بھی تو پیشِ نظر نہ تھی

دل پر گزر گئی جو قیامت، وہ کیا کہوں
مانا کہ دیکھنے میں مِری آنکھ تر نہ تھی

O

بہ شکریہ ——— محترم پروفیسر خورشید رضوی

☆

اے عرب کی سرزمین! مبارک ہو! تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب وتمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی..... تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدّس قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش! میرے بدکردار جسم کی خاک، ریت کے ذرّوں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اُڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو، کاش! تیرے صحراؤں میں لُٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروانہ کرتا ہوا اُس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذانِ بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔

(علامہ محمد اقبالؒ)

O

کتاب میں مستعمل اقتباسات کی تفصیل

شخصیت	اقتباس نمبر
چودھری افضل حقؒ	۱۲
مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ	۱۰
حافظ مظہر الدینؒ	۱، ۲، ۶
آغا شورش کاشمیریؒ	۱۳، ۱۶، ۱۷، ۱۸
جناب واصف علی واصفؒ	۴، ۵، ۷، ۸، ۱۱، ۱۴، ۱۵
جناب مختار مسعود	۹
ڈاکٹر محمد ایوب خان	۳

O

حرفِ سپاس

اللہ تعالیٰ مولوی سردار محمد رحمۃ اللہ علیہ (علمی کتاب خانہ لاہور) کو نصرتِ جاوداں سے نوازے۔ آمین

اور اُن کے عزیز، محترم جاوید اقبال صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے

کہ

اِس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں اُن کا التفات شریکِ حال رہا ہے۔

میں برادرِ عزیز شبیر احمد خاں میواتی کے پُرخلوص تعاون کا شکریہ ادا کرتا اگر الفاظ، جذبات بن سکتے۔

ممنونِ احسان

محمد اقبال جاوید

O

اعتراف واعتذار

ان اوراق میں اگر کوئی حسن دکھائی دے تو اُسے محض حسن آفرین کی عطا سمجھا جائے اگر سوچ کی کوئی لغزش اور قلم کی کوئی لکنت ہو تو اس کا ذمہ دار میرے نفسِ خطاوار کو تصور کیا جائے۔ یقین کیجیے کہ قلم کے اس سفر میں میرے پاس جذبۂ بیتاب کے سوا کچھ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی میرا واحد سرمایہ اور آخری سہارا تھی کہ اُسی کی رحمتوں سے ظلمتوں کو نور ملتا، ذہن کی گرہیں کھلتی، فکر کے عقدے وا ہوتے، قلم میں پرِ ہما کی جنبش پیدا ہوتی، درماندہ توفیق پاتے، پسماندہ آگے بڑھتے اور شرف وقبول کی نعمتیں ارزانی ہوتی ہیں ؎

کون بجھتے ہوئے منظر میں جلاتا ہے چراغ
سرمئی شام پہ تحریرِ حنا کس کی ہے؟

میں اپنی غلطیوں کے لیے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ بندہ نواز میں، دل کی گہرائیوں کے ساتھ، توبہ واستغفار بھی کرتا ہوں اور اس کی رحمت ومغفرت پر یقینِ کامل کے ساتھ، معافی اور بخشش کا خواستگار بھی ہوں ؎

کیا ہے خلق مجھے باوجودِ علمِ گناہ
یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے

محمد اقبال جاوید

O